إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا

مشائخ دیوبند کی دو صد سالہ (۲۰۰) تاریخ تصوف

یعنی

تذکرہ مشائخ دیوبند

مؤلفہ

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

ناشر

مدنی دار التالیف بجنور یوپی

مطبوعہ

مدینہ پریس بجنور (یوپی)

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا

مشائخِ دیوبند

کی

دوصد سالہ تاریخ

یعنی

تذکرہ مشائخِ دیوبند

ازقلم

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

ناشر
ادارہ مدنی دار التالیف بجنور۔یوپی

نام کتاب — تذکرہ مشائخ دیوبند

صفحات — ۴۴۰

قیمت — آٹھ روپے

مصنف — [illegible]

ناشر — ادارہ مدنی دارالتالیف بجنور

بار دوم — جلائی سنہ ۱۹۶۷ء

فہرست مضامین آخر میں

مطبوعہ [illegible]
مدینہ پریس بجنور

کتبہ

محمد اظہر الحق کاتب بجنوری سنہ ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

حامداً و مصلیاً

بندہ حقیر اپنی اس حقیر اور مختصر کوشش کو ان ذوات قدسی صفات کی طرف منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے کہ جن کے پیارے حالات اس تذکرہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ فقط

بندہ حقیر جاروب کش آستانہ مدنی
عزیز الرحمٰن غفرلہ نہٹوری
خادم مدنی دارالافتاء بجنور

مورخہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ
مطابق یکم نومبر ۱۹۶۵ء

فہرست تذکرہ مشائخ دیوبند

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں

اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

تقریظ طبع اوّل پر

از حضرت الحاج مولانا اسعد اللہ خانصاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور (یو۔پی)

جناب مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری اس سے قبل شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا مدنی پر "انفاس قدسیہ" کے نام سے ایک مقبول عام کتاب شائع فرما کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

"تذکرہ مشائخ دیوبند" ان کی تازہ تالیف ہے۔ کتاب کا مضمون نام سے ظاہر ہے۔ اس تذکرہ کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوا ہے۔ پھر حضرت میانجی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر بالترتیب جماعت دیوبند ۲۳ بزرگوں کے اصالتہً اور چار حضرات کے ضمناً مختصر حالات و واقعات اور ان کی عظیم الشان علمی اور عرفانی خدمات بڑی خوبی سے جمع فرمائی گئی ہیں۔ اسی سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند۔ اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے قیام ان کی عہد بہ عہد ترقیات اور احوال وکیفیات کو بھی دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرات اکابر دیوبند کے سیر و سوانح دوسری کتب حتیٰ کہ رسائل واخبارات سے کافی اختصار کے ساتھ ضروری حالات و واقعات اخذ کرکے حیطۂ تحریر میں لانے کے لئے مؤلف موصوف نے جو کوشش و کاوش فرمائی ہے۔ وہ قابل تحسین وآفرین اور لائق ستائش و تبریک ہے۔ آج کے دور میں جب فرصتیں مفقود ہیں اور طبائع کا عام رجحان یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر سکیں۔ یہ مختصر و کافی مجموعہ بزرگان دیوبند کے حالات میں ایک ایسی جامعیت کا حامل ہے جس سے قلیل وقت میں ان حضرات کے تعلق مع اللہ۔ توکل۔ دعوت الی اللہ۔ اعلاء کلمۃ الحق اور علوم نبوی کی تحصیل واشاعت کے روشن و تابناک احوال معلوم ہوتے ہیں۔ اور قلوب کو دینی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ میں بصمیم قلب دعا کرتا

ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب مؤلف کو مزید تصنیف و تالیف کی ہمت و طاقت عطا فرمائے۔
دارین میں ان کے درجات و حسنات میں اضافہ فرمائے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق سے
بہرہ ور رکھے۔ فقط۔

مکتوب حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ بندہ مع الخیر ہے۔ امید ہے کہ جناب عالی بھی بخیر ہوں گے۔ "تذکرہ مشائخ دیوبند"
دیکھا جی خوش ہوا۔ جی چاہا کہ داد کے ساتھ فریاد بھی کروں۔ یعنی آپ سے درخواست
کروں کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے علمائے ہند پر ایک نایاب کتاب تصنیف فرمادیں۔ گو کام
لمبا ہے مگر خطوط لکھ کر ملاقاتیں کرکے یہ کام ہو سکتا ہے۔ بہت سے حضرات زاویہ خمول میں
ہیں۔ حالانکہ ان کی کتب سے مستفید ہوتے ہیں۔ مثلاً مولانا اکبر شاہ خاں۔ مولانا عبدالمومن۔
مولانا مشیت اللہ دیوبندی۔ مولانا نظام الدین کیرانوی اور اپنے سلسلہ کے وہ حضرات
جن پر کتب نہیں لکھی گئیں۔ خصوصاً دارالعلوم و مظاہر العلوم کے اساتذہ وغیرہم۔ آپ
غور کرلیجئے۔ تو بہت کچھ سمجھ میں آئے گا۔ امید ہے کہ توجہ فرمائیں گے۔ احقر سے آپ
غائبانہ متعارف ہوں گے۔

محمد عاشق الٰہی بلند شہری
دارالعلوم کراچی ۳۹
مورخہ ۱۶ر رجب ۱۳۸۶ھ

تقریظ طبع اوّل پر

منجانب ادارہ الفرقان لکھنؤ۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبند کے نوجوان فاضل اور حضرت مدنی رح کے مجازین میں سے ہیں۔ چند سال اُدھر وہ انفاس قدسیہ کے نام سے اپنے شیخ حضرت مدنی رح کا تذکرہ لکھ چکے ہیں۔ اب انھوں نے جماعتِ دیوبند کے تمام مشائخ کا یہ جامع تذکرہ مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی رح کے حالات سے شروع ہوتا ہے۔ اصلاً اس میں وفات یافتہ بزرگوں کا تذکرہ ہے ضمناً زندہ بزرگوں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہما۔ مگر یہ ذکر ایک ایک دو دو صفحے سے زیادہ کا نہیں ہے۔ گزرے ہوئے بزرگوں کے تذکروں میں بھی کوئی بہت تفصیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مصنف کا مقصد ان بزرگوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی تفصیلات پیش کرنے کا نہیں ہے۔ اُن کا اصل نقطۂ نظر ان بزرگوں کی "بزرگانہ شان" اور مقبولیت عنداللہ کا اظہار ہے تاہم تذکرہ اس نقطۂ نظر تک محدود ہو کر بھی نہیں رہ گیا ہے۔ بعض بزرگوں کے دیگر احوال و کمالات بھی کسی حد تک تحریر میں آگئے ہیں۔

تحریر میں اظہارِ عقیدت کا گہرا رنگ ہے۔ اور یہ بات مصنف نے بلا تکلف شروع ہی میں کہہ دی ہے کہ انھوں نے اپنے دامنِ عقیدت کے پھول پتیوں ہی کو گوندھ کر تذکرہ کا یہ ہار تیار کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان بزرگوں کی عظمت کا جو نشان بھی کہیں پایا ہے عقیدت کی آنکھوں سے لگا کر اس تذکرہ کا جزو بنا دیا ہے۔ خواہ وہ کسی تنقیدی نظر میں کچھ کھٹک ہی پیدا کر دے۔ اور زمانہ کا مزاج اسے قبول کرنے میں پس و پیش ہی کرے۔

جن لوگوں کو جدید ذہن کی بیماری نہیں لگی ہے اور نئے ادبی مذاق کے بھی وہ اسیر نہیں ہیں ایسے لوگ انشاء اللہ اس کتاب میں پوری دلچسپی محسوس کریں گے۔ اور نفع اٹھائیں گے۔

مصنف نے حضرت مدنیؒ کے تذکرہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ کے ایک حکم پر تمام خدام نے "ٹکا سا جواب دے دیا" (ص ۲۳)

یہ تعبیر بہت نامناسب اور اصل واقعہ سے بعید محسوس ہوتی ہے۔ اچھا ہوتا کہ مصنف کو اعتدال ملحوظ رہتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدایہ طبع ثانی

حامداً ومصلیاً۔

اما بعد ۔ تذکرہ مشائخ دیوبند پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں پاکستان میں قرآن محل کراچی نے اس کو شائع کیا۔ ہر دو مرتبہ کتاب میں نہ اضافہ ہوا اور نہ اصلاح ہوئی۔ لیکن جب کتاب کی مانگ اور ضرورت بڑھتی رہی تو دوستوں کے بار بار توجہ دلانے سے اس میں بہت کافی اضافہ بھی کیا گیا اور عبارت کو بھی درست کیا گیا۔ اب میرے وہ احباب جنھوں نے پہلا اڈیشن ملاحظہ فرمایا ہے۔ جب اس اڈیشن کو دیکھیں گے تو کتاب کو بالکل جدید پائیں گے۔ اس اڈیشن میں بہت سے مشائخ کے حالات کا اضافہ کیا ہے اور ترتیب کو سنین وفات کے اعتبار سے قائم کر دیا ہے۔ تاکہ میرے بعد اضافہ میں سہولت ہو سکے۔

یہ چیز میں پہلے ہی اڈیشن میں ذکر کر چکا ہوں (جیسا کہ تقاریظ سے ظاہر ہے) کہ یہ تذکرہ یادِ رفتگاں ہے۔ وہی خصوصیت اس وقت بھی باقی ہے۔ علاوہ ازیں اس وقت بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر عرض کر رہا ہوں کہ اس کتاب میں مشائخ طریقت ہی کے حالات ہیں۔ علماء اور لیڈران کرام اس کے موضوع سے خارج ہیں۔

جہاں تک طبع ثانی میں ترمیم و تنسیخ و اضافہ کا معاملہ ہے۔ سو ہر دو اڈیشنوں کو پڑھنے والے بخوبی جان لیں گے کہ اب تذکرہ مشائخ دیوبند بالکل نئی کتاب ہے۔ وجہ اس کی اس اثناء کا مطالعہ ہے جس کی وجہ سے پہلے اڈیشن اور دوسرے میں بنیادی فرق موجود ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ڈیڑھ دو صدی کے حالات اور نظریات اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان، ان کے اختلافات، اگرچہ تفصیلاً مذکور نہ ہو سکیں، لیکن ان کا اجمالی

اور دھندلا سا تعارف تو ضرور ہو جائے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کو جس گوشہ زندگی میں بھی رہنمائی کی ضرورت ہو۔ یہ تذکرہ ان کو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور روشنی پہونچا سکے۔ بدیں وجہ میں نے اِس تذکرہ میں کسی نہ کسی جگہ اس چیز کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ان حضرات میں آپس میں عقیدت اور محبت اور آپسی اختلاف کا کیا معیار تھا اسی وجہ سے میری رائے یہ ہے کہ تذکرہ مشائخ دیوبند مسلک دیوبند کا معیاری ترجمان ہے۔

مشائخ وعلماء کے آپس کے اختلافات اور عقیدت و محبت کا ذکر کرنے میں' میں نے اپنے پاس تعصب اور گروہ بندی کو بالکل پھٹکنے نہیں دیا ہے۔ اس وجہ سے کہ میرے نزدیک تو سبھی محترم ہیں اور سبھی سے محبت رکھنا میرے لئے خیر کا باعث ہے۔ اس لئے یہ تنقید میرے لئے باعث عار نہیں ہے کہ میں اپنے اسلاف کی عقیدت کا اسیر ہوں کیونکہ مجھ تہی دامن کے پاس بجز اپنے اکابر کی عقیدت کے اور ہے ہی کیا؟ اسی عقیدت کی پھول پتیوں کا "تذکرہ مشائخ دیوبند" ایک گلدستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے۔



مشائخ دیوبند کی خدمات اور خصوصیات

علمی خدمات علمی خدمات کی وجہ سے مشائخ دیوبند کا جو مقام تاریخ عالم میں عموماً اور تاریخ ہندوستان میں خصوصاً ہے کسی اور طبقہ کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے اور اس وقت تو دنیائے اسلام کی بیشتر آبادی بلاواسطہ اور بالواسطہ اسی گھرانے کی خوشہ چیں اور اسی بحر ناپید کنار کی جرعہ نوش ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مشائخ دیوبند کی خدمات کو دو جزو میں منقسم کرتے ہیں۔ مدارس[1] اور تصنیف[2] و تالیف۔

مدارس جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد خاندان ولی اللّٰہی کی درس گاہیں نذر انقلاب ہوگئیں تو مشائخ دیوبند کو اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لئے ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند ایک ابتدائی مدرسہ کی شکل میں قائم کرنا پڑا۔ اور اس کے چھ مہینہ بعد مظاہر علوم سہارنپور کو قایم کیا۔ ان مشائخ نے بروقت صحیح فیصلہ کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا ۔ تو دو حال سے خالی نہیں' یا تو تباہ و برباد کردیئے جائینگے یا مرتد بنا دیئے جائیں گے۔ اسی وجہ سے اِن اکابر نے ان دونوں مدرسوں کو قایم کیا۔ اسی کی طرف مشائخ دیوبند کے جداعلیٰ میاںجی نور محمد صاحب قدس سرہٗ نے اشارہ کیا تھا کہ میں نے ایک ایسی ہانڈی پکائی ہے۔ جو نہ سو برس پہلے پکی تھی اور نہ سو برس بعد پکے گی ۔

"دارالعلوم دیوبند جس کی ابتدا رچھتہ کی مسجد سے ہوئی ، کے بانی حضرت حاجی محمد عابدؒ صاحبؒ ہیں۔ اس کو ترقی دینے والے اور دارالعلوم کی شکل دینے والے حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحبؒ ہیں۔ آپ نے ہی ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم کی شکل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور وسیع پیمانہ پر اس کی بنیاد ڈالی۔ اور تاحیات اس کی ترقی و فلاح کے لئے کوشاں رہے۔ اور آیندہ کے لئے ایک لائحہ عمل مقرر کردیا۔"

مظاہر علوم سہارنپور کے ابتدائی وجود میں مولانا سعادت علی خاں سہارنپوری اور مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں۔ لیکن مظاہر علوم کو موجودہ صورت دینے والے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ ہیں۔

اِن دونوں مدرسوں کے علاوہ مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ عالیہ رامپور، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ امروہہ، جامع العلوم کانپور، مدرسہ اسلامیہ تھانہ بھون، مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ، مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ اور افغانستان، عراق، سمرقند، تاشقند، بخارہ، کشمیر، پاکستان، بنگال، آسام، برما، ملایا، انڈونیشیا، افریقہ اور ہندوستان کے لاکھوں مدارس اسلامیہ ان ہی مشائخ دیوبند کی توجہات عالیہ کا ثمرہ ہیں۔ مشائخ دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الاسلام کی سعی و عمل سے بے شمار مدارس قائم ہوئے۔

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف میں دینی خدمات جتنی مشائخ دیوبند سے بالواسطہ اور بلاواسطہ کی ہیں، وہ بھی اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ لہٰذا ان کتابوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ سیوطی ثانی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد تقریباً چھ سو ہے۔ اگر ان چھ سو کتابوں کی فہرست تیار کی جائے۔ اور ان پر مختصر تبصرہ کیا جائے تو اس کے لئے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔ چہ جائیکہ تمام مشائخ دیوبند کی بالواسطہ اور بلاواسطہ تصانیف کی شمار دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر قلم اٹھانے والے کے لئے یہی دشواری پیش آئے گی۔ بدیں وجہ نہ میں کسی کتاب کا نام لکھتا ہوں اور نہ میں اس پر تبصرہ کرنے ہی کو پسند کرتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مشائخ دیوبند کی کتابیں ہندوستان و پاکستان کے ہر گھر میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہی ان کی مقبولیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

مناظرے

ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد عیسائیت کی وبا بہت بری

طرح پھیلی۔ انگریزوں ہی کی وجہ سے دوسرے فرقوں نے بھی اس دوبار میں حصہ لیا اور متعدد مناظروں کا وجود سامنے آیا چنانچہ شاہجہاں پور میں عیسائیت اور اسلام کا مناظرہ ہوا۔ جس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے عیسائی لاٹ پادری کو بہت بری طرح زک دی۔ اس کے علاوہ رڑکی وغیرہ کے مناظرے جس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی مشہور تصنیف "قبلہ نما" ہے۔

اس کے علاوہ اہلِ بدعہ اہلِ سنت والجماعت کے مناظرے ہوئے اور اہلِ سنت والجماعت کی حمایت میں مشائخ دیوبند نے نمایاں حصے لئے۔ اس سلسلہ میں مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا بھاولپور کا مشہور مناظرہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے مناظرے ہوتے رہے۔

تبلیغی دورے

اس سلسلہ میں بھی مشائخ دیوبند کی مساعی جمیلہ کی نمایاں حیثیت ہے اور تبلیغی جماعت اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے تبلیغی اور اصلاحی دورے نمایاں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنا نصب العین ہی تبلیغی اور اصلاحی وعظ کو قرار دیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے ان گنت دورے کئے۔ اور لاکھوں بندگانِ خدا کو خدا کی راہ پر ڈال دیا۔ چنانچہ شوال ۱۳۷۶ھ میں آسام سے واپسی پر بیک وقت ۸ ہزار لوگوں کو بیعت کیا اور توبہ کرائی۔ میرے خیال میں تاریخ تصوف میں اس واقعہ کو نمایاں اور جلی مقام حاصل ہے۔

تبلیغی جماعت جس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ ۔ اور فروغ دینے والے مولانا محمد یوسف صاحبؒ ہیں[1] اس جماعت نے کیا کام کیا؟ وہ ظاہر ہے بلکہ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہ جماعت ہندوستان سے نکل کر پاکستان، افغانستان،

---

[1] تبلیغی کام کیا ہے؟ اور اس طریقہ کار سے کیا فائدہ ہوا ہے؟ اس کا تفصیلی مطالعہ ہماری کتاب "سوانح حضرت جی" میں ملاحظہ فرمائیں

ایران، عراق، عرب، شام، مصر، افریقہ، امریکہ میں دین کی اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربیت اور دہریت کا ڈٹ کر مقابلہ صرف یہی جماعت کر رہی ہے۔ اور اس طریق کار کے علاوہ کوئی دوسرا علاج ہے نہیں، جو لوگ اس جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ جھک مارتے ہیں۔

سیاسی خدمات مشائخ دیوبند کی سیاسی خدمات اس قدر ہیں کہ دوسرے برادران وطن کی خدمات سے ان کا موازنہ کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یوں تو مسلمان جہاں آباد ہوگئے وہی ان کا وطن ہے اور وہ مادر وطن ہی کی طرح سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور کرتے آئے ہیں، لیکن ہندوستان کے ساتھ جو روحانی رشتہ مسلمانوں کا ہے وہ کسی بھی برادر وطن کا نہیں ہے۔ ہندوستان کی دیگر نسلیں (آرین وغیرہ) اگرچہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہوں، لیکن جو قدامت ہندوستان میں اسلام اور فرزندان اسلام کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں۔ جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور انسانی نشو و نما فقط حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ باقی اقوام ہند یا اس کی قائل نہیں۔ اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی انھوں نے سکونت اختیار کی۔ اور یہاں ہی سے اُن کی نسل دنیا میں پھیلی۔ اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ "سبحۃ المرجان فی تاریخ ھندوستان" میں متعدد روایات اس کے متعلق مذکور ہیں۔ بائیبل میں بھی اس کے حصہ "عہد قدیم" میں بھی ذکر کیا گیا ہے تفسیر ابن کثیر جلد اوّل میں درج ہے۔

ونزل ادم بالهند ونزل معه الحجر
الاسود وقبضة من ورق الجنة
فبثه بالهند فنبتت شجرة الطيب
فانما اصل ما يجاء به من الطيب من
الهند من قبضة الورق التي هبط
بها ادم وانما قبضها اسفا على الجنة
حين اخرج منها وقال ابن عيينة
عن عطاء بن السائب عن سعيد بن
جبير عن ابن عباس قال اهبط ادم
به حنا ارض الهند۔

حضرت آدمؑ ہندوستان میں اترے اور ان کے ساتھ حجر اسود اور ایک مٹھی پتے جنت کے بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان پتوں کو ہند میں بکھیر دیا تو خوشبودار درخت پیدا ہوئے۔ لہٰذا اصل اور بنیاد ہندوستان کی خوشبو کی ان ہی ایک مشت پتوں سے ہے۔ جو آدم علیہ السلام بوقت خروج جنت یادگار کے طور پر لے کر آئے تھے۔ ابن عینہ کہتے ہیں اور روایت کرتے ہیں۔ عطاء بن سائب اور سعید بن جبیر سے اور وہ ابن عباسؓ سے کہ فرمایا ابن عباسؓ نے کہ جس وقت آدمؑ اتارے گئے تو ان کے ساتھ ہندوستان کی خوشبو کی اصل (جس سے ہندوستان میں خوشبو پیدا ہوئی) تھی۔

سبحۃ المرجان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا یہاں پھیلنا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے۔ بنا بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے مطابق آبائی وطن عہد قدیم سے ہندوستان مسلمانوں کا ہی ہوگا۔ جو لوگ انسانی اور اپنی نسل کو ایسا نہیں مانتے، وہ اس دعوے کے مستحق نہیں ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے اس کو اپنا وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے[1]

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً مشائخ دیوبند کو ہندوستان سے خاص تعلق اور محبت ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اور وطن عزیز

---

[1] "ہندوستان ہمارا ہے" ص۳۳

کو آزاد کرانے اور یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ اور بالآخر معرکہ بالاکوٹ میں اپنی جانِ عزیز کو قربان کر دیا۔

مشائخ دیوبند کی سیاسی اور ملکی خدمات اسی تحریک سے شروع ہوتی ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اگست ۱۹۴۷ء سے پیشتر جتنی تحریکیں ہو چکیں تھی مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء ریشمی خطوط اور خلافت وغیرہ سب اسی تسلسل سے شروع ہوئیں کہ ایک تحریک میں ناکامی کے بعد بالکل اسی وقت دوسری تحریک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اور گذشتہ تحریک کی کوتاہیوں کو مدِ نظر رکھ کر جدید تحریک کو چلایا گیا۔ ریشمی خطوط کی تحریک تو اتنی تعجب خیز تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ چٹائیوں پر بیٹھنے والے علماء اور خانقاہوں میں گوشہ نشین رہنے والے درویش کتنے عمدہ اسلوب کے ساتھ تحریک چلاتے ہیں۔ کہ انگریز کی بڑی بڑی سی۔ آئی۔ ڈی کو ہزاروں مرتبہ منہ کی کھانی پڑی ہے۔ ریشمی خطوط کے متعلق لکھا ہے۔

یہ نام انگریزوں کی تحقیقاتی کمیٹی کا دیا ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہدایات قبائل میں ریشمی خطوط رومال کے ذریعہ گئی تھیں۔ بلکہ احقر کو یاد ہے کہ ایک بوڑھے شخص رحمن کا انتقال ہو گیا ہے) حضرت قدس سرہ کے پاس آتے تھے وہ کاغذ کے پھول بہت عمدہ بناتے تھے وہ کاغذ کے گلدستے بناتے ان میں ڈنڈیوں سے جاری شدہ ہدایات کا خط لکھا ہوا ہوتا تھا۔ پھر وہ گلدستہ پشاور جاکر بکتا، اس کی قیمت بہت زیادہ بتائی جاتی تاکہ صرف وہی تاجر خریدیں جو کابل آئے ہوئے ہیں اور اس راز میں شریک ہیں۔ اور اس طرح وہ خط حضرت مولانا عبید اللہ مرحوم تک پہنچ جاتا تھا۔ ایک صاحب اور دیوبند کے قریب گاؤں میں رہتے ہیں۔ موصوف کے ذریعہ ایک مرتبہ ایک خط حضرت شیخ الہند نے سرحد بھیجا تھا اور پیدل سفر کرایا تھا۔ ایک تلوار بھی موصوف کو دی تھی غرضکہ ہدایات مختلف اوقات میں مختلف ذرائع سے دی گئیں۔ مگر انگریزوں کے ہاتھ وہ ریشمی رومال والی بات لگ گئی جس کو انھوں نے عنوان بنایا۔ (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۱۱۸)

افسوس صد افسوس کہ جس تحریک کو جان پر کھیل کر چلایا تھا وہ اپنوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو گئی جس کے نتیجے میں پھر کافی عرصہ کے لئے غلامی مقدر ہو گئی۔ اس جگہ یہ ضرور عرض کر دوں کہ یہ تحریکات کسی جاہ طلبی کے لئے نہیں تھیں۔ بلکہ خون پسینہ صرف اسی لئے بہایا گیا تھا کہ ہندوستان آزاد ہو اور مسلمان آزادی کے ساتھ ہندوستان میں اسلامی نظام کے سایہ میں زندگی گذاریں۔ لیکن افسوس یہ تمنا اب تک پوری نہ ہو سکی۔

سلوک اور تصوف

حضرات مشائخ دیوبند میں چاروں سلسلوں میں بیعت کرنے کا دستور ہے۔ اور وجہ اس کی مریدین کا غلو اور دوسرے حضرات کے ساتھ سوئے ادبی کرنے کا اندیشہ ہے جس کو حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ العزیز نے اپنے کسی مکتوب میں بھی بیان کیا ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت اور ذوق کے اعتبار سے ترجیح بھی موجود ہے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ پر چشتیت کا غلبہ ہے تو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائے پوری پر قادریت کا پر تو سایہ فگن ہے۔ اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب پر نقشبندیت غالب ہے۔

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است

لیکن بایں ہمہ ہر شیخ شریعت کے جادۂ مستقیم پر نہایت مضبوطی سے قائم ہے۔ تصوف میں شریعت کا اتنا زیادہ اہتمام اور اس میں فنائیت اور استغراقیت کے اعلیٰ مقامات ان حضرات کے یہاں حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ اکابر مشائخ کے یہاں کا نقش ہے۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کی یہ رفعت کہ۔

> جو کیفیت حضرت منصورؒ پر صرف چند گھنٹہ بلکہ چند منٹ طاری رہی تھی اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور انا الحق کہہ دیا۔ وہی کیفیت حضرت میاں جیو پر برابر تیس سال تک مسلسل طاری رہی۔ مگر اس قدر اعلیٰ ظرف رکھتے تھے کہ رات تک نہ کی۔ (تنظیم مدنی نمبر۲)

اسی کے ساتھ کمال اتباع شریعت کہ ایک نظم سناتے والے نے جب نظم سنانا چاہی تو فرمادیا۔

مجھے نماز میں امامت کرانی پڑتی ہے۔ اور غنا بلا مزامیر میں بھی علماء کا اختلاف ہے اس وجہ سے میں نہیں سنوں گا۔

اس گروہ میں اتباع سنت سے عشق ہے۔ اگر کوئی نگاہ تجسس کو اس کی آخری حد تک بھی پہونچا دے تو اس کو ان مشائخ کے عمل میں خلاف سنت ایک چیز بھی نہ ملے گی۔ چنانچہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے چلنے کے لئے قدم اٹھایا اور کچھ دور واپس ہوکر پھر چلنا شروع کیا۔ معلوم کیا تو فرمایا "پہلی مرتبہ چلنے میں ابتدا بائیں قدم سے ہوگئی تھی۔"

مشائخ میں چھوٹی عمر کے شیخ کامل حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ تو عالم اسلام میں سنت اور شریعت کے داعی اکمل ہیں۔ غرضکہ ان حضرات کی پوری زندگیاں حضرات صحابہؓ کی زندگیوں کا حسین ترین چربہ ہیں اور یہی ان کا سلوک و تصوف ہے۔

مسلک و عقیدہ

حضرات مشائخ دیوبند کا مسلک اور عقیدہ وہی ہے — جو سلف صالحین کا تھا۔ اس کو سید الطائفہ حضرت شاہ علیہ القدوسی صاحب گنگوہیؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ۔ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین صاحب مدنیؒ نے اپنے مکتوبات میں بیان فرمادیا ہے۔ اول الذکر اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

اہل سنت والجماعت کی علامت یہ ہے کہ وہ شیخین کو فضیلت دیتے ہیں۔ (حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ سے محبت کرتے ہیں۔ جس کسی نے حضرات شیخین پر کسی کو بھی فوقیت دی خواہ وہ فرشی ہو یا عرشی، ولی ہو یا علی۔ وہ گمراہ ہے۔ اور ہدایت سے خارج ہے۔ گناہوں پر اصرار سے ایمان سلب ہو جاتا ہے والعیاذ باللہ من ذالک)

اس سے نہ مقام حاصل ہوسکتا ہے اور نہ وہ صاحب حال ہوسکتا ہے۔ جس نے تفضیلت شیخین سے انکار کیا اگر اس کا انکار معصیت کے درجہ میں ہے تو اس پر توبہ واجب ہے۔ اور اگر اس کا انکار کفر کی حد کا ہے تو قیامت میں اس کے لئے کوئی عذر نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں نہ کوئی بحث ہے اور نہ کلام وہ ایسا مردود ہے جس کی قبولیت کا سوال ہی نہیں۔ (مکتوبات قدوسیہ ص۲۹۵)

تمام مشائخ دیوبند۔ فقہ میں حنفی فقہ کے مقلد ہیں۔ اس تقلید میں وہ اپنے پیر کی بھی پرواہ نہیں کرتے حضرت گنگوہیؒ اپنے ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں "ہم مسائل میں ان کے مقلد نہیں ہیں" چنانچہ قیام میلاد کے مسئلہ میں حضرت گنگوہیؒ نے اپنے شیخ کی کتاب "ہفت مسئلہ" کو آگ میں جلوا دیا تھا۔ یہی حال ان کا تہجد کی جماعت کے بارے میں ہے۔ وہ اس کو رمضان اور غیر رمضان میں ناجائز لکھتے ہیں۔ غرضکہ یہ حضرات حنفی فقہ کی تقلید میں ذرہ برابر فرق کو برداشت کرنے کیلئے آمادہ نظر نہیں آتے۔

روابط و تعلقات

میں عرض کرچکا ہوں کہ سلوک و تصوف کی تعلیم میں ان کے یہاں جُدا جُدا انداز تھا۔ اسی طرح ان حضرات نے سیاسی تحریکات کا زمانہ بھی پایا بلکہ بعض ان میں سے تحریکات کے رکن و رکین بھی رہے سا ایسا بھی ہے کہ اگر ایک شیخ کو کسی سیاسی تحریک سے دلچسپی ہے تو دوسرے کو دوسری تحریک سے دلچسپی ہے۔ جو پہلی کے بالکل متضاد ہے۔ لیکن باین ہمہ ان کی یگانگت اور محبت، رابطہ و تعلق میں کسی بھی وقت شمہ برابر فرق نہیں آیا۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ان کے تعلقات کا مدار ذات پر نہیں۔ دین و شریعت پر تھا۔ اس جادہ سے اگر ان کا بیٹا بھی ہٹتا ہے تو وہ اس سے بھی گریزاں رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے یہاں ایسے بہت سے واقعات مل جائیں گے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت تھانویؒ کے سیاسی نقطہ نظر میں اختلاف تھا حضرت شیخ الہندؒ نے ارشاد فرمایا:۔

بھائی اپنی جماعت میں اختلاف تو اچھا معلوم نہیں ہوتا سلاؤ پھر میں اپنی ہی کسی قدر رائے کو کیوں نہ بدل دوں۔ اور اس میں ان کی (حضرت تھانویؒ) کی موافقت کر لوں۔

کیونکہ میرے اوپر کوئی وحی تو نازل ہوتی نہیں کہ میری ہی رائے ٹھیک ہو۔ (عظیم مدنی نمبر ۱۱۹)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ۔ اور حضرت تھانویؒ کے سیاسی نقطۂ نظر کے اختلافات بہت مشہور ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں محبت و عقیدت بھی ایسی تھی کہ کیا مجال کوئی ذرہ برابر کسی کی تنقیص کر دے ؟ قیامت آجاتی تھی لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ نہ ایسے مشائخ ہیں اور نہ ایسے ان کے عقیدت مند۔ ایسی حالت میں جو بھی ظاہر و صادر ہو جائے وہ غیر متوقع نہیں ہے۔

بہرحال یہ چند سطریں "تذکرہ شروع ہونے سے قبل" مشائخ دیوبند کے اجمالی تعارف کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے۔ یہ سطریں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سہ شنبہ کے دن ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو کامنڈہ (فیروزپور جھرکہ ضلع گوڑگاؤں) کے تبلیغی اجتماع میں وجود میں آئیں۔

عزیز الرحمٰن غفرلہٗ

مدنی دارالافتاء و مدنی دارالتالیف، بجنور

حضرت میانجی نور محمد صاحب قدس سرہٗ

۱۲۰۱ھ لغایت ۱۲۵۹ھ

سراج الاتقیاء نور الاسلام حضرت میانجی نور محمد صاحب علوی جھنجھانوی قدس سرہٗ۔ سپہ سالار اکابرِ دیوبند ہیں۔ آپ کی حیات طیبہ کو دار العلوم دیوبند اور اکابرِ دیوبند کی زندگیوں سے گہرا ربط ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی حیات دار العلوم دیوبند اور علماء دیوبند کی سنہری تاریخ کا جزو لاینفک ہے۔

ولادت | آپ کے والد ماجد کا نام نامی اسم گرامی سید جمال الدین محمد ہے۔ وطن مالوف جھنجھانہ (ضلع مظفر نگر) ہے۔ سن ولادت ۱۲۰۱ھ[1] ہے۔ آپ سید جمال الدین محمد علوی جھنجھانوی کی اکبر اولاد ہیں۔ آپ کے علاوہ چار بھائی اور ایک بہن آپ کے بعد پیدا ہوئے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) سید غلام حیدر (۲) سید کمال محمد

(۳) سید علی محمد (۴) سید غوث محمد

(۵) بی خطیبہ

سلسلۂ نسب | آپ نجیب الطرفین اور علوی سید ہیں۔ آپ کی نویں پشت کے جدِ اکبر شیخ عبدالرزاق صاحب اپنے زمانہ کے جید علماء اور اکابر صوفیہ سلسلۂ قادریہ میں سے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جن ایام میں مغلِ اعظم شہنشاہ جلال الدین اکبر ہندوستان کے

---

[1] حسنِ اتفاق سے اسی سال حضرت سید احمد شہیدؒ ...... پیدا ہوئے تھے۔ سید صاحب کی تاریخ ولادت صفر ۱۲۰۱ھ ہے۔ سوانح نگاروں نے ۱۰ر محرم الحرام ۱۲۰۱ھ بیان کی جو غلط ہے۔ (مخزن احمدی)

تختِ حکومت پر جلوہ افروز تھا۔ اکبر شیخ صاحب سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ عبدالرزاق صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

"مرید و خلیفہ شیخ محمد حسن است وے از مشائخ قادریہ است و بسیار صاحب کمال بود۔ شیخ عبدالرزاق را مریدان و خلفا بسیار اند سید علی از مریدان او ست و کبر سن رسیدہ است مشغول بذکر و صاحب ذوق است و وفات شیخ عبدالرزاق سن تسع و اربعین و تسعمائۃ"[1]

آپ مرید اور خلیفہ شیخ محمد حسن صاحب کے ہیں۔ اور وہ مشائخ قادریہ میں سے ہیں۔ اور وہ بہت زیادہ صاحب کمال تھے۔ شیخ عبدالرزاق صاحب کے مریدین اور خلفا بہت ہیں۔ سید علی صاحب بھی آپ کے مرید ہیں۔ انھوں نے بڑی عمر پائی ذکر میں مشغول رہتے تھے اور صاحب ذوق تھے۔

سن وفات شیخ عبدالرزاق صاحب کا ۹۴۹ھ ہے۔

حضرت میاں جی نور محمد صاحب علوی جھنجھانوی کا سلسلہ نسب یہ ہے :۔

:۔ نور محمد بن سید جمال الدین بن سید پیر محمد بن سید محمد رضا بن سید الٰہی بخش بن سید محمد زماں بن سید مرلی محمد بن شاہ محمد بن شیخ عبدالرزاق بن شیخ احمد اللہ راضی بن محمد فاضل بن نور بخش بن شیخ عبدالعزیز بن نور کمال الدین بن شیخ ابو سعید علوی بن احمد راضی بن سلطان ابو سعید شاہ بن ابو اسحٰق شاہ بن محمد شریف شاہ بن سلطان میر جالکشاہ بن سلطان فرخ شاہ بن امیر ارسلان بن شاہ علی سرمست بن شاہ حسین فردوس بن شاہ بایزید بن شیخ محمد فرید بن شیخ حسن بن شیخ میر علی ضامن ابن شیخ محمد باقر بن شیخ ابو بکر بن شیخ ابو المعالی بن شیخ ابو القاسم بن شیخ شریف البرکات بن شیخ علی اکبر خدا دوست بن علی اعظم نور الحق بن ضیاء الدین حق پرست بن حاجی الحرمین نور الدین طوسی بن علی احمد کوفی بن صلاح الملک حسین بن امام حسن جاسی بن حنفیہ بن شیخ الاسلام ابو القاسم محمد الاکبر کنیت محمد بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ[2]

---

[1] اخبار الاخیار ص۲۳۶   [2] سوانح نور محمدی۔

تعلیم وتربیت میانجی صاحبؒ اگرچہ فارغ التحصیل عالم نہ تھے تاہم دینی معلومات اور زبان فارسی پر آپ کو کافی عبور تھا، کچھ عربی بھی جانتے تھے۔ آپ نے دستور کے مطابق پہلے قرآن شریف حفظ کیا۔ اور پھر فارسی پڑھی لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ فارسی آپ نے جھنجھانہ رہ کر پڑھی یا دہلی۔ البتہ عربی کے لئے آپ دہلی تشریف لے گئے[۱]۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ کہ تحصیلِ علم کے لئے کس سن میں تشریف لے گئے تھے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مدرسہ رحیمیہ[۲] کی سرپرستی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے تھے۔ اور درس وتدریس کی خدمات حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ انجام دیتے تھے۔ اسی زمانہ (غالباً ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۶ء) میں حضرت سید احمد شہیدؒ تحصیل علم کے لئے ایشیا کی اس مشہور درس گاہ میں داخل ہوئے تھے۔

۱؎ میاں جی صاحبؒ نے دہلی میں پیپل والی مسجد میں قیام فرمایا تھا۔

۲؎ یہ مدرسہ اپنے زمانہ میں ایشیا کی دینی بڑی درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے والد ماجد نے قائم کیا تھا یہ مدرسہ اس جگہ تھا جس جگہ آج شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا مزار ہے۔ جس کو آج کل مہندیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل حضرات اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ ہیں۔

(۱) مولانا شاہ رفیع الدین صاحب (۲) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب (۳) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب (۴) مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب (۵) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب (۶) مولانا شاہ عبدالحیٔ صاحب (۷) مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید (۸) حضرت سید احمد شہید بریلوی (۹) مولانا رشید الدین صاحب دہلوی (۱۰) مولانا مفتی صدرالدین صاحب (۱۱) مفتی الٰہی بخش صاحب (۱۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب (۱۳) مولانا مخصوص اللہ صاحب (۱۴) مولانا کریم اللہ صاحب (۱۵) مولانا میر محبوب علی صاحب (۱۶) مولانا عبدالحیٔ لوی صاحب (۱۷) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۴ پر دیکھیے)

چنانچہ امیرالروایات کی حکایت ۵۱؎ درج ذیل کی جاتی ہے۔

خانصاحبؒ نے فرمایا کہ میرے استاذ میاںجی محمدی صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مولانا شاہ اسحٰق صاحبؒ سے کافیہ شروع کیا تھا اور سید صاحب جب تشریف لائے۔ تو انھوں نے شاہ اسحٰق صاحب سے میزان شروع کی تھی۔ اور اتنی جلدی ترقی کی کہ نصف سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا اور کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انھوں نے مشکوٰۃ بھی شاہ صاحب سے شروع کردی۔ اور کوئی کتاب مولوی اسماعیل صاحب شہیدؒ سے بھی پڑھتے تھے۔ یہ قصہ تو میں نے اپنے استاد سے سُنا ہے اور مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے تھے۔ کہ جب

(بقیہ حاشیہ ص۲۳ کے بعد ملاحظہ ہو)......

(۱۸) مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی (۱۹) مولانا رحیم بخش صاحب (۲۰) مولانا فضل حق خیرآبادی رشاندار اصفی) (۲۱) مولانا مملوک علی صاحب (۲۲) مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی (۲۳) مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی (۲۴) مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی (۲۵) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند (۲۶) مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (۲۷) حافظ رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان حضرات نے دورہ حدیث شاہ عبدالغنی صاحب سے پڑھا ہے۔ اور شاہ عبدالغنی صاحب اسی مدرسہ میں پڑھاتے تھے۔ (بندہ غفرلہٗ)

۱؎ مراد امیر شاہ خاں صاحب خورجوی۔

۲؎ اس روایت میں سید صاحب کا شاہ اسحٰق صاحب سے پڑھنا ثابت ہے۔ حالانکہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحؒ نے نقشِ حیات میں شاہ عبدالقادر صاحب کا نام لیا ہے۔ بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقۃً تعارض نہیں۔ اس وجہ سے کہ ممکن ہے کہ سید صاحب نے شاہ اسحٰق اور شاہ عبدالقادر صاحب دونوں سے پڑھا ہو لیکن تعلیم باطنی میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے زیادہ تعلق تھا اسی وجہ سے شاہ عبدالقادر صاحب کا نام لیا جاتا ہے۔ بہرحال ہر دو روایت سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میاںجی صاحب نے ہر دو حضرات میں سے کسی سے ضرور پڑھا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے نہیں پڑھا۔ واللہ اعلم۔ (بندہ غفرلہٗ)

سید صاحب تعلیم علوم حاصل کر رہے تھے۔ اثنائے تحصیل میں ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ جب وہ کتاب پر نظر کرتے تھے۔ تو ان کی نظر سے حروف غائب ہو جاتے تھے اس لئے طبیبوں کی طرف بھی رجوع کیا گیا مگر کچھ نہ ہوا۔ یہ قصہ جب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا تم جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی تمھاری نظر کے سامنے سے اُڑتی ہے یا نہیں۔ سید صاحب نے اس کا تجربہ کیا تو کوئی باریک سے باریک چیز بھی نہ اڑی۔ اس کی اطلاع شاہ صاحب سے کی تو آپ نے فرمایا۔ پڑھنا چھوڑ دو۔[۱]

حضرت سید صاحب کا تکمیل علم کے بغیر درسیات کو ترک کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے۔ لیکن حضرت میاںجی صاحبؒ کے بارے میں صاف نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ نے بغیر تکمیل کے پڑھنا کیوں ترک کر دیا۔ ممکن ہے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ایماء پر انھوں نے بھی ترک کر دیا ہو۔ البتہ اتنا ضرور تحقیق ہوا ہے کہ پڑھنے میں زیادہ تیز نہ تھے۔ چنانچہ صاحب سوانح نے حضرت میاںجی صاحبؒ کے ایک تعلیمی دوست کا ایک مقولہ" ہمارے میرے یار مدرسہ میں بھی تعلیم میں پھسڈی تھا اور اب بھی ہے" سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو اور حضرت میاںجی صاحبؒ کو کسی دوسرے کام کے لئے منتخب فرمایا تھا اس لئے علم ظاہر جتنا ضروری تھا عطا فرما دیا تھا۔

بیعت طریقت ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کو درمیان تعلیم سے ہٹا کر سلوک کی طرف لگا دیا گیا تھا۔ اسی طرح سے جب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور دوسرے بزرگوں نے حضرت میاںجیوؒ کے میلان طبع کو تصوف کی طرف دیکھا ہوگا۔ یا اپنی بصیرت قلبی سے دریافت کر لیا ہوگا کہ حضرت میاںجیو صاحبؒ کو اللہ... نے کسی دوسری غرض کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو ان کو بھی سلوک کی طرف لگا دیا۔ ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی دوسری وجہ ظاہر نہیں ہے۔

اب ایک سوال باقی ہے کہ آپ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ سے کیوں بیعت ہوئے جبکہ دہلی میں سرتاج اولیاء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ جیسے حضرات موجود تھے۔ اس سوال کا حل بہت آسان ہے اور سید احمد شہیدؒ کے مندرجہ ذیل واقعات سے بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے شیخ الاسلام والمسلمین سیدی و مرشدی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں :-

۱۲۲۲ھ میں دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں تحصیل علوم اور سلوک کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مقصد معلوم کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا :-

" آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے امید ہے کہ آپ بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح منزل مقصود پر فائز ہوں گے۔"

آپ کو حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے روحانی تعلیمات اور تلقینات کے ساتھ قرآن پاک کا ترجمہ اور حدیث وتفسیر وغیرہ پڑھائی۔ ۱۲۲۲ھ میں جبکہ آپ کی عمر ۲۰ سال کی تھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت ہوئے۔ چونکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی صحبت موثرہ اور تلقینات سے مادہ وصول الی اللہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا چنانچہ چند ہی روز میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی حسن توجہ اور اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر کمال پر پہونچ گئے۔ شاہ صاحب نے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اسی سال وطن لوٹ واپس ہو گئے۔[1]

---

[1] نقش حیات ج ۲ ص ۱۹

میرالروایات میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے :-

چھ مہینے کے بعد شاہ صاحب کے خاندان میں کسی کے یہاں شادی کی تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ تینوں بھائی موجود تھے۔ اور شامیانہ تانا جا رہا تھا۔ اس مقام پر ایک نیم تھا جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح نہیں تنتا تھا، بلکہ اس میں جھول رہتا تھا۔ اتنے میں سید صاحب بھی مسجد سے تشریف لے آئے۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کرتہ کو کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کو کھینچا تو شامیانہ بالکل ٹھیک تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا۔ سید صاحب کی یہ دہنچ شاہ عبدالقادر صاحب کو پسند آگئی۔ اور انھوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے عرض کیا۔ کہ سید احمد کو مجھے دیدیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ لے جاؤ۔ اور سید صاحب سے کہدیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ جاؤ۔ شاہ عبدالقادر صاحب ان کو اپنے پاس اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرے میں رکھ لیا۔ اور اشتغال کے لئے فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر کیا کرو۔ سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اور شاہ عبدالقادر صاحب کے حکم کے مطابق ذکر و شغل کرتے رہے۔ اور جو جگہ شاہ صاحب نے ان کو بتا دی تھی، سید صاحب خواہ مینھ ہو یا آندھی یا دھوپ برابر اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے۔ اور جب تک شاہ صاحب نہ کہتے تھے کہ اب یہاں سے اٹھ جاؤ! اس وقت تک نہ اٹھتے تھے۔ شاہ صاحب نے ڈھائی برس سید صاحب کو اپنی خدمت میں رکھا۔ اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور شاہ صاحبؒ سے عرض کیا۔ سید احمد حاضر ہیں ان کو پرکھ لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو۔ اب ان کو بیعت کی اجازت دیدو۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے عرض کیا۔ حضرت اجازت تو آپ

ہی دیں گے ، اور ان سے آپ ہی کا سلسلہ چلے گا ۔ شاہ صاحبؒ نے ان کو بیعت کی اجازت دیدی[1] ۔

اسی طرح بہت ممکن ہے (۱) یا تو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی نے (جن کے متعلق ذیل میں کچھ عرض کیا جائے گا) شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے میانجیو صاحبؒ کو مانگ لیا ہو (۲) یا پھر حضرت میانجیو صاحبؒ کو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولائتیؒ کی طرف رجوع کرنے کے لئے حکم فرمایا ہو۔ کیونکہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولائتی اپنے زمانہ کے بڑے باکمال اور صاحب کشف و کرامات حضرات میں سے تھے ۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے بروایت جناب مومن دہلوی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ایک مقولہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے متعلق نقل کیا ہے ۔

> مومن خاں صاحب مومن دہلوی مجھ سے فرماتے تھے کہ ایک بار چند حضرات شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے حدیث پڑھ رہے تھے ۔ تذکرہ اکابر کا آگیا ۔ ہم لوگوں نے عرض کیا ۔ اب بھی کوئی ایسا ہے ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برسوں کو ہمارے پاس فلاں حلیہ کا ایک شخص مسئلہ دریافت کرنے آئے گا ۔ وہ مرد کامل ہے (اشارہ شاہ عبدالرحیم صاحب ولائتیؒ کی طرف تھا) [2]

حضرت شیخ محمد صاحب تھانویؒ نے شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کا مقولہ نقل کیا ہے :۔

> اللہ اکبر تمھاری نسبت میں بڑی فراخی ہے اور تم کو کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی[3]

اور حضرت مولانا نانوتویؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا ایک مقولہ نقل کیا ہے :۔

> کیا اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں ؟ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ ہاں حضور ایک بزرگ رہتے ہیں ۔ سید صاحب یہ سنکر مسجد میں تشریف لے گئے ۔

---

[1] امیرالروایات صلا [2] نور محمدی صلا [3] ایضاً

حضرت نانوتویؒ کا ایک دوسرا مقولہ ہے۔

امیر شاہ نے مولانا نانوتویؒ سے دریافت کیا۔ کہ حضرت! جب آپ سید صاحبؒ کو مجدّد مانتے ہیں تو ان کی نسبت سب سے اعلیٰ ہونی چاہئیے۔ پھر اُن کی نسبت کا شاہ عبدالرحیم صاحب کی نسبت سے گھٹا ہونا کیا معنیٰ؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا۔ کہ جس بات کے لئے مجدد آتا ہے اس میں اس سے کوئی بڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ ہاں دوسری حیثیت سے جیسے ذکر و اشغال وغیرہ اگر اس سے کوئی بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں[۱]

بہرحال حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ ولایتیؒ اس زمانہ میں کاملین میں سے تھے۔ ان ہی سے حضرت میانجیو صاحبؒ بیعت ہوئے اور خرقہ خلافت ملا۔

---

[۱] امیرالروایات ص۳۹

[۲] شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی شہیدؒ اپنے زمانہ کے نہایت اونچے درجہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ آپ امروہہ میں شاہ عبدالہادی صاحبؒ کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوئے ماٹھوں نے فرمایا یا کسی اور کو تلاش کرو۔ مگر یہ واپس نہ ہوئے شام جب ہوئی حضرت شاہ عبدالہادی صاحبؒ ان کو اپنے ہمراہ دریا کے کنارے لے گئے۔ اور بیعت کرلیا۔ بیعت کے بعد دونوں پر کیفیت ضحک طاری ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور ہنستے۔ نماز کے وقت کے علاوہ یہ کیفیت طاری رہتی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ پہلے ہی سے صاحب نسبت تھے۔ سہارنپور واپس ہوئے تو شیخ کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سہارنپور میں حضرت سید صاحب تشریف لائے تو ان سے بیعت ہوئے۔ بیعت کے بعد حضرت سید صاحبؒ نے ان کو اپنا خلیفہ اور مجاز بھی بنا دیا۔ اس طرح حضرات دیوبند نقشبندی بھی ہیں۔ اور ان کا سلسلہ خاندان ولی اللّٰہی کے ذریعہ حضرت مجدد صاحبؒ سے جا ملتا ہے۔ اس جگہ یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے۔ کہ حصول نسبت کے لئے بیعت ضروری نہیں ہے۔ نسبت ایک کیفیت قلبی کا نام ہے (باقی حاشیہ ص۳۰ پر)

چونکہ اس زمانہ میں حضرت شاہ عبدالہادی صاحب امروہویؒ آپ کے دادا پیر بھی
حیات تھے۔ اس وجہ سے بہت ممکن ہے کہ اپنے شیخ کی اجازت سے ان کی خدمت میں
بھی حاضر ہونے کا موقع ملا ہو۔

ملازمت | دہلی سے سلسلہ تعلیم ترک کرنے کے بعد آپ جھنجھانہ تشریف لے آئے۔
اور کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد آپ قصبہ لوہاری (جو تھانہ بھون اور قصبہ
جلال آباد سے متصل ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) تشریف لے گئے۔ اور وہاں ایک مسجد
میں بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کے لئے ڈیڑھ روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ آپ کے
کھانے کا انتظام ایک متمول خاتون اقبال بیگم کے یہاں ہوا جمعرات کے دن شام کو
آپ جھنجھانہ تشریف لے آتے تھے اور جمعہ کے پورے دن قیام فرما کر ہفتہ کے دن اپنے مکتب
لوہاری میں پہونچ جاتے تھے۔ یہ ہفتہ واری مسافت آپ ایک چھوٹی گھوڑی کے ذریعہ
طے کرتے تھے جو آپ کی ملکیت تھی۔

یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ آپ کی شادی کب ہوئی۔ البتہ اتنا قیاس کیا جاسکتا ہے
کہ جب آپ دہلی سے فارغ ہوکر جھنجھانہ پہونچے اور کچھ دنوں یہاں قیام فرمایا۔ اسی دوران
میں آپ کی شادی ہوگئی ہوگی۔ اتفاق سے اہلیہ محترمہ نابینا تھیں۔ جن کی آنکھیں آپ کی
دعا کی برکت سے آخر عمر میں اچھی ہوگئی تھیں۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن
پیرانی صاحبہ نے حضرت سے عرض کیا: "سنا ہے کہ آپ ولی ہیں، ہم تو جب جانیں جب
ہماری آنکھیں ٹھیک ہوجائیں۔ چنانچہ حضرت میانجیو صاحبؒ نے دعا کی، اور ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ کے بعد ملاحظہ ہو)

جو کثرت ذکر سے از خود پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ عطاء ربانی ہے۔ جو معصیت سے تو زائل ہوسکتی ہے۔
اس کو اگر شیخ طریقت بھی چاہے تو سلب نہیں کرسکتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شیخ نسبت سلب
کرسکتا ہے۔ وہ اس کیفیت سے ناآشنا ہیں۔ (عزیزالرحمٰن)

آنکھیں ٹھیک ہوگئیں ۔ (واللہ اعلم)

۔ امورِ خانہ داری اور حقوق متعلقہ کی وجہ سے ہر ہفتہ جھنجھانہ تشریف لے جایا کرتے تھے ۔ اسی دوران میں معرکہ بالاکوٹ اور پشاور پیش آگیا ۔ اور آپ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی شہیدؒ کے حکم سے ان کی معیت میں ان معرکوں میں شریک ہوئے جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے ۔

حضرت سید احمد صاحبؒ شہیدؒ کی تحریک جہاد

پشاور اور بالاکوٹ میں فقرار و علمار اسلام کی شرکت

یہ وہ ہمہ گیر اور انقلابی تحریک تھی کہ جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ڈالی ۔ اور ترقی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے دی ۔ اور عملی جامہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شیخ الہندؒ نے پہنایا ۔ یہی تحریک مختلف زمانوں میں مختلف اسمار سے یاد کی گئی ہے ۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب و مولانا گنگوہی صاحب اور مولانا نانوتوی صاحب کے زمانہ میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے نام سے موسوم ہوئی ۔ تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے تحریک خلافت و ریشمی خطوط کے نام سے چلائی ۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کیا ملک گیری اور صرف آزادیٔ وطن کے لئے تھی ؟ کیا وہ سیکولر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے یا نظام اسلام کے لئے کوشاں تھے ؟ اس کا جواب سطور ذیل میں دیا جاتا ہے ۔ ہمیں افسوس ہے کہ حالات زمانہ نے رنگ محفل بدل دیا ہے ۔ جس کی وجہ سے تذکرہ نویسوں نے تحریف کر ڈالی ہے ۔

معرکہ بالاکوٹ ۱۲۴۶ھ میں ہوا ۔ اس وقت اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں (کمپنی بہادر) کا تسلط ہو چکا تھا ۔ تاہم دہلی اور دوسری ریاستوں میں مسلمان حکمران موجود تھے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ریاستوں میں نظام اسلام مضمحل ہو چکا تھا ۔ پورے ہندوستان

میں کونسا دستور رائج تھا۔ اس کو متعین کرنا دشوار ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فک ء کل نظام کی آواز بلند کی، حکومت وقت ان کے خلاف ہوگئی۔ فک کل نظام سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ سیکولر دستور کا نفاذ کیا جائے۔ بلکہ شاہ صاحب کی غرض یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے دستور رائج تھے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ اور ملک بھر میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اپنا اصلاحی پروگرام لے کر اُٹھے۔ اور ملک بھر کے دورے کئے جس جگہ گئے وہاں سے بدعت کا خاتمہ کر دیا۔ اور سنت کو فروغ دیا۔ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کی تقریریں ہوئیں اور علاقوں میں ظلمت کی جگہ نور پھیلنا شروع ہوا۔

یہ بات ان حضرات سے پوشیدہ نہیں تھی کہ مکمل طور پر اسلامی نظام اسی وقت رائج ہو سکتا ہے۔ جب اغیار کا تسلط ملک پر سے ختم ہو جائے اور اقتدار اپنے ہاتھوں میں آ جائے۔ نفس اقتدار ان حضرات کے پیش نظر نہیں تھا۔ اور نہ ان حضرات کا یہی مقصود تھا۔ کہ انگریز چلے جائیں اس کے بعد حکومت جس کی چاہے قائم ہو جائے، اور نظام بھی کوئی سا رائج ہو جائے۔ اگر یہ مقصود تھا تو میرے نزدیک ایک غلاظت سے نکل کر دوسری غلاظت میں گر پڑنے کے مترادف ہے۔ حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"رب غیور کہ علیم بذات صدور است	رب غیور جو دلوں کا حال جانتا ہے
آگاہ است بر این معنی کہ این جانب	اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے
را از قبول این منصب کہ غیر از اقامت	کہ اس منصب امامت کے قبول
جہاد بر وجہ مشروع وحصول معنی انتظام	کرنے سے اس کے سوا میری کوئی
در عساکر اہل اسلام غرض دیگر از اغراض	دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد
نفسانیہ نیست آدے این قدر آرزد	کو شرعی طریقہ پر قائم کیا جائے اور

دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع
اقطار عالم احکام رب العالمین کہ
مسمی بہ شرع متین است بلا منازعت
[illegible] احدے نافذ گردد۔
(سیرت سید احمد شہید ص۱۱)

مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔ یہاں
اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد
انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العالمین
کے احکام جن کا نام شرع متین ہے بلا
کسی مخالفت کے جاری ہو جائیں۔

یہ اتنی صاف اور کھلی ہوئی عبارت ہے کہ جس کے دو معنی ہو ہی نہیں سکتے لیکن افسوس کہ بعض حضرات نے بعض ہندو راجاؤں یا افسروں کی شرکت سے یہ سمجھ لیا کہ حضرت سید صاحب سیکولر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم ان کتابوں کا نام لے کر تردید کریں لیکن اس خیال سے کہ نازک طبیعتیں تنقید کا بار گراں برداشت نہ کر سکیں گی صرف نظر کرنا بہتر ہے۔

ہمارے اس نقطۂ نظر کی تائید میں حضرت شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کے اس قدر مطبوعہ مکتوب ہیں کہ جن کو دیکھنے کے بعد نظر تعصب تو انکار کر سکتی ہے لیکن انصاف پسند اور اہل دل انکار نہیں کر سکتے۔

شرکتِ جہاد یہ جوش عمل حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے فتویٰ دار الحرب اور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے تبلیغی اور اصلاحی اور جہادی دوروں کی وجہ سے تھا کہ ہر فرد نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے درویش اور مدرسوں میں بیٹھنے والے علما بھی حضرت سید صاحبؒ کے شریک تھے۔ چنانچہ جس وقت حضرت سید صاحبؒ دورہ کرتے ہوئے سہارنپور پہونچے تو حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب ولایتیؒ نے مع اپنے مریدین کے سید صاحبؒ کے دست مبارک پر بیعت جہاد کی۔ اور حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نے اپنے مرید خاص قاضی حکیم مغیث الدین صاحب سہارنپوری اور حضرت میانجیو صاحبؒ کو جھنجھانہ سے بلا کر حضرت سید احمد شہیدؒ کے دست حق پرست پر

بیعت کرادیا ہے کہتے ہیں کہ جس وقت آپ کے پیرو مرشد کا پیغام لے کر اُن کا آدمی جھنجھانہ پہنچا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی گھوڑی کا رسہ ہاتھ میں لئے اسے پانی پلا رہے تھے۔ یہ پیغام سنتے ہی حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوئی۔ اور گھوڑی بھی لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی بُری حالت ہوگئی۔ آپ سہارنپور پہنچے۔ اور اپنے پیر و مرشد کی تقلید اور تعمیل حکم کرتے ہوئے سید صاحب سے بیعت ہوگئے۔

معرکۂ بالاکوٹ فتح پشاور کے بعد یہ معرکہ ہوا ہے (تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یا ۶ مئی ۱۸۳۱ء ہے) ان دنوں پنجاب کی ایک قوم نے جن کو سکھ کہا جاتا ہے۔ پانچ ندیوں کی زمین کو مسلمانوں کے خون سے سیراب کر رکھا تھا۔ ہر طرف ظلم اور بدامنی کا دور دورہ تھا مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے تھے، قربانی اور اذان کی ممانعت تھی مسلمان عورتوں کی عصمت کو سر بازار لوٹا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان مجاہدین اسلام کو سکھوں کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں سینکڑوں حفاظ، علماء اور اولیاء اللہ و مشائخ عظام شریک تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی شہیدؒ اور حضرت میانجیوؒ بھی اس جہاد میں شریک تھے۔ مگر بعد میں کسی مآل اندیشی اور مصلحت کی وجہ سے آپ کے ہر دو پیرو مرشد نے آپ کو واپسی وطن کا حکم دیا اور آپ لوہاری تشریف لے آئے۔

اسی معرکہ میں حضرت سید شہیدؒ اور حضرت اسماعیل صاحبؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب شہیدؒ ہوئے اور ملک و قوم اور اسلام کا حق ادا کر گئے [1]

اللہ تعالیٰ کی ہزاراں ہزار رحمت نازل ہوں ان کے شہداء ان کی روحوں پر

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] نہایت افسوس ہو کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) سید صاحب پر یہ تہمت لگائی ہو کہ وہ ڈکٹیٹر شپ حاصل کرنا چاہتے تھے (ملاحظہ ہو مولانا سندھی کی شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)

اس تحریک میں پسپا ہونے کے بعد کیا ہوا؟ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے تذکرے میں بیان کریں گے۔ اس مقام سے اس تحریک کے تسلسل کو قائم کرنا چاہیئے۔

اخلاق و عادات اولیاء اللہ کے اخلاق و عادات کا کیا کہنا۔ اخلاق حسنہ کے مجمع اور مظہر ہوتے ہیں لیکن ـ

ہر گل را رنگ و بوے دیگر است

حضرت میانجیو صاحبؒ جسامت کے اعتبار سے بھی نحیف، پستہ قد، گندمی رنگ تھے۔ وضع قطع نہایت سادی، درویشانہ تھی، نیلا تہبند، گیروا کرتا، دو پلی ٹوپی۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ سے دور، سادگی انتہا سے زیادہ تھی کوئی شناخت بھی نہ کرتا تھا۔ کہ یہ بھی کچھ ہیں، عام انسانوں کی طرح رہتے۔ چنانچہ جب حافظ ضامن شہیدؒ آپ سے بیعت ہونے کے لئے جھنجھانہ پہنچے تو میانجیو صاحبؒ سے مخاطب ہو کر پوچھا: ارے دھوبی! میانجیوؒ کا مکان کہاں ہے ؟ فرمایا "میں کپڑوں کا دھونے والا نہیں دل کا دھونے والا ہوں" آپ روحانیت کے نہایت اونچے مقام پر فائز تھے۔ بقول مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جو کیفیت حضرت منصورؒ پر صرف چند گھنٹے یا چند منٹ طاری رہی تھی۔ اور وہ اس کو برداشت نہ کرسکے۔ اور "انا الحق" کہدیا۔ وہی کیفیت حضرت میانجیو صاحبؒ پر برابر تیس سال تک مسلسل طاری رہی۔ مگر اس قدر اعلیٰ ظرف رکھتے تھے کہ اُف تک نہ کی[1]۔ بایں ہمہ اتباع شریعت میں نہایت پختہ تھے۔ ہر حال میں احترام شریعت ملحوظ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ یا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے منقول ہے کہ ایک شخص نہایت ہی خوش گلو تھے اور نعت وغیرہ پڑھتے تھے کسی

---

[1] نور محمدی۔

نے حضرت میانجیو صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ شخص نہایت خوش گلو ہے اور نعت پڑھتا ہے آپ بھی سن لیں، آپ نے فرمایا لوگ مجھے کبھی کبھی امام بنا دیتے ہیں ۔ اور غنا بلامزامیر میں بھی علمار کا اختلاف ہے ۔ اس لئے اس کا سننا خلاف احتیاط ہے ۔ لہٰذا اس کے سننے سے معذور ہوں [۱]

قطب عالم شیخ الاسلام والمسلمین سیدی و مرشدی و مولائی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح فرماتے ہیں ۔

"آپ کے زمانے میں ہندوستان کا دنیاوی پایۂ تخت تو دہلی تھا ۔ اور روحانی پایۂ تخت لوہاری تھا" [۲]

بیان کیا گیا ہے کہ تیس سال تک کبھی جماعت کی تکبیر اولے لی فوت نہیں ہوئی ۔ قناعت اور توکل کا یہ عالم کہ ایک مرتبہ ایک ہندو سادھو نے کیمیا بتلانی چاہی تو صاف انکار کر دیا ۔ فقر کا یہ عالم کہ دو روپیہ ماہوار کے ملازم تھے ۔ اور ایک درجن سے زائد افراد کے نان و نفقہ کا بار سر پر ۔ منکسر المزاجی و تواضع کا یہ عالم، کہ ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے آپ کی شان میں کسی کے ذریعہ سے نظم سنوائی ۔ تو آپ نے فرمایا ۔ کہ :۔

"خدا اور اس کے رسول ص کی صفت اور ثنا بیان کرنی چاہیئے ۔"

مقبولیت اور للّٰہیت کا یہ عالم کہ جب آپ بازار کو نکلتے تو غیر مسلم دوکاندار تک تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے ۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولے
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

ذیل میں ہم شیخ محمد محدث تھانویؒ کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں ۔ جس سے حضرت میانجیو صاحبؒ کا تعارف ہوتا ہے کہ وہ کس شان کے بزرگ تھے ۔

---

[۱] ارواح ثلاثہ ص۱۶۹ [۲] نور محمدی ص۶

مولد و موطن ایشاں قصبۂ جھنجھانہ	آپ کا مولد اور وطن قصبہ جھنجھانہ ہے
است و نسبت طریقت از حاجی	طریقت کی نسبت حاجی عبدالرحیم
شاہ عبدالرحیم شہیدؒ داشتند از	شاہ صاحب شہید سے رکھتے تھے۔
اولاد احفاد حضرت شاہ عبدالرزاقؒ	اور شاہ عبدالرزاق صاحب علوی
علوی جھنجھانوی بودند و نسبت باطن	جھنجھانویؒ کی اولاد میں سے تھے۔
ہر چہار طریق کہ از حاجی صاحب	طریق اربعہ کی نسبت آپ کو حاجی صاحب
بایشاں رسیدہ بود اخفاء می کردند	سے تھی۔ اور بہت زیادہ اخفا کرتے تھے۔
بر اتباع سنت آں حضرت صلی اللہ	اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم حریص بودند چنانچہ تکبیر اولیٰ	وسلم پر بہت زیادہ حریص تھے چنانچہ
قضا نہ کردند اہلِ نسبت صاحب	تکبیر اولیٰ قضا نہ کرتے تھے۔ اہلِ نسبت
ہمت قوی بودند[1]	و صاحبِ ہمت تھے۔

اتباع سنت ایک ایسا وصف ہے جو تمام اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کو حاوی ہے کہ جس کے بعد اخلاقیات کے سلسلہ میں مزید لکھنے کی حاجت نہیں ہے۔

وفات | ۸۵ سال تک حضرت نور محمد صاحبؒ نے عالم اسلام کو منور کر کے رفیقِ اعلیٰ کی ملاقات کا قصد کیا۔ یعنی آپ کا وصال ہوگیا۔ دن اور مہینہ بھی وہ کہ جس کی فضیلت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کچھ فرمایا ہے۔ یعنی ۴ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ دن جمعہ ہے۔ آج آپ کا مزار جھنجھانہ (احاطہ امام سید محمود شہید نرواری) منبع فیض بنا ہوا ہے

خلفاء و مریدین | حسب ذیل بزرگانِ دین تھے۔

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (خلیفہ)

(۲) حضرت حافظ ضامن شہید تھانوی۔ (")

---

[1] نور محمدی ص ۹۲

(۳) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی (خلیفہ)
(۴) حضرت شیر محمد خان صاحب لوہاری (" ")
(۵) حضرت شیخ امام الدین صاحب تھانوی (مرید)
(۶) حضرت حافظ محمود صاحب (" ")
(۷) حضرت حافظ نور صاحب جھنجھانوی (" ")

حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ

سنہ ھ لغایتہ ۱۲۷۳ھ

آپ کا وطن تھانہ بھون ہے۔ اور آپ مرید و خلیفہ حضرت میانجی نور محمد صاحبؒ کے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے بعد آپ بیعت ہوئے تھے۔ بڑے صاحب فضل و کمال اور کشف و کرامات ہیں۔ آپ کے بارے میں ایک واقعہ نہایت ہی مشہور و معروف ہے۔ جس کو صاحب سوانح نے اس طرح بیان کیا ہے۔

حضرت میانجیو علوی جھنجھانویؒ کے ایک دوست دہلی میں رہتے تھے یہ دونوں حضرات سال بھر میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یعنی کبھی میانجیو صاحبؒ ان سے ملنے جاتے تھے کبھی وہ خود میانجیو صاحبؒ سے ملنے آتے تھے۔ ایک بار حضرتؒ اُن سے ملنے دہلی تشریف لے گئے آپ کے ساتھ حافظ ضامن صاحبؒ بھی تھے۔ ملاقات کے بعد ان...... صاحب نے حضرت سے دریافت کیا۔ کہو امسال کتنے تیار کئے۔ فرمایا یہاں تو یہی ایک ہیں۔ انھوں نے کہا۔ جا میرے یار مدرسہ میں بھی تعلیم میں پھسڈی تھا اور اب بھی ہے۔ دیکھو یہاں تو اس سال بیسؔ تیار کئے ہیں۔ حضرت حافظ صاحبؒ کو اپنے مرشد کے متعلق یہ توہین آمیز الفاظ ناگوار گذرے۔ اور آپ جامع مسجد کی حوض پر وضو کرنے بیٹھ گئے۔ ابھی وہ اپنا پاؤں دھو ہی رہے تھے۔ کہ حضرت کے ان دوست صاحب کو گھبراہٹ محسوس ہوئی تو حضرت میانجیو صاحبؒ نے فرمایا۔ گھبراؤ نہیں ہم اپنے بائے کو خود سنبھال لیں گے۔ اور بایاں پاؤں بغیر دھوئے ہوئے حضرت میانجیو صاحبؒ نے حضرت حافظ صاحبؒ کو بلایا۔ حافظ صاحبؒ امتثال حکم کے طور پر وضو ناتمام چھوڑ کر حاضر ہوئے

اور ان بیس والے حضرت سے فرمایا کہ آپ کے بیسوں تو کورے ہیں۔ کیونکہ حافظ صاحبؒ نے ان بیسوں کی نسبت سلب کر لی تھی۔ (نور محمدی)

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی تربیت بعد وصال حضرت میانجیو صاحبؒ آپ ہی نے کی تھی۔ بایں ہمہ تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنی سہ دری میں بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس کو مسئلہ پوچھنا ہو تو شیخ محمدؒ کے پاس جائے اور بیعت ہونا ہو تو حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پاس جائے اور حقہ پینا ہو تو یاروں کے پاس آجائے۔

اس کے علاوہ بڑے عارف باللہ صاحب فہم تھے۔ ایک مرتبہ قحط کے زمانے میں کسی نے حاجی صاحبؒ سے درخواست کی کہ حضرت! مہمان زیادہ ہیں اور کھانا کم ہے حاجی صاحبؒ نے اپنی چادر یا رومال بھیجدیا کہ اس کو کھانے پر ڈھانک دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کھانے میں بہت برکت ہوئی۔ یہ خبر حافظ صاحبؒ کو معلوم ہوئی تو سنکر حاجی صاحب سے فرمایا۔ اجی تھا آپکی چادر سلامت چاہیئے۔ اب قحط کا کیا غم ہے چنانچہ حاجی صاحب فوراً ہی متنبہ ہوئے اور استغفار کی۔

تھانہ بھون اور شاملی کے معرکہ ۱۸۵۷ء میں شریک رہے۔ اور اسی معرکہ میں زیر ناف گولی لگکر شہید ہوئے۔ آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ بوقت وصال قریب رہے۔ حتیٰ کہ مولانا قدس سرہٗ کے زانوئے مبارک پر سر رکھے ہوئے ہی آپ واصل بحق ہوگئے۔ بزرگوں کا خیال ہے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کی نسبت اور تمام فیوض و برکات حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ قدس اللہ سرہٗ کی طرف منتقل ہوگئے۔ اس وجہ سے آپ مجمع البحرین (حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ) ہوگئے۔ حضرت حافظ صاحب شہیدؒ کے خلیفہ خاص حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحبؒ حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت تھے۔ اور ان ہی سے اجازت بیعت بھی حاصل کی۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی

سـ ھ لغایتہ ۱۲۸۳ھ

نام ونسب آپ کا اسم گرامی مولانا مظفر حسین صاحبؒ ہے۔ آپ مولانا محمود بخش صاحبؒ کے صاحبزادے اور مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے ہیں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے معاصرین میں سے ہیں سلسلۂ نسب آپ کا یہ ہے۔ مولانا مظفر حسین صاحب بن مولانا محمود بخش صاحب بن مولوی حکیم شیخ الاسلام بن حکیم قطب الدین صاحب بن شیخ عبدالقادر بن محمد شریف بن مولوی اشرف بن جمال محمد شاہ بن بابن بن بہاؤ الدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

تعلیم وتربیت ابتدائی تعلیم حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ سے حاصل کی ہے۔ مفتی الٰہی بخش صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ممتازترین شاگردوں میں سے ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور مفتی اور طبیب تھے۔ عربی، فارسی، اُردو کی شاعری میں اُستادانہ قدرت رکھتے تھے۔ آپ نے بانت سعاد کی شرح عربی، فارسی، اُردو کے اشعار میں کی ہے۔ عربی فارسی کی چالیس تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔

مفتی الٰہی بخش صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت تھے۔ تواضع وانکساری کا یہ عالم تھا کہ باوجود شیخ وقت ہونے کے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ سے جو آپ سے ۴۰ سال چھوٹے تھے۔ بیعت ہوئے اور استفادہ کیا۔

جب مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کا ۱۲۴۵ھ میں وصال ہوا تو آپ نے اپنی بقیہ تعلیم ظاہری وباطنی حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلویؒ نواسہ وشاگرد رشید حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے پوری کی اور نہایت بلند پایہ عالم ہوئے۔

سلوک وتصوّف | آپ حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ اور شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ حضرت سید احمد شہید صاحبؒ کے صحبت یافتہ ہیں لیکن مرید وخلیفہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مہاجر مکیؒ کے ہیں۔ آپ کے زہد وتقویٰ کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ تحریر فرماتے ہیں۔

> جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے تقویٰ اللہ اکبر ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ اگر مشتبہ چیز معدے میں پہونچ گئی تو اُسی وقت قے ہوجاتی تھی۔ الخ (سوانح عمری ص)

نہایت سیدھی سادی زندگی کے مالک تھے۔ ایک گاڑھے کا کرتہ، پائجامہ یا نیلی لنگی۔ یہ آپ کا لباس تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی صاحبہ بی امۃ الرحمٰن المعروفہ امی بی[1] نے آپ کو ململ یا تنزیب کا کرتہ سی دیا۔ اوّل تو پہننے سے انکار کردیا تھا لیکن بعد میں صاحبزادی کی خاطر پہن لیا۔ اور جمعہ کی نماز پڑھ کر اتار دیا۔ اور فرمایا کہ میرا گاڑھے کا کرتہ دیدو۔ اس میں عُجب پیدا ہوتا ہے۔

سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے پیدل سفر کرتے تھے۔ اور سامان سفر۔ لوٹا، لنگی، لکڑی، شکیزہ ہوتا تھا۔ جہاں شام ہوگئی وہیں شب بسر فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شام ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے کوئی مسلمان نہ تھا۔ وہاں لوگوں سے کہا کہ رہنے کے لئے کوئی جگہ بتادو۔ تو ایک شخص نے گاؤں کے باہر کولہو

---

[1] امی بی حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب وحضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی نانی ہوتی ہیں۔ نہایت عابدہ زاہدہ خاتون تھیں جس وقت انتقال ہوا تو ان کپڑوں میں کہ جن میں آپ کا پاخانہ لگ گیا تھا عجیب وغریب مہک تھی کہ آج تک کسی نے ایسی خوشبو نہیں سونگھی۔ آپ کی صاحبزادی کا نکاح حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب والد بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے ہوا۔ آپ کے حالات حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحبؒ کے تذکرہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

بتادیا۔ آپ کے پاس روٹی ٹھی اس کو نوش فرمایا۔ اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام کے لئے جنگل میں آیا تو حضرتؒ کو قرآن شریف پڑھتے سُنا تمام شب بیتابی سے گذاری اور صبح کو حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا۔ کہ رات جو تو پڑھتا تھا وہی جلدی سے مجھے بھی پڑھا دے۔ اس کے بعد آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کے بیوی بچے سب مسلمان ہو گئے۔

ایک مرتبہ آپ کا جلال آباد یا شاملی گذر ہوا۔ ایک مسجد ویران پڑی تھی وہاں نماز کے لئے تشریف لا کر پانی کھینچا، وضو کیا، مسجد میں جھاڑو دی۔ بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اس نے کہا جی حضرت سامنے خان صاحب کا مکان ہے۔ جو شرابی اور رنڈی باز ہیں۔ اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور دو چار بھی نمازی بن جائیں۔

آپ خان صاحب کے پاس تشریف لے گئے تو رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی اور نشہ میں مست تھے۔ آپ نے خان صاحب سے فرمایا کہ بھائی خان صاحب اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور مسجد آباد ہو جائے۔ خان صاحب نے کہا میرے سے وضو نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ دو بُری عادت چھوٹتی ہیں۔ آپ نے فرمایا بے وضو ہی پڑھ لیا کرو۔ اور شراب بھی پی لیا کرو۔ اس پر اس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو نماز پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے۔ اور کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدہ میں خوب روئے۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ سے دو ایسی باتیں سرزد ہوئی ہیں جو کسی سے کبھی نہیں ہوئیں۔ اوّل یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دیدی۔ دوسرے یہ کہ آپ سجدے میں بہت روئے۔ فرمایا کہ سجدے میں میں نے جناب باری تعالیٰ سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت کھڑا تو میں نے کر دیا۔ اب دل تیرے ہاتھ میں ہے۔

ان خان صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا خیال آیا کہ آج پہلا روز ہے لاؤ غسل کر لیں کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ غسل کیا۔ اور پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی۔ بعد نماز باغ کو چلے گئے۔ عصر اور مغرب باغ میں اسی

وضو سے پڑھی۔ بعد مغرب گھر پہونچے تو طوائفیں موجود تھیں سا قبل کھانا کھانے گھر میں گئے بیوی پر جو نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ ان کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے۔ اور آج تک نہ کبھی بیوی کے پاس گئے اور نہ اس کی صورت دیکھی تھی۔ فوراً باہر آئے رنڈیوں سے کہا، میرے مکان پر آئندہ کبھی نہ آنا اور خادم سے کہا۔ بستر گھر میں بچھا دو۔ سنتا ہے۔ کہ ان خان صاحب کی ۵۰ سال تک کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی۔

ایسے ہی ایک مرتبہ آپ گڈھی پختہ تشریف لے گئے۔ ایک خان صاحب سے نماز کے لئے کہا۔ اس نے کہا کہ مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور وضو سے یہ اُتر جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ بغیر وضو پڑھ لیا کرو۔ خان صاحب نے کچھ روز بعد بغیر وضو نماز پڑھی۔ پھر خیال آیا۔ کہ ایک مولوی کے کہنے سے تو بغیر وضو نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اور اللہ و رسولؐ کے کہنے سے باوضو نماز نہیں پڑھی جاتی۔ اس کے بعد ہمیشہ باوضو نماز پڑھنے لگے۔

ایک مرتبہ آپ حج سے تشریف لا رہے تھے۔ کہ پانی پت سے چل کر کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں قیام فرمایا اور آخر شب میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے رات کو سرائے میں چوری ہو گئی۔ بھٹیاری نے کہا کہ ایک شخص مسجد میں ٹھہرا تھا اور صبح ہی چلا گیا۔ ضرور وہی چور ہے۔ لوگ تعاقب کے لئے آئے اور جھنجھانہ کے قریب آکر پکڑ لیا۔ اور کہا کہ تھانہ چلو، آپ نے فرمایا کہ جھنجھانہ کے تھانہ میں نہ لے چلو اور کہیں لے چلو۔ اس پر ان لوگوں کو اور بھی شبہ ہوا اور وہ جھنجھانہ کے تھانہ میں لے گئے۔ اور ایک سپاہی کے حوالہ کر دیا۔ جس نے حوالات میں آپ کو بند کر دیا۔ تھوڑی دیر میں قصبے کے لوگوں نے دیکھا۔ اور تمام قصبہ میں شور ہو گیا۔ عوام بہت مشتعل ہو گئے اور یہ سمجھ کر کہ تھانیدار کی بدمعاشی ہے۔ اس کی جان کے دَرپے ہو گئے۔ بہرحال جوں توں کر کے اشتعال ختم ہوا۔ اور تھانیدار نے معافی مانگی۔ اور چھوڑ دیا۔

ایک مرتبہ آپ کاندھلہ تشریف لا رہے تھے۔ آپ خالی ہاتھ تھے کہ ایک آدمی ملا۔

اور آپ سے پوچھا کہ کہاں جاؤ گے؟ آپ نے جواب دیا کاندھلہ چنانچہ اس آدمی نے اپنا سامان آپ کے سر پر رکھ دیا۔ کاندھلہ آکر جب اس آدمی کو معلوم ہوا تو بہت شرمندہ ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں میں خالی ہاتھ تھا۔ اور تم بوجھ لئے ہوئے آرہے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں آپ نے دہلی میں کبھی سالن سے روٹی نہ کھائی دریافت کیا۔ تو فرمایا کہ دہلی کے اکثر سالنوں میں کھٹائی پڑتی ہے اور آموں کی بیع ناجائز طریقہ پر ہوتی ہے اس لئے میں سالن سے روٹی نہیں کھاتا۔ آپ دعوت میں کسی کے یہاں کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ابتداً قاضی صاحب اور متولی صاحب کے یہاں کھانا کھایا کرتے تھے۔ انتقال کے بعد ان کے یہاں بھی کھانا چھوڑ دیا۔ اور کچھ عرصہ بعد پھر شروع کر دیا۔ جب ان کے لڑکے نے دریافت کیا۔ تو فرمایا کہ تم نابالغ تھے اس لئے میں تمہارے مال سے پرہیز کرتا تھا۔

آپ نہایت منکسر المزاج تھے۔ صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے جب تشریف لاتے تو جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے سب کے یہاں جاتے اور دریافت فرماتے کہ بازار سے کچھ سودا منگانا ہے۔ ان دنوں میں عموماً غلہ کے عوض بازار سے سامان ملتا کرتے تھے۔ آپ کرتے کے دامن میں غلہ لے جاتے اور سامان خرید کر لا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ رام پور تشریف لے گئے۔ ایک عورت نے شکایت کی کہ میرا خاوند مجھے خرچ نہیں بھیجتا۔ چنانچہ آپ وہاں سے فیروز پور اس کے خاوند کے پاس گئے اور اس کو سمجھایا کہ آئندہ ہمیشہ خرچ بھیجا کرو۔

نکاح بیوگان کے لئے سخت کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت مفتی الٰہی بخش کے صاحبزادے ابوالقاسم صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ تو آپ نے ان کی بیوہ کو اولاً ترجمہ قرآن شریف پڑھایا۔ ایک دن موقعہ پا کر نکاح ثانی کی ترغیب دی۔ اس پر انھوں نے کہا۔ کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہوگی۔ اس پر اس نے کہا کہ

اگر تم نکاح کرو۔ تو میں تیار ہوں مگر ہم تم دونوں مارے جائیں گے آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا۔ اور پھر اقرار فرمالیا۔ اور ایک موقعہ پر دو چار آدمیوں کے سامنے مخفی طور سے نکاح ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد حمل ٹھہر گیا۔ کسی کو نکاح کی خبر نہ تھی ہر جگہ زنا کا شور مچ گیا۔ تھانہ بھون والے چڑھ کر آئے۔ لڑکی والے کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کوئی مولوی مظفر حسین صاحب کا سر اُتار لا دے گا۔ اس کو ایک ہزار روپیہ انعام ملے گا۔ آپ کاندھلہ سے دہلی تشریف لے گئے۔ اتفاق کی بات ہے۔ کہ اُن کی والدہ سخت علیل ہوگئیں۔ قاضی صاحب .... بہت پریشان ہوئے کسی فقیر نے کہدیا۔ کہ حافظ ضامن صاحبؒ سے دعا کراؤ۔ بہر حال ان کے لوگ بہت سر ہوئے تو فرمایا۔ کہ دہلی سے اپنی بہن یعنی مولانا مظفر حسین صاحبؒ کی اہلیہ کو یہیں بلاؤ۔ تب دعا کروں گا۔ ان کے پہنچتے ہی خود بخود صحت ہوگئی۔

کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی اور تھی بیوہ آپ نے اس کو عقیدہ بدلنے کی ترغیب دی۔ اس نے کہا کہ اگر تم مجھ سے نکاح کرو تو میں تیار ہوں۔ چنانچہ آپ نے وعدہ کرلیا اور اس نے توبہ کرلی اور آپ کا نکاح اس عورت سے ہوگیا۔ اس عورت نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ دروازہ بند کرلیتی تھی آپ دروازہ پر لنگی بچھا کر تمام رات نماز میں گذار دیتے تھے۔

حج اور وصال آپ نے سات حج پیدل کئے ہیں ۱۳ر جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ میں جب آپ مکہ معظمہ پہونچے تو اسہال شروع ہوگئے۔ آپ نے حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ میری خواہش ہے کہ میں مدینہ منورہ جاکر مروں۔ چنانچہ حاجی صاحبؒ نے مراقبہ کیا۔ اور فرمایا کہ آپ مدینہ منورہ پہونچ جائیں گے۔ ابھی مدینہ منورہ ایک منزل باقی تھا کہ آپ پھر بیمار ہوئے۔ اور۔ ار محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ رمئی ۱۸۶۶ء کو انتقال فرمایا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزار مقدس کے قریب مدفون ہوئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

کرتہ، پائجامہ، لنگی، مشکیزہ، لوٹا۔ آپ نے چھوڑا۔ حسب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ لنگی مریدین میں تقسیم ہو گئی۔ کرتہ اور پائجامہ صاحبزادیوں کے پاس ہندوستان بھیج دیا گیا۔

(ماخوذ از تذکرۃ الخلیل)

حضرت شیخ محمد صاحب تھانویؒ

۱۲۳۱ھ لغایت ۱۳۱۷ھ

نام ونسب | آپ کا مولد تھانہ بھون، تاریخی نام ظہور احسن (۱۲۳۱ھ) اور اصلی نام شیخ محمد فاروقی ہے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:-

"شیخ محمد فاروقی بن مولوی حمد اللہ خاں بن حکیم محمد بخش صاحب بن قاضی حکیم محمد رحیم صاحب بن حافظ محمد اعظم بن قاضی مکرم خاں بن شیخ احمد عرف نواب فاروقی بن ملا محمد صابر بن شیخ علی کلاں بن شیخ عبداللہ بن شیخ سراج الدین بن قاضی چندن بن قاضی محمد موسیٰ بن قاضی نصر اللہ خاں بن قاضی محمد یعقوب خاں بن شیخ نظام الدین وحشی بن شیخ شہاب الدین بن معروف کرخی بن فرخ شاہ کابلی بن نصیر الدین شاہ بن محمود شاہ بن مسعود شاہ بن عبداللہ شاہ بن شاہ واعظ اکبر بن شاہ ابوالفتح بن شاہ محمد اسحاق بن شاہ تاج الاولیاء بن سلطان ابراہیم بن ادھم بن سلیمان بن ناصر الدین بن عبداللہ بن عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہم

(حالات محمدیہ)

آپ کے جدِ اعلیٰ شیخ احمد عرف نواب فاروقی عہدِ عالمگیری میں سرکاری آدمی تھے اور حکومت کے ایک فرد شمار ہوتے تھے۔ اِسی وجہ سے آپ کو نواب فاروقی کہا جاتا تھا جن کو عالمگیرؒ کی طرف سے تھانہ بھون مع مضافات بطور جاگیر عطا ہوا تھا۔ ان کے بعد اس خاندان کے تمام افراد کے تعلقات شاہی خاندان سے اِسی طرح برقرار رہے جس طرح اُن کے مورث اعلیٰ کے تھے۔ اور حکومت کی طرف سے بھی ان کو وہی مراعات حاصل رہیں جو اُن کے جدِ اعلیٰ کو تھیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اِس خاندان کو قاضی کا خطاب عنایت ہوا۔

جس کی آخری کڑی قاضی عنایت علی خاں تھے۔ غالباً اسی تعلق اور ربط کی وجہ سے حکومت انگلشیہ نے ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اس خاندان کے افراد کو برباد کرنے میں ان ہی تلواروں سے کام لیا جن کو شاہی خاندان کے سروں پر چلایا گیا تھا۔

حضرت محدث تھانویؒ کی رشتہ داری اور خاندانی تعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حافظ ضامنؒ صاحب شہیدؒ سے بھی تھا۔ یہ تینوں بزرگ ہم جد تھے۔ لیکن حضرت حافظ صاحبؒ سے ایک رشتہ اور بھی تھا یعنی حافظ صاحب رشتہ میں ماموںؒ ہوتے تھے۔ شرح حزب البحر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"حافظ صاحب شہیدؒ میرے ماموں بھی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ میری والدہ ان کی حقیقی خالہ کی بیٹی ہیں"۔

تعلیم وتربیت | یہ لکھا جا چکا ہے کہ آپ کی پیدائش ۱۲۳۰ھ کی ہے۔ اور انگریزی تاریخ ۳۰ را پریل ۱۸۱۵ء ہے۔ چونکہ گھرانہ متمول اور ذی علم تھا اس لئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی رہ کر ہوئی۔ دس سال کی عمر ہونے تک حفظ قرآن شریف اور ابتدائی درسیات پڑھ کر فارغ ہوگئے۔

جب عمر شریف ۱۱ سال کی ہوگئی تو آپ کو دلی تحصیل علم کی غرض سے بھیجا گیا۔ یہاں ۷ سال رہ کر آپ نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے تمام فنون کی تکمیل کی اور اٹھارہ سال کی عمر میں بالکل فارغ التحصیل ہوگئے۔ حضرت شاہ صاحب آپ کی علمیت، لیاقت، ذہانت کے اس قدر معتقد ہوئے کہ ایک دن مجمع عام میں ارشاد فرمایا۔

"یہ لڑکا جواں نصیب میرا کل علم عنقریب اس طرح سے لے جائے گا۔ جیسے کوئی ذخیرہ بے تکلف قفل توڑ کے کسی کا جملہ اثاث البیت نکال لے جاتا ہے یا طرفۃ العین میں کوئی آنکھ بچا کر کسی کا تمام مال، بے قیل وقال علی سبیل الاستعمال لے جاتا ہے"

۱؎ حالات محمدی ص۵

حضرت محدث صاحبؒ کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد ویسے ہی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر قارئین کرام نے اِس ارشاد کو ذہن میں محفوظ رکھا۔ اور اس مختصر مضمون کے پڑھتے وقت اِس سے کام لیا تو ہمارے اُن معاصرین کے عدل وانصاف پر بخوبی متنبہ ہو جائیں گے۔ جو انھوں نے جنگِ آزادی کی ابتدا اور علمائے دیوبند کے متعلق لکھا ہے۔ میرے نزدیک محدث صاحبؒ کے متعلق انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ اور موجودہ حالات سے متاثر ہو کر تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

تھانہ بھون کو واپسی | ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے۔ اور علمی مشاغل (تصنیف وتالیف) میں مشغول ہو گئے۔ اسی زمانہ قیام میں آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کا ذکر مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

دِلّی اور تھانہ بھون کے سرکاری اور علمی تعلقات کچھ ایسے نہ تھے جو نظر انداز کر دیے جاتے۔ لہذا محدث صاحب کی آمد و رفت برابر دِلّی ہوتی رہی۔ اور دِلّی میں مشہور علماء کے ساتھ کافی دِنوں تک علمی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، مفتی صدرالدین صاحب آزردہ۔ مولانا مملوک علی صاحب مومن خاں صاحب وغیرہ حضرات سے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ حضرات بھی تھانہ بھون آتے رہتے تھے۔ عمر کے اعتبار سے آپ اگرچہ اُن حضرات سے خورد تھے لیکن علمی اعتبار سے یہ حضرات آپ کو اپنا دوست ہی خیال فرماتے تھے۔

چنانچہ ۱۲۹۹ھ میں (نواب) صدیق حسن خاں صاحب تھانہ بھون آئے۔ اور آپ سے علمی استفادہ کیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ، حضرت حاجی صاحبؒ تو آپ کے ہر وقت کے ہمنشین تھے۔ اور مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جن حضرات نے ارواحِ ثلاثہ، امیر الروایات، تذکرۃ الرشید کو پڑھا ہے۔ وہ حضرات ان اصحاب ثلاثہ کے تعلقات سے بخوبی واقف ہیں۔

بیعت وسلوک | ۱۲۳۶ھ میں حضرت سید احمد صاحبؒ شہید تھانہ بھون تشریف لائے۔ اور کافی دنوں تک یہاں قیام رہا۔ اُس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی آپ حضرت سید صاحبؒ سے تبرکاً بیعت ہو گئے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"وجہ بیر صحبت معنوی بہ نسبت حضرت سید صاحبؒ قبلہ مصدر المناقب کو ابتداءً بعمر ہفت سالگی اوّل شرف بیعت اور حاضری یک دو بار حلقہ توجہ دہی حضرت سید صاحب ممدوح ہوا" (ارشاد محمدی)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"وقطع نظر ازیں فقیر یاد دارد کہ عمر ہفت سالی باشد خود در مسجد پیر محمد واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور را اطلاع میان دو آب بہ شرف بیعت از حضرت سید صاحبؒ ممدوح قدس سرہٗ مشرف شد" (رسالہ وحدۃ الوجود)

حضرت سید صاحبؒ کے شہید ہونے کے بعد آپ کو پھر تلاش مرشد ہوئی۔ دِلّی میں حضرت شاہ صاحبؒ جیسے صاحبِ کمال کی صحبت اُٹھائی تھی پھر سید صاحبؒ کی توجہات کو بھی جانتے تھے۔ اس لئے چاہتے تھے کہ کوئی بہت بڑا صاحبِ کمال بزرگ ملے تو بیعت ہو جائیں۔ اس لئے برابر تلاش وجستجو رہتی تھی۔ قرآن وحدیث اور علوم دینیہ کی معلومات عزیزہ کی وجہ سے شیخ کامل کی حقیقت جو آپ کو منکشف ہو گئی تھی جو آج کل کی طرح کسی پروپیگنڈے سے متاثر اور مجروح نہ ہوتی تھی۔ اور غالباً اسی وجہ سے آپ نے شیخ اور بیعت کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ بہت خوب اور مناسب اور خاندانی پیری مریدی پر ایک ضرب کاری ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"چونکہ مُرید مرشد کے ہاتھ پر بیع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس کے ہاتھ پر بیچتا ہے۔ اور اپنی جان ومال کا اس کو مختار بناتا ہے۔ لہٰذا ایسے ہی اندھوں کی طرح نہ بکی جائے۔ بلکہ تاوقتیکہ خوب تحقیق نہ کرے اور مرشد کو

جامع شریعت وطریقت اور علم ظاہر میں ماہر اور باطن میں کامل، اور شرطیں مرشد کی کُلّی یا اکثر نہ پاوے، تب تک اس راہ میں ہرگز قدم نہ رکھے۔ کیوں کہ یہ سودا بار بار خریدا نہیں جاتا ہے۔ (شرح حزب البحر)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس شیخ (میاںجی نور محمد صاحبؒ) سے آپ بیعت ہوئے ...... اُن کا مقام کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کو غیبی بشارت بھی ہوئی جس نے اور بھی آمادہ کر دیا۔ چنانچہ آپ کے بیعت ہونے کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے :۔

" جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب غیبی بشارت پاکر میاں جیو صاحبؒ سے بیعت ہوگئے۔ تو انھوں نے مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کو بتلایا کہ میں لوہاری میں جھنجھانہ کے ایک میاںجی نور محمد صاحبؒ ہیں۔ اُن سے بیعت ہوگیا ہوں۔ تم بھی اُن سے بیعت ہوجاؤ۔ حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ نے اپنے علم کی وجہ سے حضرت میاںجی صاحبؒ کی ایک قسم کی توہین سی کی "نہ اچھا پیر تلاش کیا مسجد کا میاں جی"۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی۔ کہ حضرت میاںجی صاحبؒ اسی مسجد میں جس کو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تشریف لے آئے حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا شیخ محمد صاحبؒ سے فرمایا کہ ہمارے شیخ آگئے ہیں۔ جو کچھ تم کو پوچھنا ہو پوچھ لو۔ اور آیندہ حضرت کی برائی نہ کرنا ورنہ دوستی میں فرق آجائیگا۔ جس پر یہ دونوں حضرات میاں جی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سورۂ رحمٰن کے متعلق سوال کیا۔ تو حضرت میاںجی صاحبؒ نے فرمایا: "میں تو مسجد کا میاں جی ہوں۔ مجھے کیا خبر"۔ جب ان حضرات نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے شیخ محمد صاحبؒ سے فرمایا: "آنکھیں بند کرکے پھر میری آنکھوں کی طرف دیکھو" حضرت شیخ محمد نے جو ایک بار آنکھیں بند کرکے کھولیں۔ اور حضرت میاںجیوؒ کی طرف دیکھا۔ تو حضرتؒ کی آنکھوں میں ان کے سوال کا جواب تھا۔ الخ (نور محمدی)

اس کے علاوہ دو روایات اور ہیں جن میں اگرچہ جزوی اختلاف ضرور ہے لیکن مقصود و مطلوب مشترک ہے۔ بہرحال آپ حضرت میاںجی صاحبؒ سے بیعت ہو گئے میرے خیال میں جس طرح حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بر دست حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے بیعت ہونے نے حضرت حاجی صاحبؒ کے مقام اور رتبہ (باقرار حاجی صاحبؒ) کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اسی طرح مولانا شیخ محمد صاحبؒ کے بیعت ہونے نے میاںجی صاحبؒ کے مقام کو نمایاں کیا ہے۔ پھر جو مقام حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ کا حضرت حاجی صاحبؒ کے نزدیک تھا وہی مقام اور اہمیت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی میاںجی صاحبؒ کے نزدیک تھی کیونکہ ایک متبحر عالم کا بیعت ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میاں جیو صاحبؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) "رسالہ گل لالہ تصنیف کردہ اس مجمع کمالات کا (یعنی حضرت شیخ محمد صاحبؒ) جو معارف ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے۔ فن تصوف میں ہے۔ اور اس کا نام "تنقیۃ الاعتقاد لتصفیۃ الفواد من الکفر والالحاد" ہے۔ میں اس کے دیکھنے کا بے حد شائق ہوں۔ وہ دن کتنا اچھا ہوگا جب اس کے مشتاقان جمال کی آنکھیں اس کے مطالعہ کے کحل الجواہر سے منور اور روشن ہوں گی۔" (دارالعلوم کراچی)

حضرت شیخ محمد صاحب باوجودیکہ مرید تھے عمر بھی ۲۶ سال ہوگی لیکن پیر طریقت کی طرف سے القاب و آداب میں احترام اور یہ اظہار عقیدت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

الحاصل آپ کو حضرت میاںجی کی طرف سے اجازت بیعت اور خرقہ خلافت حاصل ہوا ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں حضرت میاںجی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چار سال بعد ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں فریضہ حج ادا کرنے کے لئے آپ مکہ معظمہ تشریف

لے گئے۔ اس مختصر قیام میں آپ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے برادر خورد جناب شاہ محمد یعقوب صاحبؒ سے فقہ، تفسیر اور صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔ اور اُن تمام اوراد و اشغال و اذکار کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔ جو شاہ صاحبؒ ممدوح کو اپنے نانا شاہ عبدالعزیز سے حاصل تھی۔ خود ہی تحریر فرماتے ہیں :۔

"۱۲۶۳ھ میں فقیر کو بعد شرف بیعت و صحبت بمقام مکہ معظمہ حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب صاحبؒ مہاجر کی نواسہ اور خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اجازت عام اذکار و اشغال و اعمال جملہ اُن طریقوں کے جو اُن کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ممدوح قدس سرہٗ پہونچے تھے۔ مع خرقہ و کُرتہ شریف اپنے کے دمع سند مہری علم حدیث، صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث اور علم تفسیر و فقہ و اصول حدیث اور تصوف باوجود حصول سند علم موصوف فقیر کو پیشتر پیش گاہ حضرت استاذ مولانا شیخ المشائخ مولانا مولوی شاہ محمد اسحٰق صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ سے جو برادر حقیقی کلاں اُن کے ہیں۔ عطا فرمائے اور بعد توجہ دہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ اکبر تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے۔ اور تم کو اب احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی۔ اور ہم میں اور تمہارے پیر و مرشد یعنی مولانا نورالاسلام حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ میں کسی طرح کا تفاوت نہیں۔ (نور محمدی)

ان اقتباسات سے آپ کا اپنے معاصرین میں مقام ظاہر ہو رہا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ناانصافی کی بھی حد ہے کہ لکھنے والوں نے کچھ سے کچھ بنا کر پیش کیا ہے۔ لہٰذا قارئین کرام جب اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے۔ تو خود محسوس کریں گے کہ اس بزرگ کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کیا گیا ہے۔ بس اُن کتابوں اور اسمار کی نشاندہی کر کے اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا جبکہ وقت بھی اتنا

نازک ہے کہ افہام و تفہیم کی بجائے دشمنی اور تعصب آجاتے ہیں۔ اور نہایت شرمناک پروپیگنڈے شروع ہو جاتے ہیں۔

جناب ثناءالحق صاحب پاکستانی نے اپنی تحریر میں اس جگہ سخت تنقید کی ہے۔ لیکن اس کے باعث اور محرک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں میں محدث تھانوی ؒ کے ساتھ بے انصافی کا برتاؤ ہی نہیں بلکہ سوئے ادبی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ اور اکابر کی طرف بلا سوچے سمجھے نہایت کمتر باتوں کو منسوب کر دیا ہے۔

قیام ٹونک ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اس خاندان کے افراد نے تھانہ بھون کی سکونت ترک کر دی۔ اور جس کو جہاں سہولت ملی وہیں مقیم ہو گیا۔ یہی آپ کو پیش آیا کہ جس کی وجہ سے تھانہ بھون کو ترک کرنا پڑا۔ پہلے کچھ دن رام پور منہیاران قیام رہا۔ چنانچہ شرح حزب البحر کی ایک عبارت ہے۔

"جس وقت یہ فقیر شیخ محمد تحریر، تصنیف اور تبیض اس شرح حزب البحر سے فارغ ہوا۔ ایک پہر دن چڑھا تھا اور تاریخ بائیسویں ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ ہجری کی تھی قصبہ رام پور منہیاران ضلع سہارنپور اس حویلی میں جو محل کے نام سے مشہور ہے۔ اور وہ مکان اصل میں شیخ سالار چشتی کا تھا۔ اور جس وقت فقیر اپنے وطن اور مولد و مسکن سے جلاوطن ہوا تو یہیں مقیم تھا۔"

اس عبارت سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ۱۲۷۴ھ ہجری میں تھانہ بھون کو ترک کر چکے تھے۔ کیوں کہ آپ کی ایک قلمی بیاض کے حاشیہ پر بھی درج ہے۔ کہ صاحبزادی مقصود النساء جو بعد میں مولوی عبدالاحد صاحب مالک مجتبائی پریس دہلی سے منسوب ہوئیں ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ کو قصبہ رام پور منہیاران میں پیدا ہوئیں۔

آپ ریاست ٹونک کب تشریف لے گئے؟ اس کی کوئی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے البتہ ایک جگہ "ارشاد محمدی" میں تحریر فرمایا ہے۔

"ریختہ زبان میں بہنگامِ قیام میرٹھ ۱۲۷۷ھ بنظر نفع عام قید تحریر میں آئے"۔

معلوم ہوا کہ جب آپ ٹونک تشریف لے گئے۔ وہ ۱۲۷۷ھ کے بعد کا زمانہ ہوگا۔ یہاں آپ نے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) کے اوائل تک قیام فرمایا۔ گویا کہ تقریباً ۶ یا ۷ سال آپ یہاں مقیم رہے۔ نواب صاحب نہایت عزت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور بطورِ وظیفہ مبلغ سو روپے ماہوار آپ کو دیتے تھے۔

تھانہ بھون کو مراجعت اور انتقال مولانا شیخ محمد صاحبؒ ۱۲۸۵ھ تک تھانہ بھون واپس آگئے۔ اور یہاں آکر ہی آپ کی اہلیہ محترمہ عائشہ بنت سعادت علی خاں کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد دوسری اہلیہ بی فاطمہ بھی انتقال پاگئیں۔ اور ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ بعمر ۷۶ سال آپ کا انتقال ہوا۔ تاریخ مادہ آیۂ کریمہ "عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا" ہے۔ وفات کی شب کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ دہلی کی جامع مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے۔ دوسرے صاحب نے دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پوچھا تو فرمایا۔

"مولوی شیخ محمد آتے ہیں۔ اُن کے لینے کو کھڑا ہوں"

ع۔ "خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

صدقہ جاریہ صدقہ جاریہ میں آپ نے متعدد اشیا چھوڑیں جن میں اولادِ صالح اور باکمال جانشین اور تصنیف و تالیف داخل ہیں۔ آپ کی تین شادیاں ہوئیں۔ زوجہ اوّل بی عائشہ بنت سعادت علی خاں۔ دوسری بی حمیدا۔ تیسری بی فاطمہ۔ پہلی دونوں بیویوں سے ایک ایک لڑکا اور ایک ایک لڑکی تولد ہوئے۔ تیسری سے صرف ایک لڑکا تولد ہوا۔ بڑے لڑکے کا نام محمد محمود تھا۔ اسی بناء پر مولانا اپنی کنیت ابو محمود لکھا کرتے تھے۔ دوسرے لڑکے کا نام محمد عمر تھا۔ انھوں نے علوم دینیہ میں مہارت حاصل کی اور سلوک و تصوف میں قاضی محمد اسمٰعیل صاحب خلیفہ شیخ محمد تھانویؒ کے خلیفہ ہوئے۔"

۴۰ سال کی عمر میں اُن کا اِنتقال ہوگیا۔

سلسلۂ سلوک وتصوف میں چند حضرات آپ کے جانشین ہوئے۔جن میں قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری نہایت صاحب کمال بزرگ گذرے ہیں۔ اپنے معاصرین میں نہایت اونچے مقام کے مالک تھے۔ (۲) حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی (۳) پیرجی محمد صادق صاحب تھانویؒ مشہور ومعروف بزرگ ہوئے ہیں۔

تصنیف وتالیف میں زیادہ کتابوں کا حال نہ معلوم ہوسکا۔ تاہم جتنی کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ یہ ہیں۔

(۱) اِرشادِ محمدی (۲) انوارِ محمدی۔ میاںجی نور محمد صاحبؒ کے فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ (۳) بیاضِ محمدی۔ عملیات پر مشتمل ایک کتاب ہے۔ جو عطاء المنان سے مشہور ہے (۴) رسالہ وحدۃ الوجود (۵) شرح مثنوی مولانا روم (۶) شرح حزب البحر (۷) حاشیہ سنن ابی داؤد بزبان عربی۔

خراجِ عقیدت | مولانا شیخ محمد تھانویؒ کو ہمارے بہت سے اکابر نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت علامہ کشمیری فرماتے ہیں۔

"ہمارے اکابر حضرات میں حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ بڑے بلند پایہ بزرگ ہوئے ہیں"

مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ ؒ اور اُن کی سیاسی زندگی میں تحریر فرمایا ہے۔

"شیخ محمد تھانویؒ وہ بزرگ ہیں کہ جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کاربند ہیں"

اور مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے مسلک کا سب کو علم ہے۔ لہٰذا اِس پر مزید کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۴۷ھ لغایۃ ۱۳۱۰ھ

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

نوٹ:۔ تذکرہ مشائخ دیوبند راقم الحروف نے چند سال پیشتر لکھا تھا۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن (ایک ہندوستان میں اور دوسرا پاکستان میں) طبع ہو کر نایاب ہو گئے اس وقت چند معتدد (تقریباً آٹھ دس) حضرات کے تذکرے کتاب میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ عرصہ سے احباب کے تقاضے جاری تھے۔ میں بھی برابر تلاش و جستجو میں تھا اب تذکرہ مشائخ دیوبند کا دوسرا ایڈیشن جس کی ضخامت دو چند ہے پیش نظر ہے۔ جس سے مسلک دیوبند کو بخوبی سمجھا جا سکے گا۔ (عزیز الرحمٰن)

وطن اور شرافت نسبی | اسم مبارک قاضی محمد اسمٰعیل، وطن منگلور ہے نسبی اعتبار سے کاظمی سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف کے جد جناب سید نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ترمذ سے ہندوستان تشریف لائے۔ جب علاؤ الدین خلجی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے علماء اور فقراء سے ربط قائم کیا چنانچہ اس نے سید نظام الدین کاظمی ترمذی کو منصب قضا پر سرفراز فرمایا۔ اور صوبہ دلی کا ایک قصبہ (پور) جس کو اب پور قاضی کہا جاتا ہے۔ عطا کیا اور چند مواضعات اور بھی مرحمت فرمائے۔

سید نظام الدین صاحب کی اولاد میں ایک صاحب جناب محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوئے ہیں۔ جو حضرت عثمان جہانگیر شاہ ولایتی سے بیعت تھے۔ اور ان کے پاس روزانہ

پڑھنے کے لئے پور قاضی سے (۱۰ میل) منگلور جایا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پیرو مرشد کے حکم کے مطابق منگلور میں سکونت پذیر ہو گئے۔

منگلور، ضلع سہارنپور کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ جو نہر گنگ کے بائیں کنارے دہلی سے ۱۰۰ میل جانب شمال ہے۔ دہلی سے دہرہ دون جانے والی سڑک پر واقع ہے مشہور ہے کہ مہاراجہ چندر گپت بکرماجیت ۳۷۵ سمبت۔ ۳۱۳ء کے زمانہ میں ایک راجپوت منگل سین نے اس بستی کی بنا ڈالی۔ اور ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کے آثار بستی کے وسط میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد جلد ہی مسلمان آباد ہونے لگے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے بھی اس مقام کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی۔ اور ۱۰۰ سال پرانے قلعہ کی مرمت فرما کر اس جگہ ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جس کے کتبہ پر سن تعمیر ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۴ء کندہ ہے۔

اب سے پانچ صد سال سے زائد ہوئے کہ جناب سید محمد یوسف صاحب کاظمی آباد ہوئے تھے۔ ان کے پوتے مولانا عبدالشکور صاحب عارف کو حکومت کی طرف سے مفتی کا عہدہ اور دانشمند کا خطاب ملا تھا۔ نیز بادشاہ ہمایوں نے ـــــــھ میں انھیں ایک گاؤں محمد پور پرگنہ رڑکی میں بطور معاش مرحمت فرمایا تھا۔ آپ کی اولاد میں قاضی محمد یوسف صاحب بن مفتی نجم الدین صاحب ۱۶۹۳ء کے قریب شہنشاہ اورنگ زیب کی طرف سے پرگنات منگلور۔ دیوبند وغیرہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے بیٹے سید محمد عباس صاحب فرخ سیر بادشاہ کے مقربین دربار میں سے تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ قاضی محمد الیاس صاحب، قاضی شجاع الدین صاحب، قاضی غالب علی صاحب، قاضی عماد الدین صاحب۔ جناب قاضی عماد الدین صاحب حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب کے جد اعلیٰ ہیں۔ اس طرح سلسلۂ نسب یوں ہے۔ قاضی محمد اسمٰعیل صاحب بن قاضی منصب علی بن قاضی فلاح الدین بن قاضی عماد الدین الخ۔

پیدائش اور تعلیم | حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ کا سن پیدائش اگرچہ صراحتہً دریافت نہ ہوسکا۔ مگر جناب کے لوح مزار پر جو اشعار کندہ ہیں۔ ان سے سن وفات بقید تاریخ و دن معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سن ولادت بھی دریافت ہوسکتا ہے۔

اشعار یہ ہیں:۔

ہادی اک عالم کے محبوب جلیل — سید و قاضی محمد اسماعیلؒ
تھی ربیع الاول کی بارہ روز پیر — نو بجے دن کے ہوئے رحلت پذیر
جب ملائک روح کو باحتشام — لے کے پہونچے بر دَرِ دارالسلام
بولا رضوان ادخلوامن ای باب — بے چلو محفل میں حضرت کی شتاب

پہونچے جب تھا ہر طرف سے غلغلہ
محویت سے ان کو یہ رُتبہ ملا

۱۳۱۱ھ یا ۱۸۹۱ء

اس حساب سے سن ولادت ۱۲۴۷ھ ہوتا ہے تعلیم کے اعتبار سے یہ ثابت ہے۔ کہ آپ فارغ التحصیل عالم تو نہ تھے البتہ دستور کے مطابق فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ذیل میں چند واقعات ایسے موجود ہیں۔ جن سے بموجب حدیث شریف۔

من عمل بما یعلم علمہ اللہ ما لم یعلم۔ — جس نے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اس کو نامعلوم چیزوں کا علم عطا فرمادے گا۔

یعنی صفائی باطن کی وجہ سے آپ پر علم کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اس طرح آپ کا علم کسبی اور کتابی علم نہ تھا۔ بلکہ علم وہبی یا علم لدنی تھا۔ حضرت قاضی صاحب کے بارے میں مشہور ہے۔ کہ ایک مرتبہ دیوبند سے چند طالب علم حاضر ہوئے۔ اور لگے سوالات کرنے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے جوش میں فرمایا:۔

"قطبی میں پوچھ لے یا شمس بازغہ میں پوچھ لے"

اسی سے طلبار کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت قاضی صاحبؒ کو چھیڑنا اچھا نہیں ہے۔

حضرت قاضی صاحب بجنور میں | حضرت قاضی صاحبؒ کا دورہ یو۔پی کے مغربی اضلاع اور نواح دہلی میں بہت ہوتا تھا۔ ان دوروں کے اثرات آج تک موجود ہیں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے والد محترم نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ جس کا مفہوم پیش کیا جا رہا ہے۔

"میں نے اس ضلع (بجنور) کے دیہات تک کو ذکر و فکر سے منور اور معمور پایا۔ یہ سب کچھ حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحبؒ کے دوروں کی خیر و برکت ہے"

معلوم یہ ہوا ہے کہ موصوف اس ضلع میں دارانگر گنج تشریف لائے تھے۔ یہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ کے خلیفہ جناب صوفی محمد حسین صاحبؒ مقیم تھے۔ ان سے ملاقات کرنا مقصود تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صوفی محمد حسین صاحب کے کوئی مُرید یا صحبت یافتہ یا دیکھنے والے آج بھی قصبہ کرتپور، محلہ مردہگان میں موجود ہیں۔ جن کا نام امام الدین ہے ٹیلر ماسٹر ہیں۔

بہرحال قاضی صاحب بجنور تشریف لائے۔ اور یہاں مسجد منیہاران میں قیام فرمایا۔ قاضی صاحب کی عادت تھی کہ جس بستی میں جاتے۔ تو اولاً وہاں کے اہل علم اور صلحار کو دریافت کرتے اور اُن کے پاس حاضر ہوتے۔ ثانیاً وہاں اولیار اللہ کے مزارات پر بھی حاضری دیتے تھے۔ اتفاق سے ان ایام میں حضرت حکیم رحیم اللہ صاحب تلمیذ حضرت نانوتویؒ نئے نئے فارغ التحصیل ہو کر تشریف لائے تھے۔ حضرت قاضی صاحب ان کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ ہمراہ مریدوں کا حلقہ تھا۔ کسی نے جہراً "اللہ" کہدیا۔ حکیم صاحب کو ناگوار ہوا۔ فرمایا

"دیکھئے قاضی صاحب! جہراً ذکر بدعت ہے اس کو بند کیجئے"

بس یہاں سے ہی گفتگو کا رُخ بدل گیا۔ حکیم صاحبؒ کو علم کا جوش تھا نیز زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جوش میں آکر حضرت قاضی صاحبؒ کے پیر مرشد حضرت

شیخ محمد صاحبؒ تھانوی پر اعتراض کس دیا۔
ہوا یہ تھا کہ حضرت شیخ محمد صاحب تھانویؒ نے ایک کتاب "القسطاس لموازنۃ اثر ابن عباس" لکھی تھی۔ اس کتاب میں اصالتہً تو "دافع الوسواس" از مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی کتاب کا رد تھا لیکن تبعاً حضرت نانوتویؒ کی کتاب "تحذیر الناس" کا بھی جائزہ لیا گیا تھا۔ بہرحال حضرت قاضی صاحب نے نہایت تحمل سے کام لیا اگرچہ غصہ کی وجہ سے مریدین کے چہرے سرخ تھے۔ قاضی صاحب نے اپنے مریدین کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا۔
ارے بھائیو! یہ عالم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی شان میں فرمایا ہے۔
"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" یعنی اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اس سے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ حضرت حکیم صاحب کی والدہ محترمہ حضرت قاضی صاحبؒ سے بیعت تھیں۔

غرضکہ حضرت قاضی صاحب جہاں بھی گئے وہاں عرصہ تک کے لئے آخرت کی مجلسیں قائم کر گئے۔ اس ضلع میں تہی پور۔ اومری وغیرہ ایسے دیہات ہیں جو علم اور علماء کی بستیاں ہیں۔ پورے ضلع کے دیہات اور قصبات آج بھی حضرت قاضی صاحب کی روحانیت کی شہادت دے رہے ہیں۔ جس جگہ حضرت قاضی صاحبؒ مقیم ہوگئے۔ آج تک اس جگہ کی جذبی کیفیت ختم نہ ہو سکی۔

پتہ دیتی ہے شوخی نقش پا کی
کوئی اس راہ سے ہو کر گیا ہے

روحانی کمالات | حضرت قاضی صاحبؒ اونچے درجہ کے اہل اللہ میں سے تھے۔ حد یہ ہے کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا نانوتوی صاحبؒ، حضرت قاضی صاحبؒ کے روحانی کمالات پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ جب دیانند سے

مناظرہ کرنے کے لئے رڑکی تشریف لے گئے تو منگلور ہو کر گئے۔ محتاط راویوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے حضرت قاضی صاحبؒ سے کہا تھا۔ حضرت! اگر مناظرہ میں یہ نوبت آجائے اور پنڈت دیانند یہ سوال کر بیٹھے کہ اس اُمت کے علما رگر بنی اسرائیل کے انبیار کے مثل ہیں۔ تو مُردہ زندہ کر کے دکھائیں۔ تو اس کے لئے آپ کو چلنا چاہیے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے فرمایا نہیں مولانا آپ سب کے قابل ہیں۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت قاضی صاحبؒ حضرت نانوتویؒ کے ہمراہ۔ تشریف لے گئے تھے یا نہیں۔ ہاں بلاشبہ وہ روایات جو مُردہ کے زندہ کرنے یا قاضی صاحبؒ کے پہونچنے سے قبل مُردہ کا حرکت میں آجانا وغیرہ بالکل غلط ہیں۔ حضرت قاضی صاحبؒ کے خلیفۂ خاص جناب ہدایت اللہ خاں صاحبؒ نے اس کی شدت کے ساتھ تردید کی تھی کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا

ایک مرتبہ حضرت قاضی صاحبؒ منڈاور میں حلقہ کرا رہے تھے۔ کہ اکبرآباد کے ایک صاحب آئے۔ حضرت قاضی صاحبؒ کے کسی مرید پر وجدی کیفیت طاری ہوئی اور وہ تڑپ کر ان اکبرآبادی صاحبؒ کے اوپر جا پڑا۔ جس سے ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ حضرت قاضی صاحبؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ٹوٹی جگہ ہاتھ پھیر دیا تو ہڈی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔

حضرت قاضی صاحبؒ ہر وقت مراقب رہتے تھے۔ ہر وقت محویت طاری رہتی تھی۔ نظر بہت کم اُٹھاتے تھے۔ جب اُٹھاتے تھے تو بجلی سی کوند جاتی تھی۔ حاضرین بے خود ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سیوہارہ کا ذکر ہے کہ حضرت قاضی صاحب مراقب ہوئے حلقہ کرا رہے تھے! ایک خاں صاحب جو استہزا کیا کرتے تھے آئے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ دروازے سے متصل حوض تھا۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے جو نظر اُٹھائی تو باہر کھڑا ہوا تمام مجمع چیخ مار کر حوض میں آپڑا۔ اور تائب ہو کر مرید ہو گیا۔

حضرت قاضی صاحبؒ کے احوال معلوم ہونے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ آپ پر

قادریت کا غلبہ تھا۔ اگرچہ قرائن تو اس بات کو چاہتے ہیں۔ کہ آپ پر چشتیت یا نقشبندیت کا غلبہ ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ آپ حضرت شیخ محمد تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت شیخ صاحبؒ خلیفہ ہیں حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے۔ اور وہاں چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور نقشبندیت بھی ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت قاضی صاحبؒ کے خلفاء خاص میں سے جناب ہدایت اللہ خاں صاحب کرتپوری (۲) ملّا جمال الدین صاحبؒ منڈاوری (۳) اور صاحبزادہ محترم حضرت مولانا قاضی عبدالغنی صاحبؒ منگلوری کے اسمائے گرامی معلوم ہو سکے ہیں۔

قاضی عبدالغنی صاحب منگلوریؒ حضرت قاضی عبدالغنی صاحبؒ آپ کے بڑے فرزند ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے متعلق ان کے خاندان کے کسی صاحب نے "رسالہ العلم کراچی" بابت جون ۱۹۶۴ء میں کچھ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس جگہ اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

قاضی عبدالغنی صاحبؒ سلسلہ قادریہ میں اپنے والد سے بیعت ہوئے۔ اور ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ گوشہ گیری اور ریاضت میں گزارا۔ سنا ہے کہ چلّہ کشی کے درمیان مہینوں کھانا نہیں کھایا۔ صرف چائے اور پانی پر بسر کی۔ اضلاع روہیل کھنڈ اور قسمت میرٹھ میں بہت سے لوگ ان کے مرید اور معتقد تھے۔ ان میں خواص بھی تھے اور عوام بھی، پرانی تہذیب کے لوگ بھی تھے اور نئی روشنی والے بھی۔ رؤسار اور سرکاری عہدیدار، اہل سیاست بھی تھے۔ اور حضرت اصغر گونڈوی اور جناب جگر مرادآبادی جیسے شعرار بھی۔ ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ وہ خوش رو تھے بعض لوگ کہتے تھے۔ کہ اُن کی آنکھوں میں موہنی تھی۔ اور یہ سوز کہ مرض کے درد کا اثر تھا۔ بڑا گول سر گھونگھر یالے بال۔ سر پر پٹھے۔ اور فراخ چہرہ۔ کشادہ متین پیشانی۔ اور اس کے متوازن مضبوط جبڑا۔ بھری ہوئی بلکہ گھنی خوش قطع داڑھی۔ میانہ قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ ململ کا

لانبا کرتہ، دوپلّی ٹوپی مغلئی پاجامہ۔ بڑے اولوالعزم اور دنیاوی معاملات میں بھی بے حد ہوشمند تھے۔

آپ کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی اور تیسری خاندان میں ہوئی جن سے کوئی اولاد حیات نہیں۔ دوسری شادی تھانہ بھون میں ایک بڑے زمیندار مولوی محمود الحسن صاحب کی دختر سے ہوئی۔ ان سے ایک صاحبزادے قاضی عبدالولی صاحب پیدا ہوئے۔ جو بقید حیات ہیں۔ حضرت قاضی عبدالغنی صاحب کا انتقال ۵۵ سال کی عمر میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۸ء مطابق ۲۷ رجب ۱۳۴۶ھ بروز جمعہ ہوا۔ احاطہ مسجد میں اپنے والد محترم کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

دو رند بادہ خوار حضوری میں جناب اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی حضرت قاضی صاحبؒ کے مرید تھے۔ اصغر صاحب نے حضرت قاضی صاحبؒ کی شان میں ایک شعر کہا ہے۔

اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہان بدل دیا آکے مری نگاہ میں

ان دونوں حضرات کا اپنے پیر و مرشد سے بے پناہ تعلق تھا۔ دیوانہ وار حاضر ہوتے تھے۔ اصغر صاحب کو مجلس میں حاضری کی اجازت تھی۔ لیکن جگر صاحب کو اجازت نہ تھی۔ ایک دن اصغر صاحب کی کوشش سے اجازت مل گئی۔ چند اشعار سنائے۔ قاضی صاحبؒ نے فرمایا۔ "تم شاعر بے شک ہو لیکن شعر جگر کہتا ہے تم نے اگر توجہ دی تو ایک دن اردو شاعری پر حکومت کرے گا۔

جگر صاحب ہی کی روایت ہے۔ کہ حضرت قاضی صاحبؒ رڑکی میں مقیم تھے۔ میں حاضری کے لئے رڑکی آیا۔ ابھی تانگے سے اترا بھی نہ تھا۔ کہ خادم نے آکر کہا۔ حضور فرماتے ہیں۔ اسی تانگے سے واپس جاؤ۔ لکسر گاڑی مل جائے گی۔ میں پریشان واپس ہوا۔

مگر وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ جب لکسر پہونچا تو وہی گاڑی موجود تھی۔ جب ڈبہ میں داخل ہوا تو میں نے اپنے دیوان کا مسودہ پڑا ہوا پایا۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ مرشد نے کیوں واپس کیا تھا۔ اگلی مرتبہ جب حاضر ہوا تو فرمایا۔

• سفر کرتے وقت اپنے سامان سے لاپرواہی نہ برتنی چاہیئے۔

اللہ اکبر کیسے لوگ تھے۔ رہتی دنیا ان حضرات کی یاد تازہ رہے گی۔ جب تک اس قسم کے لوگ اس زمین پر رہے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش رہی۔ اور اب بھی جہاں جہاں ہیں نزول رحمت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے لوگوں کے بارے میں درست فرمایا ہے:۔ ؎

قم باذن اللہ کہہ سکتے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

ولایت اور قطبیت میراث میں تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ مراتب تو منجانب اللہ ان ہی کو ملتے ہیں، جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔ ڈاکو اور لٹیروں کے گھر میں ولی ہو جائیں۔ اور سانبیار کے گھر میں بد اطوار اور بدکردار پیدا ہو جائیں شیخ سعدیؒ نے بہت خوب کہا ہے۔ ؎

پسر نوحؑ با بداں بنشست
خاندان نبوتش گم شد

نوٹ:۔ ابھی قاضی محمد اسماعیل صاحبؒ کے متعلق بہت کم حالات دریافت ہوئے ہیں۔ جن حضرات کو کسی ذریعہ سے ممدوح کے بارے میں اور کچھ معلوم ہو ارسال فرمائیں تاکہ "تذکرہ مشائخ دیوبند" میں اضافہ کے ساتھ شائع ہو جائیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ

۱۲۳۳ھ لغایت ۱۳۱۷ھ

وطن مالوف چونکہ ہمیں تھانہ بھون کے چند مشائخ کا تذکرہ کرنا ہے۔اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے۔کہ قصبہ تھانہ بھون کا تعارف کرادیا جائے۔

تھانہ بھون ایک قصبہ ہے جو ضلع مظفر نگر میں واقع ہے۔اس کا اصل نام تھانہ بھیم تھا۔کیونکہ وہ کسی زمانہ میں راجہ بھیم کا تھانہ تھا۔کثرتِ استعمال سے تھانہ بھون ہوگیا۔ جب یہاں مسلمان آکر آباد ہوئے تو شرفائے قصبہ کے بعض اجدادنے اپنے ایک فرزند "فتح محمد" کے نام پر اس کا نام محمد پور رکھا جو کاغذات شاہی میں کبھی پایا جاتا ہے۔لیکن عام طور پر پرانا نام یعنی تھانہ بھون ہی مشہور رہا۔غدر سے بہت پہلے اس قصبہ کی آبادی اڑتالیس ہزار تھی۔پھر غدر کے قریب چھتیس ہزار کی رہ گئی۔اور اب تو صرف چھ سات ہزار ہی کی ہے۔محرم ۱۲۷۴ھ میں یہاں غدر کا اثر پہونچا تھا۔جس کا حضرت مولانا تھانویؒ نے مادہ تاریخ یہ نکالا ہے "خرابی تھانہ"

یہ قصبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا ایک مشہور و معروف مردم خیز تاریخی قصبہ ہے۔ جہاں مسلمان شرفاء بالخصوص شیوخ فاروقی النسل صاحبِ اقتدار اور صاحب قوت و شوکت اور صاحب جائداد رہتے تھے۔اگرچہ اب افلاس غالب ہے۔لیکن ذی اقتدار ہستیاں بفضلہ تعالیٰ اب بھی موجود ہیں۔مختلف فنون کے اہلِ کمال بھی گذرے ہیں۔جن کے کارناموں کے افسانے کتابوں میں اور زبانوں پر اب تک ہیں۔

زمانہ شاہی میں بڑے بڑے منصب دار اور جاگیر دار بھی تھے۔یہاں کے عقلا خاص طور سے مشہور رہے ہیں۔چنانچہ ایک انگریز نے جو افسر بندوبست تھا اپنی رپورٹ میں

مختلف قصبات کے باشندگان کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے تھانہ بھون کے باشندوں کو عاقلان تھانہ کا لقب دیا تھا۔ مجھے جہاں تک علم ہے۔ اس گرد و نواح میں مسلمان شرفاء کے بڑے بڑے قصبہ ہیں۔ مثلاً دیوبند، گنگوہ، کیرانہ، جھنجھانہ، کاندھلہ اور پانی پت وغیرہ۔ ایسے قصبات ہندوستان میں اور کہیں نہیں۔ اور جتنی دینداری اور رجحان دین کا چرچا ان اطراف میں ہے۔ اتنا اور کہیں نہیں۔ اور جس کثرت سے بڑے بڑے علماء، فضلاء و مشائخ اس حصے میں گذرے ہیں اور کہیں نہیں[1] حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"یہ علاقہ (دیوبند، سہارنپور اور مظفر نگر وغیرہ) دوآبہ کا علاقہ ہے۔ ولی خیز ہے[2]"

غرضکہ اس علاقہ کو دینی اور تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں اس علاقہ کا خاص مقام ہے جس کو ہم انشاء اللہ بالتفصیل بیان کرینگے۔ (باللہ التوفیق)

ولادت | تذکرۃ الرشید کی ایک روایت کے مطابق آپ کی پیدائش ۱۲۳۰ھ یا ۱۲۳۱ھ کی ہے۔ اور دوسری روایت کی بناء پر ۱۲۳۲ھ کی ہے۔ ۱۲۳۱ھ تاریخ ولادت زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ ۱۲ یا ۱۳ رجمادی الآخر ۱۳۱۷ھ کو آپ کا وصال ۸۴ سال تین مہینے بیس یوم کی عمر میں ہوا۔ اور اس حساب سے ۱۲۳۱ھ کو ترجیح دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت حاجی صاحب کا ۱۲۳۱ھ سن ولادت اس وجہ سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یا ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو معرکہ بالاکوٹ کا واقعہ ہوا ہے جس میں بڑے بڑے باخدا اور اولیاء اللہ کی شہادت واقع ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے

---

[1] اشرف السوانح ص ۱۵ ج ۱ [2] انفاس قدسیہ ص ۲۹

مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ سی گئی تھی۔ اور ان کی عظمت و شوکت کو بڑا دھکا پہونچا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؒ سن بلوغت کو پہونچ چکے تھے۔ گویا اس وقت آپ کی عمر شریف پندرہ یا سولہ سال کی ہوگی۔ کہ آپ نے طاغوتی طاقتوں کے ظلم و ستم اور شہدار دین و وطن کی لاشوں کو بے گور و کفن دیکھا ہوگا۔ یا اس سے کم از کم بالتفصیل باخبر ہوں گے۔ یہی ایک سوز نہانی اور غم جاودانی تھا کہ جس نے آپ کو شاملی کے میدان میں شمشیر بکف ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور آپ نے جان کی بازی لگا کر شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ انشاء اللہ العزیز اس سلسلہ میں ہم ذرا تفصیل سے آئندہ صفحات میں کچھ بیان کریں گے۔

شرافت نسبی آپ تھانہ بھون کے مشائخ فاروقی میں سے ہیں۔ نانوتہ میں شیوخ صدیقی میں آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہوئی تھی۔ اس طرح حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے بھی نسبی تعلقات تھے۔ شیوخ تھانہ بھون کے سلسلہ میں ہم حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے تذکرہ میں قدرے تفصیل سے کچھ عرض کریں گے۔ وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

تعلیم و تربیت یہ تو واضح ہو چکا ہے۔ کہ تھانہ بھون میں ہر زمانہ میں تمام فنون کے ماہرین رہتے چلے آئے ہیں۔ اور خصوصاً حاملین علم نبوت، لہٰذا اس سرزمین میں پیدا ہونا ہی اس کی طرف مشیر ہے۔ کہ آپ نے ان گودوں میں پرورش پائی ہے جو علم و عمل کے گہوارہ تھے۔

اولاً آپ نے کلام اللہ شریف حفظ کیا اور بعد فراغت حفظ علوم مروجہ فارسی اور عربی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدائی کتابیں کس سے پڑھیں۔؟ اس سلسلہ میں صحیح روایات کالعدم ہیں۔ البتہ مثنوی شریف آپ نے جناب منشی عبدالرزاق صاحب جھنجھانویؒ سے پڑھی تھی۔ منشی صاحب مثنوی کے دفتر ہفتم کے مصنف حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب جھنجھانویؒ

کے صاحبزادے کے شاگرد تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ خود اپنی تعلیم کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"بھائی ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے۔ اور حصن حصین مولوی قلندر صاحبؒ سے پڑھی۔ بعد میں شوق درود و وظائف کا ہوا۔"[1]

اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فارسی میں تو کافی مہارت حاصل کرلی تھی لیکن عربی نہیں پڑھی تھی۔ حصن حصین کا پڑھنا بطور درود و وظائف تھا۔ لیکن اسی کتاب میں دوسری جگہ مرقوم ہے۔

"توحید کے بیان میں حضرت اقدسؒ کی زبان مبارک سے بشرطِ شے اور بشرط لاشے یہ الفاظ نکلے۔ مولوی صاحب نے تعجباً مجھ سے کہا کہ حاجی صاحبؒ تو فرماتے ہیں کہ میں نے کتب درسیہ سے محض مختصرات پڑھی ہیں۔"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں غالباً متون کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ اور مرقوم ہے۔

"میرے والد صاحب قبلہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ حضرت قبلہ عموی حاجی محمد امداد اللہ صاحبؒ نے علم عربی کم پڑھا ہے۔ ایک بار حضرت موصوف نے حجام کو کاندھلہ اپنے ماموں کے پاس واسطے منگانے کسی بڑی کتاب حدیث کے بھیجا۔ اس کے جواب میں حضرت کے ماموں صاحب نے فرمایا۔ کہ کیا میاں امداد اللہ اس کتاب کی زیارت کیا کریں گے یا کسی سے پڑھوا کر سنیں گے۔"

بہرحال علم عربی بظاہر بہت زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ لیکن قرآن و حدیث کے معنی اور مطالب خوب سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایسا فیضان تھا۔ کہ تقریر و

---

[1] ضمیمہ کرامات امدادیہ ص۳ [2] کرامات امدادیہ ص۱۲

تحریر سے علم کے بحرِ ذخار معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ واقعہ مذکورہ بالا کی بقیہ سطور ملاحظہ فرمائیے۔

"حجام نے واپسی میں عرض کیا۔ حضرت! انھوں نے ایسا فرمایا ہے کہ میری مجال نہیں کہ عرض کروں۔ حضرت نے باصرار لفظ بہ لفظ سُنا۔ فرمایا کہ اسی وقت کاغذ واپس چلا جا۔ اور میرا خط ماموں صاحب کی خدمت میں پیش کر کے عرض کر کہ جو حدیث مشکل ہو وہ آپ تشریف لا کر دریافت فرمالیں، خدا کے حکم سے جواب دوں گا۔ سُنا گیا ہے کہ وہ بزرگ تشریف لائے اور مشکل مشکل احادیث دریافت کیں۔ بحکم خدا سے جواب درست پایا۔"[1]

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت حاجی صاحبؒ کے علم کے متعلق ذرا تفصیلی تذکرہ کریں۔

تبحر فی العلم | حضرت حاجی صاحبؒ، صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ آپ کے مکاتیب اور مختلف موضوعات اور مسائل پر ابحاث آپ کے تبحر فی العلم کی روشن دلیلیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ .... ارشاد فرماتے ہیں۔

"حضرت حاجی صاحبؒ کا کوئی تقویٰ کی وجہ سے معتقد ہے، کوئی کرامت کی وجہ سے، میں حضرتؒ کے علم کی وجہ سے معتقد ہوں۔"[2]

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:۔

"مجھ سے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس کیا ہے۔ جو علماء کے پاس نہیں کہ وہاں جاتے ہیں۔ میں نے کہا ہمارے پاس الفاظ ہیں اور وہاں معانی ہیں"[3]

حضرت مولانا نانوتوی صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

اوراق سیاہ مسودہ مذکورہ کو پیش کر کے رسم پیشکش بجالایا۔ مگر شکر عنایات

---

[1] ضمیمہ کرامات امدادیہ صا۲ [2] قصص الاکابر ص۶۲ [3] ایضاً ص۲۵

کس زبان سے کہیئے کہ اس ہدیہ مختصرہ کو قبول فرما کر صلہ وانعام میں دعائیں دیں ۔
علاوہ ازیں تصحیح وبجا فی اور تحسین زبانی سے اس ہیچمدان کی اطمینان فرمائی، اپنی
کم مائیگی اور ہیچمدانی کے سبب جو تحریر مذکور کی صحت میں تردد تھا رفع ہوگیا۔[1]

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے آب حیات کے مسودہ کو حاجی صاحبؒ کی خدمت میں مکہ معظمہ جا کر پیش کیا تھا۔ آب حیات اور اسی طرح سے حضرت نانوتوی صاحبؒ کی دوسری تصانیف جتنی مشکل ہیں وہ علماء پر ظاہر ہے کہ معمولی استعداد کے مولوی صاحبان اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن حاجی صاحبؒ کا اس طرح تصحیح فرمانا۔ کہ ازالہ شک ہوجائے ۔ علاوہ کرامت ہونے کے ساتھ ہی حاجی صاحبؒ کے علمی مذاق کی روشن دلیل ہے۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"چونکہ بنائے دین اسلام احادیث پر ہے اور یہ لوگ سوائے صحاح ستہ کے اور حدیث کی کتابوں سے ناواقف ہیں۔ اور جس سے واقف بھی ہیں۔ تو اس کی اکثر احادیث کو ضعیف اور موضوع کہتے ہیں۔ اور اس کے عامل کو ضال اور مضل بتلاتے ہیں تو اس ابہام بیجا اور جہل سے جزو دین میں خرابی واقع ہوتی ہے"[2]

دربیان وحدۃ الوجود ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اول کسیکہ دریں مسئلہ خوض فرمود شیخ محی الدین ابن عربی است (قدس اللہ سرہٗ) اجتہاد او دریں مسئلہ واثبات آں ببراہین واضحہ بر گردن جمیع موحداں تا قیام قیامت نہاد۔ لطف اینجاست کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس اللہ سرہٗ ہم عصر وہم بلاد او بود مرداں حال شیخ اکبر از وے پرسیدند گفت زندیق است مرداں از صحبت او احتراز می کردند۔ چوں وفات یافت از شیخ الشیوخ حال آخرت او پرسیدند۔ فرمود مات قطب الوقت من کان ولی اللہ ہمہ مرداں تعجب کردند و

---

[1] آب حیات ص۷۲ ۔ [2] مکتوب ۵ از مکتوبات امدادیہ ۔

و بر سید ندیرا اورا زندیق گفتی و ما را از استفادہ محروم داشتی۔ گفت او ولی واصل بحق بود اما جذبہ قوی داشت۔ سرچند مقرب بارگاہ بود قابل اتباع نبود۔ در زمان آخر مجذوب شدہ بود۔

اس جگہ اس مسئلہ میں حضرت حاجی صاحبؒ کے پورے رسالے کو نقل کرنا مناسب نہیں ہے اسی وجہ سے ابتدائی چند جملوں کو نقل کر دیا ہے۔ کہ اصحاب علم وفضل حضرت حاجی صاحبؒ کے علمی مقام کو دریافت کر سکتے ہیں۔ ضیاء القلوب، تصفیۃ القلوب، غذائے رُوح، گلزار معرفت، تحفۃ العشاق، جہاد اکبر، ارشاد مرشد، و دردنامہ غمناک آپ کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔

سلوک وتصوّف | مذکورہ بالا سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے حصن حصین مولوی قلندر صاحبؒ سے وظائف کے شوق میں پڑھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کی طبیعت شروع ہی سے تصوف کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ آپ سب سے پہلے طریقہ نقشبندیہ میں حضرت شاہ نصیر الدین صاحب دہلویؒ سے بیعت ہوئے۔ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں:۔

ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلویؒ خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحبؒ سے ہوئی۔ اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں۔ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے۔ اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب دُور کھڑا ہوں۔ حضرت سید صاحبؒ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیدیا[1]۔

---

[1] کرامات امدادیہ صفحہ ۳۱

شاہ نصیر الدین صاحب دہلویؒ کے وصال کے بعد آپ حضرت میاں جیو صاحب جھنجھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ چنانچہ حضرت شیخ محمد صاحب تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"در قصبہ لوہاری بتعلیم اطفال اشتغال نمودند بطوریکہ کسے را بر حال ایشاں اطلاع نمی بود مگر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب باعث اشتہار ایشاں شدند۔ آن این ست چوں شورش طلب مولیٰ در سینہ حاجی امداد اللہ صاحب جوش زد و بارادت با درویشاں در آوردند شبے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ ارادت آوردن بایشاں کردند۔ حاجی صاحب بہ دریافت مقام ایشاں مترود و متحیر بودند روزے بوساطت شخصے سر ارادت بآستانہ ایشاں نہادند بمجرد مشرف شدن بشمائل شریف ایشاں دریافتند کہ آں اشارۂ سراج منیری صلی اللہ علیہ وسلم دہ بنظیر ایشاں بود سر نیاز بر زمین نہادند و دست خود در دست حق پرست پیر دستگیر دادند خود را چوں مُردہ بدست غسّال سپردند خط بندگی بر جبیں نوشتہ پیش کش کردند و اتباع امر ایشاں بر خود لازم و واجب دانستند چوں کہ ہمت در طلب حق چست بستند و شیخ موصوف ایشاں با ستعداد و

"میاں نور محمد قصبہ لوہاری میں بچوں کی تعلیم میں اس طرح مشغول رہتے تھے کہ کسی کو ان کی حالت کی خبر نہ تھی۔ مگر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ان کی شہرت کا باعث اس طرح بنے کہ جب ان کے سینہ میں طلب مولیٰ کا جوش پیدا ہوا۔ تو درویشوں کے ساتھ ارادت وعقیدت ظاہر ہوئی چنانچہ ایک رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت نور محمد صاحبؒ کی ارادت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ میاں جیو صاحب کا مقام و پتہ دریافت کرنے کی خاطر بہت پریشان وحیران ہوئے۔ اتفاق سے ایک شخص کے ذریعے سے آستانۂ نور محمدی (لوہاری) حاضر ہوئے اور تمام وہی اوصاف پائے جس کی طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ سر نیاز میاں جیو صاحبؒ کے آستانہ پر رکھ دیا۔ اور اپنے ہاتھ کو ان کے دستِ حق پرست میں اس طرح دے دیا۔ جیسا کہ مُردہ بدست غسال ہوتا ہے اور خط غلامی پیشانی پر کھینچا۔ اور ہر امر کی اتباع

کامل وطلب صادق یافتند بعد تعلیم ظاہر وباطن	اپنے اوپر لازم کرلی۔ جب حضرت میانجیو صاحب رح
آگاہی یادداشت آگاہ کردند بکلمات الحق	نے استعداد کامل اور طلب صادق پائی، اور تعلیم
ارشاد کردند و نائب مطلق خود نمودہ اجازت	ظاہر وباطن پر آگاہ ہوئے تو کلمات حق فرمائے
بتلقین راہ دادند آمد [1]	اور اپنا نائب بنایا اور تلقین وارشاد کی اجازت
	دی یعنی اپنا خلیفہ بنالیا۔

* * * * * * *

اس واقعہ کو مصنف شمائم امدادیہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"آخر شیخ العرب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی رح ایک عجیب طریقہ سے آپ کے مرید ہوئے اور آپ کے جلووں کو عام کرنے کا باعث بنے۔ حضرت حاجی صاحب رح نے مطالعہ مثنوی مولانا روم کو بطور ورد کے معمول بنالیا تھا۔ خاطر اقدس کو ایک حرکت بلیغ پیدا ہوتی تھی اور جوش وخروش باطنی چہرہ انور سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور داعیہ سلوک سینہ صفت گنجینہ میں اضطراب ڈالتا تھا۔ ایک دن آپ نے خواب دیکھا کہ مجلس اعلیٰ حضور اقدس سرور دو عالم مرشد اتم صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوں۔ غایت رعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے۔ ناگاہ میرے جد امجد حضرت شاہ بلاقی صاحب تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہونچا دیا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لیکر حضرت میانجیو نور محمد صاحب علوی جھنجھانوی چشتی کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت بعالم ظاہری حضرت میانجیو صاحب سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا۔ بیان فرماتے ہیں۔ کہ جب میں بیدار ہوا تو عجیب انتشار اور حیرت میں مبتلا ہوا کہ یارب یہ کون صاحب بزرگوار ہیں۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھ کو خود ان کے سپرد فرما دیا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے کہ ایک دن

---

[1] نور محمدی ص ۱۳

استاذی حضرت مولانا قلندر شاہ صاحبؒ محدث جلال آبادی نے میرے اضطراب کو دیکھ کر بکمال شفقت فرمایا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے۔ وہاں چلے جاؤ اور حضرت میانجیؒ سے ملاقات کرو۔ شاید مقصد اصلی کو پہونچو۔ اور بیعس بیعس سے نجات پاؤ۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ جس وقت میں نے حضرت مولانا سے یہ سُنا متفکر ہوا۔ اور دل میں سوچنے لگا کہ آخر کیا کروں۔ فوراً سفر لوہاری اختیار کیا۔ شدت گرمی و سفر سے حیران و پریشان چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ بارے بکشش و کوشش آستانہ شریف پر حاضر ہوا۔ اور جیسے ہی دور سے جمال باکمال جناب والا ملاحظہ کیا، صورت انور کو کہ خواب میں دیکھا تھا بخوبی پہچانا۔ اور محو خود رفتگی ہو گیا۔ اور آپے سے گذر گیا۔ اور افتاں و خیزاں ان کے حضور میں پہونچکر قدموں میں گر پڑا۔ حضرت میانجیو رحمۃ اللہ علیہ نے میرے سر کو اُٹھایا۔ اور اپنے سینہ نور گنجینہ سے لگایا۔ اور بکمال عنایت و رحمت فرمایا۔ کہ تم کو اپنے خواب پر کامل وثوق ہے۔ یہ پہلی کرامت منجملہ کرامات حضرت میانجیوؒ کے ظاہر ہوئی اور دل کو بکمال استحکام مائل بخود کیا۔ الحاصل ایک مدت تک خدمت با برکت حضرت میانجیو نور محمد صاحبؒ میں حلقہ نشین رہا اور تکمیل سلوک طریق اربعہ عموماً اور طریق چشتیہ صابریہ خصوصاً کیا۔ اور حضرتؒ سے خرقہ خلافت نامہ اور اجازت خاصہ و عامہ سے مشرف ہوا۔ اور بعد عطائے خلافت حضرت میاں جیو صاحب نے فرمایا۔ کیا چاہتے ہو؟ تسخیر یا کیمیا، جس کی رغبت ہو تم کو بخشوں، میں یہ سنکر رونے لگا۔ اور عرض کیا کہ دُنیا کے واسطے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے خدا کو چاہتا ہوں، وہی مجھ کو بس ہے۔ حضرت میاں جیو صاحبؒ یہ سنکر بہت مسرور ہوئے۔ اور مجھ کو بغلگیر فرما کر علوئے ہمت پر آفریں کی۔ اور دعا ہائے

جزیلہ وجمیلہ دیں ا ھو (نور محمدی ۳۴ تا ۵۱ وشمائم امدادیہ ص۱۳ تا ۱۵)

اول تو آپ خلقۃً نحیف الجثہ تھے مزید برآں یہ کہ مجاہدات جلیلہ وریاضات شاقہ کی وجہ سے جسم پر گوشت برائے نام ہی تھا۔ مثل مشہور ہے کہ چمڑہ ہڈیوں سے چمٹ گیا تھا۔

نکاح حضرت حاجی صاحبؒ کے تین نکاح ہوئے۔ اس کی تفصیل ہم حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔

"حضرت حاجی صاحبؒ کے تین نکاح ہوئے۔ اول تو جناب بی بی خدیجہ صاحبہ سے۔ یہ بی بی مکہ معظمہ رہتی تھیں۔ حضرت کو جب خانگی خدمت کی حاجت ہوئی تو ان سے نکاح کیا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا۔ تو خدام نے عرض کیا۔ حضرت! دوسرا نکاح کر لیجئے۔ تاکہ راحت ہو۔ تو حضرتؒ نے فرمایا۔ کہ تھانہ بھون میں بی بی خیر النساء ہیں۔ اگر وہ منظور کرلیں تو مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے یہ بی بی مکہ معظمہ تشریف لے گئیں۔ اور حضرتؒ کا ان سے عقد ہوگیا۔ حضرت حاجی صاحب ہجرت سے پہلے جب تھانہ بھون میں تشریف رکھتے تھے تو ان ہی بی بی سے حضرت کا خطبہ ہوا تھا۔ مگر حضرتؒ نے نکاح سے انکار فرمایا تھا اس لئے نکاح نہ ہو سکا، پھر ان بی بی کا نکاح ایک اور صاحب سے ہوگیا۔ جن کا کچھ مدت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اور یہ بیوہ ہوگئیں۔ پھر حضرتؒ سے بطریق مذکور نکاح ہوا۔ یہ بی بی مثنوی کی عالمہ تھیں۔ انھوں نے کبھی مولانا عبدالرزاق صاحب ہی سے مثنوی پڑھی تھی بہت بڑی عابدہ اور صاحب اوقات تھیں۔ جب میں مکہ معظمہ ۶ ماہ رہا۔ تو بڑے گھر میں سے میرے ہمراہ تھیں۔ یہ بی بی اس وقت حیات تھیں۔ بڑے گھر میں سے اکثر ان کی خدمت میں جایا کرتی تھیں۔ وہ بھی بیحد محبت فرماتی تھیں۔ بڑے گھر میں سے کہتی تھیں۔ کہ حضرت حاجی صاحبؒ میں اور ان بی بی

میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ مرد ہیں۔ اور یہ عورت ورنہ جو کمالات حضرت حاجی صاحب میں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ بی بی حضرتؒ کی اتنی خدمت گذار تھیں کہ باوجود اس کے کہ ان کے اعضاء اور بینائی نے جواب دیدیا تھا مگر جب حضرت حاجی صاحبؒ کی آمد کی آہٹ پاتیں تو ٹٹولتی ٹٹولتی نیچے زینہ پر جاتیں اور حضرتؒ کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لاتیں۔ حضرتؒ بالاخانہ پر رہا کرتے تھے۔ ان کی حیات ہی میں ایک بی بی قصبہ رامپور کے مکان میں رہتی تھیں۔ جو حضرت سے بیعت بھی تھیں۔ اور خانگی کاروبار بھی کیا کرتی تھیں۔ حضرت مکان تشریف لاتے تو یہ بی بی حضرت کا ہاتھ پکڑ کر لانا چاہتیں تو حضرت فرماتے "نہیں، ہیں" کیا کرتی ہو' نامحرم کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے۔ انھوں نے ہمت کر کے عرض کیا کہ حضرت کو تو خدمت کی حاجت ہے اور مجھ سے ہے اجنبیت جس کی وجہ سے بے تکلف خدمت نہیں لے سکتے تو پھر مجھ سے نکاح کر لیجئے۔ تاکہ ہر طرح کی خدمت بے تکلف لے سکیں۔ تو حضرت نے تیسرا نکاح ان بی بی سے کیا۔ ان کا نام امۃ اللہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت کا نکاح تین بیبیوں سے ہوا۔ بی بی خدیجہ، بی بی خیر النسار، بی بی امۃ اللہ۔ پہلی بی بی کا حضرت کے سامنے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اور یہ دونوں حضرتؒ کے بعد زندہ رہیں۔ اھ

(سراج الصراط۔ از رسالہ "الاشرف" ص۱۱-۱۲)

ذریعہ معاش اگرچہ آپ صاحب جائداد تھے لیکن پہلا حج کرنے کے بعد آپ نے اپنی تمام جائداد اپنے چھوٹے بھائی کو ہبہ کر دی تھی۔ اور دنیا کے تمام خرخشوں سے آزاد ہو کر ایک حجرہ میں یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے اپنی اور تمام مہمانوں کی خاطر و تواضع محض توکل پر فرماتے تھے۔ آخر میں جب آپ

کے یہاں مہمانوں کی آمدورفت زیادہ ہونے لگی۔ تو آپ کی بھاوج نے باصرار آپ سے یہ اجازت حاصل کرلی تھی۔ کہ جب کہ آپ اپنا سب کچھ ہمیں عنایت فرما چکے ہیں، اب ہمیں موقعہ عنایت فرمائیے کہ ہم آپ کی اور آپ کے مہمانوں کی خدمت بجالائیں حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کو منظور فرما لیا تھا۔ آپ کی پہلی اہلیہ محترمہ بی بی خدیجہؒ کا انتقال ہوچکا تھا۔ آپ یا آپ کے مہمان بس یہی دو خرچ تھے۔ سنو بھائی صاحب کے یہاں سے یہ خرچ پورا ہوتا رہتا تھا۔ باقی تمام دار و مدار توکل پر تھا۔ اللہ تعالےٰ نے بھی فتوحات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چنانچہ قیام مکہ معظمہ میں اوّل کچھ دنوں تک ذرا تنگی رہی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ آپ کی فتوحات کا اوسط ماہانہ کم از کم سو روپیہ ضرور ہوتا تھا۔

معرکۂ بالاکوٹ کے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء اور شاملی کا میدانِ جہاد

۱۲ مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کا تباہ کن اور لرزہ خیز واقعہ ہوا کہ جس میں ہزاروں نفوس قدسیہ جام شہادت نوش فرما چکے تھے۔ اور بقول حضرت شیخ الاسلامؒ ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ اس کے مخلص رہنماؤں سے غدار وطن سکھوں نے سفاکی کا برتاؤ کیا۔ اور نمک حرام کمپنی کا ساتھ دے کر آزادیٔ وطن کی راہ میں روڑے کا کام کیا۔ اس واقعہ سے ٹھیک ۲۶ سال بعد آزادیٔ وطن کی دوسری تحریک شروع ہوئی۔ جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے مذموم و بے ہودہ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۲۶ سالہ مدت کوئی زیادہ نہیں ہوتی اور نہ اتنی مدت میں واقعات و حالات بھلائے جاتے ہیں۔ اور خصوصاً ایسے واقعات جو انقلاب عظیم کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مسلم رہنماؤں کے قلوب میں معرکۂ بالاکوٹ ناسور بن کر رِس رہا تھا۔ اور درد کی ٹیسیں پیدا کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں خاندانِ مغلیہ کے آخری چشم و چراغ شہنشاہ

عادل بہادر شاہ ظفر کی جانب سے ایک مرتبہ اور قسمت آزمائی کرنے اور بزدل وسفاک انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاہی اعلان ہندوستان کے ہر باشندے اور ہر طبقہ کے لئے جاری کیا گیا۔

شاہی اعلان یہ اعلان متعدد دفعات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہم صرف دفعہ ۵ کو اپنی کتاب کی مناسبت سے نقل کرتے ہیں۔ دفعہ ۵ یہ ہے۔

چونکہ اہلِ یورپ ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے دشمن ہیں۔ اور اس وقت انگریزوں کے خلاف مذہب کی بنا پر جنگ جاری ہے۔ اس لئے پنڈتوں اور فقرا پر لازم ہے کہ وہ مابدولت کے حضور اپنے آپ کو پیش کریں۔ اور مقدس جنگ میں حصہ لیں۔ کیونکہ پنڈت اور فقرا ہندو دھرم اور اسلام کے محافظ ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو وہ شریعت اور شاستر کی رو سے گنہگار ہوں گے۔ اگر وہ مابدولت کے حضور پیش ہو جائیں تو وہ بادشاہی حکومت کے قیام پر معافی آراضی پانے کے مستحق ہوں گے۔[1] (مدینہ بجنور ۲۸ مئی ۱۹۵۷ء)

اسی اعلان میں ایک دفعہ زمینداروں کے نام بھی ہے۔ غرضیکہ یہ شاہی اعلان ہندوستان کے تمام باشندوں کے نام جاری کیا گیا۔ اور گھر گھر میں اس اعلان کو پہونچایا گیا۔ اسی زمانہ میں پر اسرار چپاتیوں کی ایک تحریک شروع ہوئی تھی۔ جس کے ذریعہ ہر ہندوستانی کو وقتِ مقررہ پر تیار

[1] مدینہ بجنور ۲۸ مئی ۱۹۵۷ء اس فرمان شاہی میں انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہبی جنگ قرار دیا ہے۔ اگر اس انقلاب میں کامیابی ہو جاتی تو اس کا حاکمِ اعلیٰ بہادر شاہ ظفر ہوتے۔ بہادر شاہ وعدہ کے مطابق ہندوؤں کو شاستروں کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیتے۔ (جیسے کہ اسلامی حکومت میں ہوا ہے۔ اور مسلم بادشاہوں کے زمانے میں تھا)

رہنے کے لئے آمادہ کیا گیا۔ (دیکھو مدینہ بجنور جون ۱۹۵۶ء)

غرضکہ ہر جگہ آزادی وطن کے لئے نہایت زور وشور سے تحریک شروع ہوئی۔ رجواڑے اور زمیندار اور سپاہی بادشاہ سلامت کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہونے شروع ہوگئے۔ نوابوں اور رجواڑوں نے اسباب حرب کے ذریعے امداد شروع کردی تھی۔

مشائخ دیوبند میدانِ جہاد میں

حضرت شیخ الاسلامؒ "نقشِ حیات" جلد ثانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

" جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف وجوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش وخروش میں نئی حرکت پیدا ہوئی ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے وہ انگریزوں کے افعالِ ماضیہ واحوالِ حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحبؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز زیادہ پیش پیش تھے (حضرت حافظ صاحب قطب العالم میانجی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے اوّلین اور اعلیٰ ترین خلفاء میں سے تھے۔ نسبت روحانیہ نہایت قوی اور بے مثل پائی تھی۔ میانجی صاحب مرحوم کی وفات کے وقت تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تکمیل سلوک وتصوف پوری نہیں ہوئی تھی) تو حاجی امداد اللہ صاحبؒ تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہمنوا تو ضرور رہے۔ مگر پیش پیش اور اس قدر زیادہ جوش میں نہ تھے۔ اسی قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ چونکہ تینوں حضرات پیر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے دریوزہ گر تھے۔ اس لئے آپس میں میل جول اتفاق واتحاد

بڑے پیمانہ پر رہتا تھا۔ مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب ظاہرہ پڑھ چکے تھے۔ بخلاف حضرت حافظ صاحب شہید اور حاجی صاحبؒ کے دونوں حضرات نے علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی۔ اگرچہ نسبت باطنیہ میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوا لیا۔ یہ دونوں حضرات اس سے پہلے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور دیگر اساتذہ دہلی سے سند فراغت علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر چکے تھے۔ اور اپنی ذکاوت و مہارت میں پوری شہرت حاصل کر کے سلوک و طریقت کے منازل بھی طے کر چکے تھے۔ جب ہر دو حضرات پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (کیونکہ وہ چچا پیر تھے) کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتویؒ نے عرض کیا اتنا بھی سامان نہیں کہ جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن صاحب نے فرمایا کہ مولانا! بس میں سمجھ گیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع کردی۔ اور

اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا۔ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ و میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم و تصوف اور تشرع کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔ ان حضرات کے اخلاص و للّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ ان کی دینداری اور خدا ترسی دیکھتے رہتے تھے۔ اس لئے اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس لئے بہت ہی تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار رہتے تھے۔ جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ مگر یہ ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں۔ کارتوسی رائفلیں نہ تھیں یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔[1]

خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لا رہی ہے

---

[1] حضرت شیخ الاسلامؒ کی اس تصریح سے واضح ہے کہ مشائخ دیوبند اور اکابر ہند کی سیاسی جد و جہد تمام تر جدوجہد ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام اور نظام اسلامی کے بپا کرنے کے لئے تھی۔ ان حضرات کو جس قدر بھی موقع ملتا تھا اس مقصد سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور چونکہ انگریزوں نے ان کی حکومت غصب کی تھی وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ اس لئے آزادیٔ وطن کا نعرہ، ان کے خلاف اور اپنی حکومت کے قیام کے لئے تھا یہ غلط ہے کہ مسلمان سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے۔ مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ جب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی صاحبؒ نے افسر مقرر کردیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لیکر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے توپخانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

غالباً اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کرلیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوجی وہاں تھی مغلوب ہوگئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہوگئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کا شہید ہونا تھا۔ کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی شہادت کے پہلے روز خبر آئی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا

قبضہ ہوگیا۔ اور یہی حال ہر جگہ کی خبر کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوج
چھپتے پھرتے تھے۔ اور ایک ایک ہندوستانی سپاہی گوروں کی پوری
جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا۔ مگر بعد میں معاملہ بالکل برعکس ہوگیا۔[1]

تھانہ بھون پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ قصبہ کو بالکل اُجاڑ دیا گیا۔ جو بھی سامنے آتا تھا تلوار کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ عورتوں، بچوں اور مردوں کسی کی تخصیص نہ تھی، تھانہ بھون کے گھروں میں آگ لگادی گئی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ اس وقت یہ حالت تھی۔ کہ سولیوں پر ایک کو چڑھایا جاتا تھا تو لاش کو اُتارا جاتا تھا۔ موت آنکھوں کے سامنے تھی۔ مگر کوئی بھی بچہ ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ وہ موت سے ڈر کر کلمہ حق سے پھرا ہو۔

اس جنگ میں چونکہ بکثرت مجاہدین کام آچکے تھے اور سامانِ حرب بھی اتنا کافی نہ تھا۔ کہ جس سے آئندہ جنگ کو جاری رکھا جا سکے۔ لہٰذا مجبوراً مجاہدینِ اسلام چھپتے پھرتے تھے۔ اسی جنگ میں حضرت حافظ صاحبؒ شہید ہوئے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے زخم آیا تھا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آتی ہے۔

مورخین نے انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ قرار دی ہے۔ کہ چونکہ تحریک وقت سے پہلے شروع ہوگئی تھی۔ (نیز سب جگہ ایک ہی وقت میں شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے انگریزوں کو (کہ جن کے پاس کافی طاقت تھی) تحریک کچلنے میں آسانی ہوئی۔

تھانہ بھون پر قبضہ کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا عزم کر لیا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ روپوش رہے۔ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی الزام بغاوت کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے۔

---

[1] نقش حیات صفحہ ۴۴۔۴۴ ج ۲

ہجرت مکہ چونکہ حضرت حاجی صاحبؒ ہجرت کا مصمم ارادہ کر چکے تھے اس لئے تھانہ بھون کی بربادی کے بعد آپ نے ہجرت کے لئے سفر کرنا شروع کر دیا۔ اول تین یوم گنگوہ اپنے لاڈلے اور چہیتے جانشین حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے یہاں قیام فرمایا اور یہاں سے انبالہ نگری، پنجلاسہ قیام فرماتے ہوئے براہ سندھ جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہونچے۔ پولیس آپ کا برابر پیچھا کرتی رہی۔ مگر بفضلہ تعالیٰ آپ بخیر وعافیت مکہ معظمہ پہونچ گئے۔

جس وقت پنجلاسہ پہونچے ہیں تو راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل اسپان کی ویران اور تاریک کوٹھری میں مقیم تھے۔ ایک روز اسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادے سے مصلّیٰ بچھایا اور جان نثار و حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلیٰ حضرتؒ کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوش حال، زمیندار اور سرکار کے نزدیک با وجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا ہے اس کے قائم ہوتے ہوئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ غلبہ حُبِّ دین اور فرطِ عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مالی کی پرواہ تھی نہ جان کی،

خدا کی شان جس وقت راؤ عبداللہ خاں اعلیٰ حضرتؒ کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازے کے قریب پہونچے ہیں تو سامنے سے دروش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا ششدر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون اور کس بلا کا پُتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ

دوش اصطبل کے پاس پہنچی۔ اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں گویا اپنے ناوقت آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاندیدہ و تجربہ کار راؤ دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ "این گل دیگر شگفت" گرنہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ اپنی جان یا عزت کے جانے، ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیوں کے پڑ جانے پر جیلخانہ پہونچنے یا پھانسی کے تختہ پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پرواہ نہ تھی۔ اگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو۔ اور عبداللہ خاں کی نظر کے سامنے اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابزنجیر ہو، مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب مستقل مزاج، جوانمرد اور نہایت دلیر اور قوی القلب راجپوت تھے تشویش کو دل میں دبا لیا۔ اور چہرہ اور اعضاء پر کوئی بھی اثر و اضطراب محسوس نہ ہونے دیا مسکرا کر جواب دیا۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

دوش کا افسر گھوڑے سے اترا۔ اور یہ کہہ کر کہ "میں نے آپ کے یہاں کے ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے۔ اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا۔ اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لئے۔ اور نہایت ہی اطمینان سے گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرے پر نظر جماتا۔ اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور کا ہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرے کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰحضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا۔ اور یہ کہہ کر "کیا اس کوٹھری میں گھاس بھری جاتی ہے"؟ اس کے پٹ کھول دیئے۔

زنتز کر

راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی۔ وہ انھیں کے دل سے پوچھا چاہیئے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلے کا وقت آگیا۔ اور اپنا پیمانہ حیات لبریز ہو کر اچھلنا چاہتا ہے۔ اس لئے راضی برضا ہو کر جی ہاں کہا۔ اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہوگئے۔

خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھیئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے۔ تخت پر مصلّٰی ضرور بچھا ہوا ہے۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا پڑا تھا۔ مگر اعلیٰحضرت کا پتہ بھی نہ تھا افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی کرامت پر فرحاں و شاداں، کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے اور نہ استفسار، کبھی اِدھر دیکھتا ہے۔ اور کبھی اُدھر، مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کو ٹلا لا اور کہا کہ خاں صاحب یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔؟ راؤ صاحب بولے:۔ جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ اور وضو میں منہ ہاتھ دھو یا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اس کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا کہ آپ لوگوں کی نماز کے لئے اصطبل ہے یا مسجد، راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا۔ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے۔ اور نفل نماز ایسی ہی چھپی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ لاجواب جواب سنکر افسر نے پٹ بند کر دیئے۔ اور چلا گیا۔[1] الخ

قیام مکہ معظمہ جب آپ ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہونچے تو رباط اسماعیل میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد نواب حیدرآباد دکن کی جانب سے اپنے وکلاء کے نام ایک حکمنامہ پہونچا۔ کہ حضرتؒ کو دو مکان دیدیئے جائیں۔ اس کے بعد

[1] تذکرۃ الرشید ص۷۷-۷۹ ج ۱

ایک مخلص نے ایک مکان حارۃ الشاب میں خرید کر حضرتؒ کی نذر کر دیا۔ اس مکان کے بارے میں حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس جگہ شیخ اکبر رہا کرتے تھے[۱]۔

چونکہ عرب کی آب و ہوا بھی ہندوستان سے مختلف ہے نیز ذریعہ معاش بظاہر کچھ نہیں تھا اس وجہ سے آپ کو ابتداً بہت تکالیف ہوئیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:-

"جب میں اوّل اوّل مکہ مکرمہ آیا فقر و فاقہ کی یہاں تک نوبت پہونچی کہ نو روز تک بجز زمزم شریف کے کچھ نہ ملا۔ تین چار دن کے بعد بعض احباب سے قرض مانگا۔ انھوں نے باوجود وسعت کے انکار کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ امتحان ہے۔ پس عہد کر لیا کہ اب قرض کبھی نہ لوں گا۔ اور ضعف سے یہ حالت تھی کہ نشست و برخاست دشوار تھی۔ آخر نویں دن حضرت خواجہ اجمیریؒ عالم واقعہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اے امداد اللہؒ تم کو بہت تکالیف اٹھانی پڑیں، اب تیرے ہاتھوں پر لاکھوں روپیہ کا خرچ مقرر کیا جاتا ہے۔ میں نے انکار کیا۔ کہ یہ امانت بہت سخت ہے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تمہاری مرضی، مگر اب مایحتاج خرچ تمہیں ملا کرے گا۔ تب سے بلا منت دیگرے مصارف روزمرہ چلتے ہیں۔

یعنی کم از کم سو روپیہ ماہوار کی یافت آپ کو ہو جایا کرتی تھی[۲]۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے مذکورہ واقعہ میں اتنا اضافہ اور فرمایا ہے :-

"رات میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو خواب[۳] میں دیکھا کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانہ کا ناظم اور مہتمم بنا دیا۔ صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ

---

[۱] کرامات امدادیہ [۲] ایضاً ص۳۲ [۳] پہلی روایت میں عالم واقعہ سے مراد عالم ظاہر ہے۔ عالم خواب کو عالم واقعہ نہیں کہا جاتا۔

کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں ایک سَو ریال تھے۔ اور پھر چلا گیا[۱]۔ الخ
غرض کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے قیام مکہ کے ابتدائی ایام نہایت سختی اور عسرت میں گذرے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمادی کہ ماہانہ آمدنی کم از کم سَو روپیہ ضرور ہوتی تھی۔

مرض الموت اور وصال

حاجی صاحبؒ کی عمر شریف ۸۴ سال تین ماہ بیس یوم کی ہوئی۔ اوّل تو آپ خلقۃً ضعیف اور نحیف واقع ہوئے تھے۔ اس پر ریاضات و مجاہدات تقلیل طعام و منام اور سوزش باطنی نے اور بھی لاغر کر دیا تھا۔ آخری ایام میں اسہال شروع ہوگئے۔ اور ۱۳ جمادی الآخر بروز چہارشنبہ بوقت صبح صادق آپ اپنے محبوب حقیقی سے واصل ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵

حضرت مولانا تھانویؒ نے مادہ تاریخ وفات یہ فرمایا ہے۔

حیٌّ دخل الخلد

خلفاء و مجازین

(۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ
(۲) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ
(۳) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ
(۴) حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب دیوبندیؒ
(۵) حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ
(۶) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

---

[۱] نقش حیات ص ۶۹ ج ۱

(۷) حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ (آپ خلیفہ حضرت نانوتویؒ کے ہیں اجازت حاجی صاحب سے بھی حاصل ہے)

(۸) حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ

(۹) حضرت مولانا شفیع الدین صاحب نگینویؒ (مہاجر مکی) (ماخوذ از کرامات امدادیہ)

(۱۰) حضرت مولانا محب الدین صاحب (از تذکرۃ الخلیل)

(۱۱) حضرت مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ

(۱۲) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاندھلویؒ

(۱۳) حضرت مولانا محمد حسن صاحب پانی پتیؒ

(۱۴) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ابن حافظ ضامن صاحب شہید تھانویؒ

(۱۵) حضرت مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوریؒ

(۱۶) حضرت مولانا محی الدین صاحب مرادآبادیؒ

(۱۷) حضرت مولانا محی الدین صاحب (میسوریؒ)

(۱۸) حضرت مولانا احمد حسن صاحب پٹیالویؒ

(۱۹) حضرت مولانا نور محمد صاحب بٹالویؒ

(۲۰) حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اورنگ آبادیؒ

(۲۱) حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب مالویؒ

(۲۲) حضرت مولانا صفات احمد صاحب (غازیپوریؒ)

(۲۳) حضرت مولانا محمد افضل صاحب ولایتی

(۲۴) حضرت مولانا سید فدا حسین صاحب

(۲۵) حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوریؒ (و نیز بیعت و خلیفہ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ)

(۲۶) حضرت شیخ عبدالفتاح صاحبؒ (لاز قیہ)

(۲۷) حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوریؒ (ونیز بیعت وخلیفہ حضرت گنگوہیؒ)

(۲۸) حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ (ونیز بیعت وخلیفہ حضرت گنگوہیؒ)

(۲۹) حضرت مولانا منظور احمد صاحبؒ

(۳۰) حضرت مولانا جلیل احمد صاحبؒ

(۳۱) حضرت مولانا نور محمد صاحبؒ دیگر

(۳۲) حضرت مولانا عبدالواحد صاحب بنگالیؒ (ماخوذ از مکتوب حضرت شیخ الحدیث سہارنپوریؒ)

ل؎ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب عمت فیوضہم کا مکرمت نامہ حسب ذیل نقل ہے۔ جو آپ نے بندۂ عاجز کے نام تحریر فرمایا تھا۔

مکرم و محترم، بعد سلام مسنون، گرامی نامہ مع اخبار پہونچ کر سبب منت ہوا۔ حضرت قدس سرہٗ (مولانا مدنیؒ) کی تقریر پہونچی خصوصی شکریہ، بہت سے احباب نے پڑھا اور سنا۔ حق تعالیٰ شانہٗ جزائے خیر عنایت فرمائے۔ گرامی نامہ سے علالت کا حال معلوم ہو کر قلق ہوا۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل وکرم سے صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے۔ یہ ناکارہ بھی تقریباً ایک ماہ سے اپنے قدیمی امراض کے ساتھ چند جدید امراض کا شکار ہے۔ (اتنا خط سبز روشنائی سے تحریر فرمایا تھا اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں)

یہ خط یہاں تک پرسوں لکھا پھر بخار وغیرہ کی وجہ سے رہ گیا۔ اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کے کئی رسالے، شمائم امدادیہ، کمالات امدادیہ، کرامات امدادیہ اور سب سے زیادہ جامع حضرت کا رسالہ امداد المشتاق ہے۔ گویا حضرت حاجی صاحب کی مستقل سوانح ہے۔ سب سے اول خلافت حضرت گنگوہیؒ کو ملی ہے۔ اس کے بعد حضرت نانوتویؒ قدس سرہٗ ان کے بعد

(باقی حاشیہ ص۹۳ پر)

(۴۳) حضرت حکیم زاہد حسن صاحب امروہوی رح (ماخوذ از رسالہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۷ء)

(بقیہ حاشیہ صد ۹۲ کے بعد ملاحظہ ہو)

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ ان کے بعد دیگر اکابرین کو جن کی فہرست تو شاید یکجا نہ ملے لیکن حضرت تھانوی رح نے ان دونوں حضرات کے بعد حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاندھلوی، مولانا محمد حسن صاحب پانی پتی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر مدرس دارالعلوم۔ حافظ محمد یوسف بن حضرت شہید تھانوی۔ حضرت مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوری۔ مولانا محی الدین صاحب مرادآبادی۔ مولانا محی الدین صاحب میسوری مولانا احمد حسن صاحب پٹیالوی۔ مولانا نور محمد صاحب۔ مولانا محمد شفیع صاحب اورنگ آبادی۔ مولانا عنایت اللہ صاحب مالوی۔ مولانا صفات احمد صاحب غازی پوری۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ شہید صاحب کے بھی خلیفہ ہیں۔ ان کو بھی حاجی صاحب نے خلافت دی ہے۔ شیخ عبدالفتاح صاحب لاذقیہ کے رہنے والے۔ ایک خط میں حضرت حاجی صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس سال چند لوگوں کو اجازت دی ہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب خلیفہ مولانا رشید احمد صاحب۔ مولانا احمد حسن صاحب خلیفہ مولانا محمد قاسم صاحب۔ مولانا جلیل احمد صاحب حاجی سید محمد عابد صاحب دیوبندی۔ مولانا منظور احمد صاحب۔ مولوی نور محمد صاحب۔ مولوی عبدالواحد صاحب بنگالی۔ وغیرہ حضرت حاجی صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ میرے خلفاء دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کو میں نے از خود بلا درخواست اجازت دی وہی اصل خلفا ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے درخواست کی کہ اللہ کا نام بتا دوں۔ میں نے کہا بتا دیا کرو۔ یہ اجازت پہلے درجہ کی نہیں ہے۔ فقط

والسلام

زکریا مظاہر علوم سہارنپور ۱۹ رذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

از ۱۲۴۸ھ تا ۱۲۹۷ھ

وطن ولادت مولد اور وطنِ عزیز قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور ہے۔ سہارنپور سے شمالی کو ہوتی ہوئی جو لائن جاتی ہے اس پر ایک چھوٹا اسٹیشن ہے سہارنپور سے پندرہ کوس جانب جنوب میں، اور دیوبند سے ۱۲ کوس غرب میں واقع ہے۔ قصبہ کے اِرد گرد کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ آب وہوا مرطوب ہے۔

وجہ تسمیہ نانوتہ یا نانوتہ بمعنی دعوت نو ہے۔ کس بزرگ نے آباد کیا، کب آباد ہوا؟ اس کی صحیح تحقیق نہیں معلوم ہو سکی۔ البتہ نام اور جاکے وقوع سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ بھی دوآبہ کے ان ہی دینی علمی مراکز میں شمار ہوتا تھا کہ جن میں خاندانِ شیوخ، فاروقی، انصاری، عثمانی آباد تھے۔ لہٰذا گنگوہ، تھانہ بھون، انبیٹھ، لوہاری، جھنجھانہ وغیرہ قصبات کی طرح یہ بھی بزرگوں و مشائخ کا وطن رہا ہے۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ کا تاریخی نام خورشید حسین اور تاریخ پیدائش شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ ہے۔ والد صاحب کا نام اسد علی ہے۔

نسب نامہ یہ ہے:۔ مولانا محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم (سوانحِ عمری از مولانا محمد یعقوب صاحب) آگے چل کر آپ کا نسب محمد بن ابی بکر الصدیق رضؓ سے جا ملتا ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ کے والد ماجد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ مگر فارسی تعلیم بہت کافی تھی، نمازی، متقی، پرہیزگار تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی صاحب کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم (مولانا

مملوک علی صاحب) کے ساتھ دہلی گئے تھے، اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھیں تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانہ کی ہمارے سامنے حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے مگر حال ایسا تھا کہ گویا علم سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ تمام عمر کھیتی کی۔ اور ویسے ہی عادات اور ڈھنگ موٹے، قصبات کے سے تھے۔ مگر نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی پرہیزگار رہتے الخ

(سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب صاحب ص۳)

طفولیت و تعلیم و تربیت

چونکہ حضرت مولانا قدس سرہٗ اپنے والد مرحوم کے اکلوتے بیٹے تھے اور ایک آپ کی ہمشیرہ تھیں اور بس، دوسرے بھائیوں کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ اسی طرح آپ کے چچا کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ پورے گھر میں آپ اور آپ کی ہمشیرہ ہی تھیں۔ سہارنپور میں آپ کی نانہال تھی۔ بہرحال اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈ پیار سے پرورش ہوئی۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو بچے لاڈ پیار میں پرورش پاتے ہیں بگڑ جاتے ہیں۔ مگر بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا قدس سرہٗ نہایت ذہین، طباع، جری، چست و چالاک، بلند ہمت، جفاکش اور باحوصلہ بچے تھے۔ اور "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ؎

اسے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ
یہ بچہ طرحدار پیدا ہوا ہے

چونکہ اللہ تعالیٰ کو آپ سے کام لینا تھا، اور آپ کو اُمت کا مقتدا اور امام بنانا تھا۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کے اوپر خصوصی نوازشوں کی بارش شروع کر دی تھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں۔

"جناب مولوی صاحب نے ایام طفلی میں ایک خواب دیکھا تھا۔ کہ گویا میں اللہ تعالےٰ کی گود میں بیٹھا ہوں۔ تو ان کے دادا نے یہ تعبیر فرمائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا۔ اور بہت بڑے عالم ہوگے اور نہایت شہرت ہوگی۔ یہ تعبیر ان کی نہایت درست ہوئی۔"

چونکہ حضرت مولانا قدس سرہٗ ذکاوتِ خداداد کے مالک تھے۔ اس وجہ سے پڑھنے کے علاوہ کھیل کود میں بھی اچھے اچھے کھلاڑیوں کو مات دیدیتے تھے۔

قرآن شریف آپ نے نانوتہ کے مکتب ہی میں پڑھا۔ اس کے بعد دیوبند تشریف لے آئے۔ اور مولانا مہتاب علی صاحب کے مکتب میں پڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں ابتدائی عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد سہارنپور اپنے نانا کے یہاں چلے گئے۔ اور وہاں مولانا محمد نواز صاحب سے پڑھا۔ نانا کے انتقال کے بعد اسی سال آپ نانوتہ تشریف لے آئے اور ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ[1] میں حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے۔ اور حضرت مولانا قدس سرہٗ سے کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش علی صاحب کی مسجد میں طالب علموں کا مجمع تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحب کی جب باری آئی تو سب پر غالب آ گئے۔"

۱۲۶۱ھ کے آخر میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ بھی دہلی میں ادھر اُدھر پڑھنے کے بعد آپ کے ہم سبق ہوگئے۔ اور ایسے ساتھ ہوئے کہ تمام کاموں میں بقید حیات

---

[1] حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ایک سال بعد یعنی ۱۲۶۱ھ میں دہلی تشریف لائے۔

ساتھ رہے۔ بلاشبہ دونوں حضرات فلک علم کے نیرین تھے۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرزاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ، ایسا پڑھا کرتے تھے کہ جیسے حافظ منزل سناتا ہے"

"یہ طالب علمی کا سارا زمانہ گنگوہی آفتاب و ماہتاب کا قریب قریب یکجا گذرا، کبھی کسی مسئلہ میں دونوں حضرات کی باہم بحث ہو جاتی تھی اور گھنٹوں تک رہا کرتی تھی۔ ان دونوں مشہور طالبعلموں کا مباحثہ کچھ ایسا نہ ہوتا تھا۔ کہ جس کو دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اساتذہ بڑے شوق اور تعجب سے اس بحث کو سنتے تھے اور سراپا کان ہو کر اس جانب متوجہ ہو جاتے تھے کبھی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور خاص و عام کا مجمع ہو جایا کرتا تھا۔ جانبین سے وہ نکتہ سنجیاں اور باریک بینیاں ہوتی تھیں کہ باید و شاید۔ ایک بار ایک استاد نے دونوں کی گفتگو سن کر یوں فیصلہ کیا کہ قاسم ذہین آدمی ہے اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا ورنہ اس مسئلہ میں رشید حق پر ہے"

(تذکرۃ الرشید ص۳۲)

علوم عربیہ کی اکثر تمام کتابیں آپ دونوں حضرات نے مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھی ہیں۔ البتہ حدیث شریف حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے حرفاً حرفاً پڑھی ہے۔

ذوق ادب یا شاعری

آپ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ فرماتے ہیں "آپ فطری شاعر تھے" اور اپنے بچپن کے کھیل اور قصے نظم کر لیتے تھے۔ اور اتفاق سے آپ کو استاد (یعنی حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ) بھی ایسے ہی ملے تھے۔ جن میں کافی ادبی

ذوق تھا۔ چنانچہ مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی خلیفہ حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں:۔

"حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ وغیرہ جو تلامذۂ مولانا مملوک علی صاحب کو دہلی کے شعراء 'ذوق، مومن، غالب اور امام بخش صہبائی وغیرہم کے مشاعرے کے مشاعرے یاد تھے۔ یہ ان حضرات کی عالی ظرفی ہے کہ زبان پر شعر کا نام تک نہیں آتا۔ فرماتے ہیں کہ مولانا مملوک علی صاحبؒ مع اپنے تمام شاگردوں کے دہلی کے مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ تاکہ طلباء میں جولانی طبع پیدا ہو۔ الخ

(رسالہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۵۶ء)

بہر حال آپ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کا منظوم کلام مطبوعہ موجود ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور نمونہ چند اشعار پیش کر دیئے جائیں۔ آپ کے نعتیہ کلام کے چند شعر ہیں۔ ؎

اڑا کے باد مری مشتِ خاک کو پسِ مرگ　　کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاک قاسم کا　　کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

اُمیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ　　کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں　　مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار

جو یہ نصیب نہ ہو پھر کہاں نصیب مرے　　کہ ہوں سگانِ حرم کی تیرے قطار

شجرۂ منظومہ چشتیہ کے چند ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں۔

الٰہی غرقِ دریائے گناہم　　تو میدانی ز خود ہستی گواہم

گناہ بے عدد را بار بستم　　ہزاراں بار توبہ را شکستم

زمن دارد سگِ نصرانیاں عار　　کہ ہست او بے گناہ و من گنہگار

حجابِ مقصدم عصیانِ من شد　　گناہِ موجبِ حرمانِ من شد

شعروں کے ہر ہر لفظ سے درد ٹپک رہا ہے۔ بلند پروازی، نازک خیالی اور سوز و

گداز، آپ کے یہاں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، میرؔ وغیرہم سے کم نہیں ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو آپ نے ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کی زمین میں کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

رقیب مہر کے قابل عدو وفا کیلئے
بنے تھے ہم ہی فقط آپ کی جفا کے لئے

ہمیں تو صبر کو کہتے ہیں شیخ واعظ سب
انھیں تو کوئی بھی کہتا نہیں خدا کیلئے

وہ بات کیا ہے کہ مر کر بھی قاتلِ بے رحم
قتیل تیرے تڑپتے رہے جفا کیلئے

نازک خیالی ملاحظہ فرمایئے :۔

پڑے نقشِ پا کی طرح بر جہاں ہم
وہیں مر مٹے ناتوانی تو دیکھو

نہ ہو دل کو تسکیں نہ کچھ آس ٹوٹے
ذرا آپ کی خوش بیانی تو دیکھو

دیگر

اپنی مشتِ خاک اور یہ آرزو
کوچۂ دلدار میں برباد ہو

آرزوئیں ہوگئیں سینہ میں خاک
دل لگا کر خاک کوئی شاد ہو

یہ ہی نہیں بلکہ حضرت قدس سرہٗ مشکل سے مشکل زمین میں شعر کہتے تھے :۔

قطعہ

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پیدا نہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

میں کیا کروں کہ تیر ترے ناوک کا جل گیا
رکھتا تھا اس کو داغ سے دور اور شکستہ پر

(ماخوذ از دار العلوم ذی الحجہ ۱۳؁ھ)

ان چند اشعار سے حضرت مولانا قدس سرہٗ کا ذوقِ ادب اور مقام شاعری ظاہر ہے۔ اور ایک ماہر ترین ادیب اور نقاد یہی کہہ سکتا ہے، کہ میر تقی میرؔ کے ہم پلّہ اشعار ہیں۔ مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز کی شاعری سوز و گداز سے لبریز ہے۔ آپ غالبؔ کی سی مشکل نگاری کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ ہاں ذوقِ سخن پر ذوقؔ کا رنگ غالب ہے۔ قصائد میں سوداؔ سے آگے بڑھ کر قلم مارتے ہیں۔ لیکن مبالغہ سے کلام خالی ہوتا ہے

مولانا قدس سرہٗ کے قصائد، مراثی، غزلیات اور منظوم کلام بکثرت موجود ہیں۔ یہاں پر صرف نمونہ ہی پیش کرنا مقصود تھا آپ کے کلام پر نقد و تبصرہ مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کوئی مستقل رسالہ ہونا چاہیئے۔ اسی جگہ مولانا قدس سرہٗ کے کلام کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔

ذوقِ کتابت

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوقِ کتابت بھی آپ کو شروع سے ہی تھا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"چھوٹے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے ہیں۔ جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے جو ربط نسب کا تھا حضرت مخدوم کے ننہال ہمارے خاندان میں تھی اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی۔ اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ نہایت محبت و اخلاص فرماتے۔ جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلد بنا ڈالی"

فراغت طالب علمی کے بعد آپ نے تصحیح کتب کا کام شروع کردیا تھا۔ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کا واقعہ ہے۔

"پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی مزدوری کرلی۔"

آپ نے مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کی بخاری شریف کی تصحیح بھی فرمائی ہو اور آخر کے ۵ یا ۶ پارے خود لکھے ہیں غرضکہ میرٹھ اور دہلی میں پریس میں کافی عرصہ تک تصحیح کا کام کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مرادآبادیؒ کو آپ نے میرٹھ اور دہلی کے زمانہ قیام میں حدیث پڑھائی ہے۔

درس و تدریس

پڑھانے کا کام بھی آپ نے زمانہ طالب علمی سے شروع کردیا تھا

مولانا مملوک علی صاحبؒ نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی صرف و نحو کی کتابیں آپ ہی کے سپرد کردی تھیں اور آپ ان کو مشق کرایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ زمانہ تصحیح میں برابر یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ جیساکہ اوپر ذکر کر دیا گیا ہے۔ آخر زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا اور آخر دم تک پڑھاتے رہے۔ آپ کے ممتاز تلامذہ میں سے صرف حضرت مولانا شیخ الہندؒ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رح حضرت مولانا فیض الحسن صاحب گنگوہیؒ کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔

سلوک و تصوف

حضرت مولانا قدس سرہٗ العزیز اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ مگر عقیدت و تعلق قلبی بچپن ہی سے تھا اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحبؒ نانوتہ آتے رہتے تھے۔ اور بہت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ علاوہ ازیں نسبی رابطہ بھی تھا چنانچہ آپ حضرت حاجی صاحبؒ کے بہت مداح تھے اور اپنے ساتھیوں کو حاجی صاحبؒ کی کرامات و مکشوفات کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو آپ نے ہی اس طرف متوجہ کیا تھا۔ صاحب تذکرۃ الرشید راقم ہیں۔

> "حضرت مولانا قاسم العلوم اپنے ہم جماعت طلبا میں حضرت حاجی صاحبؒ کے کمالات علمیہ و عملیہ کا تذکرہ فرماتے اور خوارق و کرامات کے اظہار و بیان سے آستانہ عالیہ کی طرف ترغیب دلاتے، خصوصاً امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے چونکہ جلوت و خلوت کی شرکت تھی بہت ہی خصوصیت کا ذکر ہوتا۔ بلکہ اس کی کوشش تھی کہ حضرت مولانا بھی اسی مقدس ہستی کے ہاتھ پر بیعت ہوں الخ"

لے حاشیہ تذکرۃ الرشید ص۴۵

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمۃ اللہ سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ ..... سُلّم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی۔ اس لئے انکار فرماتے تھے۔ بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت! ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات یا جمعہ کو پڑھا دیا کریں۔ غرض منظور ہو گیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آ نکلے۔ اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مع تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا لو بھائی! حاجی صاحبؒ آ گئے۔ اور حضرت مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ کبھی یہ اچھا حاجی آیا، ہمارا سبق ہی گیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا۔ یا الٰہی توبہ کہو، یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں، ایسے ہیں، ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہم کو مونڈیں گے۔ اول زیارت ہمیں اس وقت ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں دو طالب علم (مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں[1]۔

اس تحریر سے جہاں حضرت حاجی صاحبؒ کا تعلق ان دو حضرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا تعلق بھی بوضاحت ظاہر ہو رہا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

حضرت حاجی صاحب کا کوئی تقویٰ کی وجہ سے معتقد ہے، کوئی کرامت کی وجہ سے، میں حضرت کے علم کی وجہ سے معتقد ہوں[2]۔

---

[1] تذکرۃ الرشید ص ۴۱ ج ۱ [2] قصص الاکابر ص ۲۵۔

بہرحال آپ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے بعد مرید ہوئے اور نہایت سخت ریاضات ومجاہدات کئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"مولوی صاحب ایسے جفاکش تھے کہ رات میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی، تو مسجد میں گرم پانی ہوتا تھا اور تہجد کے وقت نہاتے مگر شرم کے سبب تالاب میں جاکر نہاتے، پھر کڑکڑاہٹ کا جاڑا اور پالا اور مولوی صاحب تالاب میں نہائیں۔ مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا۔ اشغال دشوار جیسے حبس دم اور سہ پایہ مدت تک کئے ہیں۔ اور بارہ تسبیح اور ذکر کا دوام تھا ہی۔ سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے الخ

جس زمانے میں مولوی صاحب میرے پاس رہتے تھے۔ مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی۔ بال سر کے بڑھ گئے تھے۔ نہ دھونا نہ کنگھی دتیل نہ کترتے نہ درست کرتے، عجیب صورت تھی، مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی۔ ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے۔ اس لئے میں تو کچھ کہہ نہ سکا۔ ایک اور دوست سے کہلایا، تب بمشکل بال کترواکر درست کئے الخ۔"

آپ کی تواضع وانکساری اور فنائیت کا یہ عالم تھا کہ :-

مولوی صاحب کو اوّل عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے تھے۔ اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا الخ

مزگوں پہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور آپ بولتے نہیں، کوئی نام لیکر پکارتا آپ خوش ہوتے، تعظیم سے نہایت گھبراتے الخ

کتمان حال کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

علماء کی وضع عمامہ و کُرتہ کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے

... خراب کردیا۔ ورنہ اپنی وضع کو ایسی خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں کہ اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے۔ کیا ان میں سے ظاہر ہوئے سب کو خاک ہی میں ملا دیا اپنا کہا کر دکھایا الخ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ارشاد فرماتے ہیں:۔

حضرت مولانا نانوتوی کی شان نہ عالمانہ تھی نہ درویشانہ تھی بلکہ عاشقانہ تھی اور آپ کی مجلس دوستانہ ہوتی تھی۔ گاڑھے کے کپڑے پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ دیوبند سے نانوتہ کو تشریف لے جاتے تھے۔ ایک جولاہے نے بوجہ سادگی کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ سوت کا آج کیا بھاؤ ہے۔ مولانا نے جواب دیا۔ کہ بھائی! آج بازار جانا نہیں ہوا۔ (ص ۲۰)

آپ کو سرزمین عرب سے ایسا تعلق تھا کہ جس کی مثال[1] امام مالک کے علاوہ دوسری جگہ بایں وشاید ہی ملتی ہے۔ چنانچہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو۔

جب بیر علی کے پاس سواری پر آپ گذر رہے تھے کہ سواری پر سے آپ اچھل پڑے جاجوتا اتار لیا فرمانے لگے۔ جس زمین اور جن گلی کوچوں میں پیغمبر آخر زماں صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لگے ہوں۔ وہاں جوتے سمیت چلتا پھروں۔

رسول کریم سے نسبت کی وجہ سے وہ مکانات باعظمت ہو گئے۔ وہاں کے اشخاص باعظمت ہو گئے۔ عربوں سے بغض وعناد رکھنا نفاق کی علامت ہے۔ اور ان سے الفت اور محبت کی پینگیں بڑھانا۔ ایمان کی علامت ہے۔

(رسالہ دارالعلوم فروری ۱۹۵۶ء)

بزرگوں اور اولیاء اللہ کا احترام اللہ اللہ! اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے جو تعلق آپ کو تھا وہ گذشتہ سطور میں ظاہر ہو چکا ہے۔ مزید برآں یہ کہ:۔

---

[1] امام مالک کے متعلق مروی ہے کہ تا حیات مدینہ و حرم نبوی میں بول و براز نہیں کیا۔ (مقدمہ اوجز المسالک)

مولانا نے ایک مسودہ حضرت حاجی صاحب کا دیا ہوا نقل کیا اس میں ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا۔ اس کو مولانا نے صحیح نہیں کیا بلکہ ادب کی وجہ سے وہاں جگہ چھوڑ دی حضرت حاجی صاحب نے پھر درست فرما دیا۔

(قصص الاکابر صفحہ ج ۲)

یہی وجہ تھی کہ آپ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

- مولانا صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کیا۔ دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضامین بیان ہوتے۔ ایک صاحب کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے یہ سن کر یوں سمجھے کہ یہ رنگ تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے۔ درخواست کی کہ کبھی تنہا ملئے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے، تنہائی کہاں۔ آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری طرف متوجہ ہوں۔ اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہو گئے۔ مولانا سبق پڑھا رہے تھے، البتہ پڑھانا موقوف کر دیا مگر کبھی آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند ان کی طرف متوجہ ہوئے ان کا یہ حال ہوتا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل کر بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا۔ پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے۔ الخ صفحہ ۱۲

ان ہی کمالات کے باعث حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا۔

ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔

ضیاء القلوب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے وہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تذکرہ میں گذر چکا ہے اس کا مکرر ذکر ہمارے اختصار کے خلاف ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

مجاہدانہ زندگی و ملک و ملّت کی خدماتِ جلیلہ

مجاہدانہ زندگی کے عنوان کے ماتحت صرف ان ہی واقعات کا تذکرہ کرنا ہے جو آپ کی زندگی کے ساتھ مخصوص ہیں، ورنہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزیں حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت امام ربّانی قدس اللہ سرہٗ کے تذکرہ کے تحت آچکی ہیں۔

دیگر خدماتِ جلیلہ کے تحت ہم حضرت قدس سرہٗ کے مناظرے، قیام مدارس اور تصنیف و تالیف کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ دارالعلوم دیوبند، حضرت قدس سرہٗ کی حیاتِ طیبہ کا جلی عنوان ہے۔ و نیز دوسرے اکابر و مشائخ کی مساعی جمیلہ کا بھی اس میں کافی حصہ ہے۔ اس وجہ سے اس کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کریں گے تاکہ دارالعلوم دیوبند کے حالات بھی مفصلاً آجائیں۔ اور دوسرے مشائخ کا تذکرہ بھی آجائے۔

مجاہدانہ زندگی

یوں تو حضرت قدس سرہٗ کی پوری زندگی ہی مجاہدانہ زندگی ہے لیکن ہماری غرض اس سے آپ کی حیاتِ طیبہ کا وہ گوشہ ہے کہ جس میں آپ شمشیر بکف ہو کر حکومتِ برطانیہ سے ٹکرائے تھے۔ اگرچہ آپ نے فنونِ حربیہ کی زیادہ مشق نہیں کی تھی لیکن آپ کے تلوار کے ہاتھ اور بندوق کی نشانہ بازی پتہ دیتی تھی کہ آپ کسی باقاعدہ فوج کے کمانڈار ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

> اس وقت (غدر ۱۸۵۷ء) میں راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا جب احقر وطن پہونچا تو چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال ہمت اور جرأت ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم لوگ گولیاں لگا رہے تھے اور نشانہ کی جگہ پر ایک نیم کا پتّا رکھا تھا۔ اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں

مٹی کی تھیں، مولوی صاحب نے فرمایا بندوق کیوں کر لگاتے ہیں مجھے بھی دکھلاؤ
کسی نے ایک فائر کیا اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا تب بندوق لے کر فائر کی۔
صاف گولی نشانہ پر لگی۔ اور وہ سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے۔ دائرہ
پر لگ جانے کو نشانہ پر پہونچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم
سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن اسی پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے
کی وجہ تھی نہ ہوئی۔ تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خطِ مستقیم
ہو جاتے ہیں الخ" صفحہ ۱۲

فنونِ حربیہ کی اسی مہارت کی وجہ سے آپ کو تھانہ بھون اور شاملی کے محاذ کا
سپہ سالار فوج بنایا گیا تھا (جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے) چنانچہ تھانہ بھون اور شاملی
کے معرکہ آپ ہی کی حسن تدبیر کے مرہونِ منت ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں جب گورنمنٹ کی طرف سے گرفتاریاں شروع
ہوئیں۔ تو آپ صرف تین دن روپوش رہے تین دن کے بعد باہر نکلے کہ تین دن سے
زیادہ روپوش رہنا خلافِ سنت ہے۔ ایک مرتبہ دوش کے سپاہیوں سے مٹھ بھیڑ
ہو گئی۔ انھوں نے دریافت کیا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں۔ آپ نے دو قدم
پیچھے ہٹ کر فرمایا "ابھی تو یہیں تھے" بہر حال چونکہ آپ سے اللہ تعالیٰ کو دین کا
بہت بڑا کام لینا تھا۔ اس وجہ سے آپ ہاتھ نہ آئے۔

مناظرے

انگریز آئے اور اپنے ساتھ الحاد و بے دینی، نفاق و افتراق کے طوفان
لائے ان کی پالیسی ہی یہ تھی کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" ہندوستانیوں
خصوصاً مسلمانوں کو بے دین بناؤ۔ اور اپنا سکہ جماؤ" وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک
ہندوستان میں مسلمان مسلمان بن کر رہیں گے۔ ہماری تو کیا دنیا کی کسی طاقت کی مجال
نہیں کہ حکومت کر سکے۔ لہٰذا اس نے اس کے لئے دو طریقے ایجاد کئے (۱) انگریزی

تعلیم کا اجراء (۲) پادریوں کو مذہب نصرانیت کی تبلیغ واشاعت کے لئے بڑے بڑے وظیفہ دے کر ہندوستان بھیجا۔ انگریزی تعلیم نے کیسا زہر پھیلایا وہ ظاہر ہے' الحاد، بے دینی، فسق وفجور، بے حیائی، بے شرمی، دین سے آزادگی، بدعقیدگی۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے جس کے لئے اس زمانہ میں توکسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے "عیاں راچہ بیاں" اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم بھی اپنی مذہبی تعلیم کو چھوڑ کر دوسری طرف جائے گی، اس کا انجام یہی ہوگا۔ چہ جائیکہ مغربی تعلیم کہ جس کا اولین منشار خدا اور مالک کائنات سے بیگانگی اور بدعقیدگی ہے۔ کریلا اور نیم چڑھا کے مترادف ہے۔

پادریوں نے ہندوستان آکر تبلیغ عیسائیت شروع کی۔ چنانچہ اس سیلاب میں غیر مسلم بہت بُری طرح بہہ گئے اور تبدیل دین کر بیٹھے۔ مسلم رہنما جو نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ عیسائیوں کے آڑے آئے اور مناظرے شروع ہوگئے۔ چنانچہ ایک مناظرہ چاندپور ضلع شاہجہاں پور میں ہوا جس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

میلہ خداشناسی یا گفتگوئے مذہبی

نام سے ظاہر ہے کہ یہ مناظرہ ۱۲۹۳ھ میں ہوا ہے۔ چاندپور

اس ضلع کا ایک گاؤں ہے۔ جس کے رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی تھے۔ ان کے یہاں ایک عیسائی ٹیچر تھے۔ جو اپنے مذہب کی اشاعت کیا کرتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ منشی پیارے لال نے تمام مذاہب کے لوگوں کو جمع کیا، اور نام میلہ خداشناسی یا گفتگوئے مذہبی رکھا، عیسائیوں کی طرف سے بڑے بڑے پادری جن پر اہلِ یورپ کو ناز تھا موجود تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے (۱) مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندیؒ۔

(۲) حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ (۳) حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ

(۴) حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ صاحبؒ بجنوری (۵) مولانا ابوالمنصور صاحب دہلویؒ

(۶) حضرت مولانا احمد علی صاحب دہلوی (۷) حضرت میر حیدر علی صاحب دہلویؒ

بھی موجود تھے۔

اصل مناظرہ اہلِ اسلام اور نصاریٰ کا تھا۔ ہندو صاحبان تو ویسے ہی پوتھی لئے بیٹھے تھے۔ مناظرہ ہوا اور بفضلہ اہلِ اسلام غالب آئے۔ اور فریق مخالف کو بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق یہ کہنا پڑا۔

"جب میلہ برخاست ہونے لگا۔ اور سب اہلِ اسلام وہاں سے روانہ ہوئے تو میلہ کے ہندو وغیرہ مناظرانِ اہلِ اسلام کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ گاڑیوں کی قطار سے بیس[2] قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا۔ پاؤں میں کھڑاویں، سر پر لمبے لمبے بال، برہنہ سر، ہاتھ میں دست پناہ (چمٹہ) دو چار معتقد اس کے ساتھ تھے۔ مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "یہ مولبی ہے"۔ اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب نے نظر اُدھر کو پلٹی تو اس نے سلام کیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات سے ہاتھ کو اُٹھا کر جواب دیا۔ اس نے جو دیکھا مولوی التفات سے جواب دیتا ہے۔ تو وہاں سے دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیبان سے کہا۔ تھام دے۔ اس نے اوروں کو آواز دے کر کہا تھم جاؤ۔ القصہ گاڑیاں تھم گئیں۔ جوگی صاحب بولے تم نے بڑا کام کیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا میں نے کیا کیا۔ پرمیشور نے کیا۔ اس نے کہا سچ کہتے ہو۔ پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا۔ جب تم نے بولی ماری تو ہم نے دیکھا۔ اس کا (یعنی پادری کا) اتنا سر پر سوکھ گیا تھا۔ الخ"

ایک اور پادری صاحب سے سید صاحب (مراد سید ظہور الدین صاحب) کہتے تھے۔ میں نے پوچھا تم اس روز کچھ نہ بولے۔ انھوں نے کہا۔ ہم

کیا بولتے ۔ مولوی صاحب نے کون سی بات چھوڑ دی تھی ۔ جو ہم بولتے ۔ ہمارے پادری نولس ہی کو جواب سنایا الخ

پادری اینک کہتا ہے ۔

کیا پوچھتے ہو ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا ۔ اور بہت سے علماء اسلام سے گفتگو کا اتفاق ہوا پر نہ یہ تقریریں سنیں اور نہ ایسا عالم دیکھا الخ

آگے چل کر کہتا ہے ۔ کہ

اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے اور پھر یہ کہا کہ تقدیر کے مسئلہ کو پادری جب چھیڑا کرتے ہیں ' جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی ۔ پادری نولس صاحب نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں پر اس شخص نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتہ نہ لگنے دیا ۔

ہندو حضرات تو یہاں تک کہتے تھے

" کوئی اوتار ہوں تو ہوں " (میلہ خداشناسی صلہ ۔ ۳۹)

مناظرہ رڑکی

یہ مناظرہ ۱۲۹۵ھ میں ہوا تھا ۔ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی پنڈت دیانند نے بھی اہل اسلام سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی ۔ چنانچہ ایک مرتبہ رڑکی بھی آیا ۔ اور مجمع عام میں اسلام پر اعتراض کر دیئے ۔ جس وقت حضرت مولانا قدس سرہٗ تشریف لے گئے تو مناظرہ سے جان چرا کر راہ فرار اختیار کی ۔ اور منہ چھپا کر بھاگ گیا ۔ پنڈت دیانند کے اعتراضات کا جواب حضرت مولانا قدس سرہٗ نے اپنے رسالہ " قبلہ نما " میں دیا ہے ۔ عجیب کتاب ہے ۔

تصانیف

حضرت مولانا کی متعدد تصانیف ہیں جو اپنے مرتبہ کی آپ ہی ہیں ۔ حضرت مولانا تھانوی ان کتابوں کے بارے میں فرمایا

کرتے تھے کہ:-

۔ اگر ان کتابوں کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور نام نہ بتایا جائے تو یہی کہا جائیگا کہ یہ کتابیں امام رازیؒ یا امام غزالیؒ کی ہیں ۔

آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں:- تقریر دل پذیر، تحذیر الناس، آب حیات، انتصار الاسلام تصفیۃ العقائد، حجۃ الاسلام، قبلہ نما، تحفۂ لحمیہ، مباحثہ شاہجہاں پور، جمال قاسمی۔ توثیق الکلام ۔ اجوبہ اربعین وغیرہ ۔

اگر چہ مذکورہ کتابیں زبان اردو میں ہیں لیکن ان کا سمجھنا عوام تو عوام، بعض علماء کے بس کا بھی نہیں ہے۔ الفاظ اور زبان نہایت سہل ہے۔ مگر علوم نہایت مشکل مذکور ہیں۔

قیام مدارس زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا قدس سرہٗ نے ایک خواب دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر ہوں۔ اور مجھ سے ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ نے اس کی تعبیر علم دین کا فیض دی تھی۔

حقیقت یہی ہے کہ دنیا کی مسلم آبادی کا بیشتر حصہ حضرت مولانا قدس سرہٗ کی نہروں کا جرعہ نوش ہے۔ دارالعلوم دیوبند (جس کا بیان مستقل آئندہ آتا ہے) آپ ہی کا پروردہ ہے۔ مظاہر علوم سہارنپور (جس کا بیان بھی آئندہ صفحات میں موجود ہے) بھی آپ ہی کے دست مبارک کے سنگ بنیاد پر قائم ہے[1]۔

اس کے علاوہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ اسلامیہ امروہہ سب ہی اُن کے مرہون منت اور پروردہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مدارس کے بانی اگرچہ مختلف ہیں۔ مگر لائحہ عمل آپ ہی کا عطا کردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز پر مدارس اسلامیہ کا اجراء صرف آپ ہی کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے قیام مدارس کی جو تحریک شروع کی، اس

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید جلد اول زیر عنوان جلسہ دستار بندی

کے محرک اول آپ ہی ہیں۔

سلسلہ بیعت و خلفاء حضرت مولانا قدس سرہٗ بیعت نہیں فرماتے تھے۔ متعدد حضرات نے بیعت کی درخواست کی مگر آپ ٹال دیتے تھے۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

ایک صاحب نے آپ کی خدمت میں شکر بطور ہدیہ پیش کی ساگلے دن آکر عرض کیا۔ مجھے بیعت کر لیجئے۔ فرمایا میں تو بیعت کرتا نہیں ہوں کسی دوسرے کے پاس جاکر بیعت ہو جاؤ۔ اس نے عرض کیا تو پھر میری شکر واپس کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ بھائی! ان کی شکر لاکر دیدو، جب شکر آئی تو اس آدمی نے عرض کیا میاں تو اپنی وہی شکر لوں گا یا پھر مجھے بیعت کر لیجئے۔ تب حضرت مولانا قدس سرہٗ نے مجبوراً بیعت کر لیا الخ (قصص الاکابر ملخصاً)

اسی طرح سے مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی کا واقعہ ہے جس کو مولانا نسیم احمد صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے۔

حضرت قاسم العلوم قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ کہ میں اس قابل کہاں؟ آپ فلاں فلاں بزرگوں میں سے کسی سے بیعت ہو جائیں۔ ان میں سے ایک نام مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کا بھی تھا۔ حکیم صاحب (مولانا محمد صدیق صاحب) نے ہر بار یہی عرض کیا کہ میں تو حضرت ہی سے بیعت ہوں گا۔ حضرت والا مرتبت نے آخر میں فرمایا۔ کہ آپ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے بیعت ہو جائیں۔ آپ نے پھر عرض کیا۔ میں تو آپ ہی سے بیعت ہوں گا۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ ان کا (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ) کا تو میں بھی معتقد ہوں۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت والا کے اعتقاد سے کیا۔ مجھے تو اپنا

اعتقاد کا آمد ہوگا۔ آٹھ روز تک حضرتؒ نے بیعت نہیں کیا۔ برابر ٹالتے رہے اور یہ بھی جمے رہے۔ آخر میں حضرت قدس سرہٗ نے از رہِ انکساری فرمایا:۔

"یہ شیطان کا دھوکہ ہے، جب وہ کسی ہونہار کو دیکھتا ہے۔ اور کچھ بن نہیں آتا تو ایسی جگہ پھنسا دیتا ہے۔ جسے کچھ نہ آتا ہو۔ غرض بڑی سفارشوں سے بمشکل ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ (۲۳ مئی ۱۸۷۲ء) کو بیعت فرمالیا۔[۱]

(دارالعلوم رسالہ فروری ۱۹۵۶ء)

جب حکیم صاحب اجازت کے قابل ہوگئے۔ تو ان الفاظ میں اجازت مرحمت فرمائی۔

"حضرت حاجی صاحبؒ کی جانب سے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت ہے۔"

آخر میں حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف سے بھی آپ کو اجازت مل گئی تھی۔ آپ کے خلفاء میں سے صرف دو ہی حضرات کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔ یعنی حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہوی اور دوسرے مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مرادآبادی۔

سفرِ حج اور وصال

آپ نے دو حج کئے۔ پہلا حج حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی معیت میں ۱۲۷۷ھ میں کیا۔ دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں اس عظیم الشان قافلہ کے ساتھ کیا جس میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور دوسرے اکابر اُمت تھے۔ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں جب آپ وطن واپس ہو رہے تھے تو جدہ پہونچ کر آپ کو بخار ہوگیا۔ اتفاق سے اس جہاز میں وبائی مرض پھوٹ نکلا تھا۔ جہاز میں ایک دو آدمی روزانہ نذرِ اجل ہو جاتے تھے۔ بمبئی پہونچ کر حضرت مولانا قدس سرہٗ اس قدر نڈھال ہوگئے تھے کہ بیٹھنا دشوار تھا۔ وطن پہونچ کر بخار تو جاتا

---

[۱] ایک یہ نمونہ ہے دوسری طرف آج کل کے نااہل پیر ہیں کہ جنھوں نے دوکانداری اور پروپیگنڈے کا جال پھیلا رکھا ہے۔ مرید کرتے ہیں اگرچہ اہل نہیں ہیں۔

رہا۔ مگر کھانسی ٹھہر گئی۔ اسی حالت میں دیانند کے ساتھ رڑکی کا واقعہ پیش آیا۔ اسی عرصہ میں سابقہ مرض ابھر آیا۔ اور چند مرتبہ دورہ پڑا اور مرض بڑھتا رہا۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری معالج تھے۔ اسی دوران میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ آپ سہارنپور تشریف لے گئے۔ مگر شام کو واپس آگئے۔ درمیان میں کچھ عارضی افاقہ ہوگیا تھا۔ جس میں آپ نے پڑھانا شروع کردیا تھا۔ کہ پھر مرض کا حملہ ہوا۔ بالآخر ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر آپ کا انتقال ہوگیا[1]۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آپ کے جنازے کی نماز میں بہت سے رجال الغیب شریک رہے۔ جو جنازہ کی نماز پڑھ کر رخصت ہوگئے تھے۔ پھر دن میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ آپ کے بہت سے مراثی اور تاریخیں لکھی گئیں جو اکثر و بیشتر مطبوعہ ملتی ہیں۔

تاریخ وفات

" وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہوئے "	از مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ
" کیا چراغ گل ہوا "	از حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ
" مصیبت پر آئی مصیبت "	" " "
" رضی اللہ عنہما دائمًا "	عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کانپور۔
" پیوند خاک زہد و سخا ہوں ہزار حیف "	از حضرت شیخ الہندؒ

۱۲۹۷ھ

قابلِ تقلید زندگی

یوں تو حضرت مولانا قدس سرہٗ کی پوری زندگی ہی قابلِ تقلید ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے

[1] یہی تاریخ، وقت، دن حضرت شیخ الاسلامؒ کا ہے۔

کہ ان کی تقلید کرنے کے لئے بھی منہ چاہیئے۔ غرض اس جگہ ان چند واقعات سے ہے۔ جو آپ کے متعلق اکابر سے منقول ہیں۔ اور چونکہ تمام واقعات کے بیان کے لئے بڑے دفتر کی ضرورت ہے۔ اس لئے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

(۱) ایک مرتبہ آپ کے یہاں مہمان تشریف لائے۔ ان کی سواری کے لئے اتفاق سے گھر میں چنے موجود نہ تھے۔ گھر میں کابلی چنے تھے وہی دلوا کر روانہ کیا۔

(۲) جناب مولوی صاحب نے دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل سنت کے موافق کیا۔ بدون اطلاع کسی کے جمعہ کے روز بعد نماز نکاح کر دیا۔ البتہ جناب مولوی رشید احمد صاحب کو بلوایا تھا۔ اور ان کو غالباً اطلاع فرمادی تھی۔ اور کسی کو خبر نہ تھی الخ

(از حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب)

(۳) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو سبزی کا شوق تھا۔ کچھ پودینہ دھنیہ وغیرہ کے درخت لگے تھے۔ ان میں مینگنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ کسی زمیندار کا وہاں گذر ہوا۔ مولانا نے ان سے فرمائش کر دی۔ انھوں نے رعایا میں سے ایک گڈریہ کے سر پر ٹوکریوں میں مینگنیاں بھر کر بھیجدیں مولانا اپنے ہاتھوں سے اس سبزی میں ڈال رہے تھے۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ سامنے سے آ گئے بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا کہ اس شخص کا حال معلوم نہیں کہ ظالم ہے۔ اس نے ضرور زبردستی ظلماً اس بیچارے شخص سے بیگار لی ہے۔ اس کو ابھی واپس کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اسی وقت وہ تمام مینگنیاں اپنے ہاتھ سے جمع کر کے ..... واپس کر دیں۔

(۴) ایک مرتبہ آپ رام پور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب کو خبر ہوئی تو ملاقات کے شوق میں بُلا بھیجا آپ نے کہلا بھیجا۔ ہم دیہاتی ہیں آداب شاہی سے واقف نہیں۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا۔ آپ کو تمام آداب معاف ہیں۔ آپ نے جواب میں کہلا بھیجا۔ عجیب بات ہے" ملاقات کا شوق تو آپ کو ہو، اور جاؤں میں، غرض کہ

آپ تشریف نہ لے گئے۔ (از قصص الاکابر)

(۵) ایک مرتبہ کسی نے آپ کی دعوت کی۔ برسات کا موسم تھا۔ آپ نے وعدہ کرلیا۔ کہ اچھا بھائی بعد مغرب کے آجاؤں گا۔ اس آدمی کا گھر شہر سے نکال پر تھا اتفاق سے مغرب کے وقت زور کا مینھ برسا اور دارالعلوم سے لے کر اس آدمی کے گھر تک پانی ہی پانی تھا۔ بہر حال آپ پانی کھوندتے ہوئے پہونچے۔ اور جا آواز دی۔ وہ آدمی گھبرایا ہوا آیا۔ اور عرض کیا کہ حضرت بارش کی وجہ سے کوئی انتظام نہ کرسکا۔ آپ نے فرمایا۔ کیا مضائقہ ہے جو موجود ہو، چنانچہ اس آدمی نے بگڑ کی روٹی اور ساگ پکایا تھا۔ گھروالی ایسی گھبرائی ہوئی تھی کہ ساگ کی بجائے ایلوا جانوروں کے لئے پکا رکھا تھا وہ اتار کر دے دیا۔ اندھیرا ہو ہی رہا تھا۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر کے اسی کو کھالیا اور آگئے۔ صبح کو جب اس آدمی نے دیکھا کہ رات مولانا کو ساگ کے دھوکہ میں ایلوا دیدیا ہے تو گھبرایا ہوا آیا اور معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ کوئی بات نہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

(از مولانا محمد طیب صاحب)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ

از ۱۲۴۹ھ تا ۱۳۰۲ھ

نام ونسب آپ کا اسمِ گرامی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور تاریخی نام منظور احمد، تاریخ پیدائش ۱۳ر صفر ۱۲۴۹ھ ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب بن مولانا مملوک علی صاحب بن احمد علی بن غلام اشرف بن عبداللہ بن محمد فتح بن محمد تقی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم اور آگے چل کر یہ سلسلہ حضرت محمد بن ابی بکر الصدیق رضؓ سے جا ملتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے والد محترم حضرت مولانا مملوک علی صاحب ۱۷۸۶ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ اور تعلیم دہلی حاصل کی۔ تبرکاً "ہدایۃ النحو" تک حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھا۔ اور پھر مولانا رشید الدین خاں صاحب تلمیذ شاہ عبدالعزیز صاحب سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ اس سے فارغ ہو کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اور جب ۱۸۲۵ء میں دہلی کا مشہور مدرسہ غازی الدین کالج میں تبدیل ہو گیا۔ تو مولانا رشید الدین خاں صاحب سو روپیہ ماہوار پر اس مدرسہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اور مولانا مملوک علی صاحب پچاس روپیہ ماہوار پر نائب مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے تقرر کی تاریخ یکم جون ۱۸۲۵ء ہے۔ ۸ر نومبر ۱۸۴۱ء کو مسٹر ٹامس کی سفارش سے آپ صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ مسٹر ٹامس لکھتا ہے۔

"وہ عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں اور شہر میں ان کا بہت احترام ہے۔"

۱۸۴۲ء میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے۔

۱۱ر نومبر ۱۸۴۵ء کو دلّی دربار کے موقعہ پر گورنر جنرل نے حضرت مولانا کو انعام مرحمت

مرحمت فرمایا۔ اس زمانہ کے مشاہیر علماء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ان ہی میں سے حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور سرسید احمد خاں بھی ہیں۔ الخ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا سلسلہ نسب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا سلسلہ نسب محمد فتح پر جاکر مل جاتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے دونوں حضرات میں صرف چھ یا سات مہینہ کا فرق تھا۔ حضرت قاسم العلومؒ آپ سے چھ یا سات مہینے بڑے تھے۔ علاوہ سلسلہ نسب کے دونوں حضرات میں دوسرے رشتے بھی ہیں۔ یعنی دونوں ہم زلف بھی ہیں۔

ابتدائی تعلیم دونوں نے نانوتہ کے مکتب میں حاصل کی ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ ۱۲۵۹ھ میں دونوں حضرات کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو کافیہ شروع کرایا۔ اور آپ کو گلستان اور میزان الصرف شروع کرائی۔

حضرت مولانا مملوک علی صاحب استاذ المشائخ ہیں۔ دہلی کے عربی کالج میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور دیگر اکابر ہند کے استاذ ہیں۔ مفتی صدر الدین صاحبؒ آزردہ۔ اور شاہ عبد الغنی صاحبؒ کے معاصرین میں سے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے بہترین ادیب اور شاعر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دہلی میں خواجہ میر دردؔ، مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ وغیرہ اساتذۂ سخن کی مجالسِ شعر گرم رہتی تھیں۔ آپ بھی ان میں شرکت فرماتے تھے۔

تبحر علمی

حدیث شریف آپ نے بھی شاہ عبد الغنی صاحبؒ سے پڑھی ہے معقولات منقولات غرضکہ تمام فنون میں آپ اپنے دونوں ساتھیوں یعنی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا قاسم العلومؒ سے کم نہ تھے۔ ذکاوت

و ذہانت اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عنایت فرمائی تھی اس پر طرہ یہ کہ طلب علم کا بے انتہا شوق تھا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے ۔

" میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے ۔ اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی " (قصص الاکابر ص ۳۲)

ملحدین اور معترضین کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔

" گراموفون کی ایجاد سے منکرین کی گردنیں پست ہو گئیں ۔ پس اسی طرح جنت میں اگر گھوڑا اور چوکھٹ بولیں تو کیا بعید ہے ۔"

آپ بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو ہنسی مذاق میں حل فرما دیتے تھے ۔ چنانچہ کسی صاحب نے آپ سے مسئلہ پوچھا حضرت! مُردے کو اس کی لاش جلانے سے کیا تکلیف ہوتی ہے ؟ ارشاد فرمایا جی ہاں ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسی تمہیں اپنی رضائی جلنے سے ہوتی ہے ۔

ایک شخص نے آپ سے سوال کیا ۔ کہ حیض میں عورت کو نمازیں تو بالکل معاف ہیں ۔ مگر روزے قضا رکھنے پڑتے ہیں ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ ارشاد فرمایا ۔ کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ پر عمل نہ کروگے تو سر پہ اتنے جوتے لگیں گے کہ بال بھی نہ رہیگا ۔ بعد کو ایک طالب علم سے فرمایا ۔ بھائی وہ جاہل کو جواب دیا تھا ۔ تمہیں یہ جواب نہیں ہے ۔ اس میں حرج واقع ہوتا ہے ۔ آپ کا ایک شعر ہے ۔

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم
والسیف ابلغ واغلظ علی القسم

اور ارشاد فرمایا وانزلنا الحدید فیہ باسٌ شدیدٌ میں حدید سے مراد نعل دار جوتہ ہے ۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ لوہا تہدید و تخویف کا باعث ہے ۔ نعل دار جوتہ میں بھی یہی وجہ موجود ہے ۔

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے عالم بیمار ہوئے اور باوجود جواز تیمم و اقرار وضو ہر
کے وضو ہی کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ مولانا خیال تو فرمایئے اس کے کیا معنی ہیں۔ ؟
اس کے معنی تو یہی ہوئے کہ تیمم طہارت ناقصہ ہے۔ جب ہی تو آپ نہیں کرتے۔ اور
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، طہارتِ کاملہ ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ ہجرت اس دار الکفر سے فرض ہے جو دار الخوف ہو۔
اور اگر دار الکفر دار الامن ہو تو ہجرت فرض نہیں ہے۔ اس ارشاد سے یہ شبہ بھی
دور ہوگیا۔ کہ ہندوستان اگر دار الکفر ہے تو یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کی جاتی۔
اس کے بعد ارشاد فرمایا دار الکفر سے دار الایمان کی طرف ہی ہجرت ضروری نہیں ہے۔
بلکہ اگر دار الکفر سے دار الامن کی طرف بھی ہجرت کرلی۔ اگر چہ وہ دار الکفر ہی کیوں نہ ہو۔
ہجرت کا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ جب مکہ معظمہ دار الکفر تھا تو وہاں سے صحابہ نے حبشہ
کو ہجرت کی لیکن وہ دار الایمان نہیں تھا دار الکفر ہی تھا۔ البتہ دار الامن تھا۔ اسی
وجہ سے ان صحابہ کو جو حبشہ ہجرت کر کے پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے ذو ہجرتین
کہا جاتا ہے۔

آپ قرآن وحدیث سے اخلاقی تعلیم بہت زیادہ مستنبط کیا کرتے تھے۔ ارشاد
فرمایا۔ خوف اور ڈر کے وقت کسی قریبی مکان میں چھپنا چاہیئے۔ کیونکہ تلاش کرنے
والے دور دور تلاش کریں گے، قریب کوئی تلاش نہ کرے گا۔ ہمیں تو فعل نبی علیہ
الصلوٰۃ والسلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہجرت کے وقت مکہ معظمہ کے قریب
غار ثور میں جاکر پوشیدہ ہوئے تھے۔ ارشاد فرمایا:۔

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (خوف نہ کیجئے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔)
فرمایا کہ حزن کے معنی خوف کے ہیں۔ مگر شیعہ حضرات حزن کے معنی شور و غل کے
کرتے ہیں۔ اگر چہ اس کا مطلب کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس صورت میں تو ان

لوگوں نے خدا کو بھی رسول کا دشمن ثابت کر دیا۔ نعوذ باللہ منہا یعنی شور و غل نہ کرو، اللہ تعالیٰ ہمارے شور و غل کو سن لیں گے۔ (نعوذ باللہ منہا)[1]

ذوقِ ادب یا شاعری

ادب و شعر و شاعری کا بھی آپ کو شوق تھا۔ گمنام تخلص فرماتے تھے۔ ایک نعتیہ کلام میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

گمنام را اندر جہاں پس کیست فرماں ملجائے
رفت از در تو محروم اگر یا رحمۃ اللعالمین

حضرت مولانا قدس سرہٗ اگرچہ اس فن میں کسی کے شاگرد نہ تھے اور نہ اس سے زیادہ شغف ہی تھا۔ کبھی کبھار اگر طبیعت حاضر ہوئی بلا تکلف کچھ لکھ دیا ورنہ بس، اس پر بھی طرہ یہ کہ اساتذہ سخن کا کلام آپ کے کلام کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

غزل

کاش پیدا نہ میں ہوا ہوتا ۔۔۔ کاش شیدا نہ میں ہوا ہوتا
کاش ہوتا جو تھا وہ سب ہوتا ۔۔۔ ایک رسوا نہ میں ہوا ہوتا
مرضِ عشق ہے نصیب اگر! ۔۔۔ کاش اچھا نہ میں ہوا ہوتا
دیکھتا شمع روئے یار کو اور ۔۔۔ اس کا پروانہ میں ہوا ہوتا
اور سب کچھ تو ہوتا اے گمنام ۔۔۔ کاش پیدا نہ میں ہوا ہوتا

نظم

دیدہ جو یائے دید ہے ہر دم ۔۔۔ آہ حسرت مزید ہے ہر دم
چشم بر راہ گوش بر آواز ۔۔۔ بے سبب انتظار کے انداز

---

[1] قصص الاکابر۔

کس کی حسرت کروں رہا کیا ہے — غم کروں کاہے کا گیا کیا ہے
بوئے یوسف کہیں سے آجائے — جس سے چشم سفید کھل جائے
نہیں آئے بہت ہوئی دوری — کب تلک یہ رہے گی مہجوری
جان ہو تم مگر بدن سے دور — روح تازہ ہو خشک تن سے دور
کام بنتا نہیں کوئی ہم سے — ربط رہتا ہے درد اور غم سے
کوئی صورت نہیں یہاں ظاہر — جس سے ہو کچھ تسلی خاطر
کوئی مشفق کہ چارہ ساز رہے — کوئی محبوب جاں نواز رہے
جب یہ سب کچھ نہیں تو اے گمنام — کیا عجب ہے کہ تو رہے ناکام

فارسی

اے آشنائے کوئے محبت صبور باش — بیداد نیکواں ہمہ بر آشنا رود
آرزو دارم کہ خود را بر ورش قرباں کنم — تا مگر روزے بہ پرسد آنکہ قرباں شد کہ بود

عربی

یارب صل علی النبی محمد — یٰسین وطٰہٰ ذی المکارم احمد
بابی وامی ذا الرسول الاکرم — نفسی الفداء وما ملکت یدی
الیوم یا اصلی و یا کل المنیٰ — وشفاعتی ونجاح نفسی فی الغد
انت الکریم رؤفنا ورحیمنا — یا سیدی یا سیدی یا سیدی
فبجبہ ارجو النعیم بجنتہ — وخطیت فی الدنیا بعیش ارغد
فی فرحۃ من حبہ ومسرۃ — لا زالت مذ ادعی باسم محمد[1]

منظوم کلام کے علاوہ آپ کے مکاتیب اور سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحبؒ تہذیب الاخلاق اور آب حیات سے کہیں زیادہ اونچے درجہ کی نثریں ہیں۔

---

[1] از رسالہ دار العلوم ۱۳۷۴ھ

سلوک وتصوّف آپ مرید اور خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کے ہیں۔ حالت جذب آپ پر بہت زیادہ طاری رہتی تھی۔ اسی وجہ سے اپنے زمانہ میں مجذوب وسالک مشہور تھے۔ آپ کو کشف بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اور اس کو بلا دریغ بیان فرما دیا کرتے تھے۔

جس زمانہ میں ملکہ کی تاجپوشی کا جلسہ ہوا اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب دلّی میں تھے اور اکثر غائب رہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کہاں غائب رہتے ہیں۔ فرمایا مجھے حکم ہوا ہے کہ دلّی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا اس جگہ کو آباد کردیں گے۔ اس لئے شہر اور حوالی شہر میں گشت کیا کرتا ہوں۔ تاکہ ویران مقامات آباد ہوجائیں۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جہاں جہاں آپ کا قدم گیا دلّی آباد ہوگئی۔)

جس زمانے میں مولانا احمد حسن صاحب امروہوی مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھاتے تھے۔ آپ امتحان کے لئے تشریف لے گئے۔ ایک عورت اپنے نابینا بچے کو لیکر حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا حضرت! اس کو اچھا کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا نعوذ باللہ میں حضرت عیسیٰؑ نہیں، جو اندھوں کو بینا اور مبروصوں کو تندرست کردوں۔ اور چلدیئے۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے۔ کہ آپ کو الہام ہوا۔ کہ تو کون، عیسیٰؑ کون اور موسیٰؑ کون؟ جا اس کے منہ پر ہاتھ پھیر دے۔ ماسکنیم ماسکنیم کہیں آپ واپس ہوئے۔ اور ما ئی کنیم، ما ئی کنیم، کہتے جاتے تھے اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ فوراً ہی بچہ سوانکھا ہوگیا۔

جس وقت دیوبند کے مدرسہ پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان کچے ہیں اور ان پر چھپر پڑے ہوئے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمد للہ مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔

باوجود ان کمال مکشوفات وکرامات کے آپ غایت درجہ متواضع تھے۔

ایک مرتبہ آپ گنگوہ تشریف لے گئے تو پاجامہ میں کمربند کی بجائے بان ڈال رکھا تھا حضرت گنگوہیؒ نے دریافت کیا۔ کہ یہ کیا؟ ارشاد فرمایا کہ جلدی کی وجہ سے کمربند ہاتھ نہ آیا تھا۔ اس وجہ سے اس کو ڈال لیا تھا۔

آپ کے اخلاق وعادات اور کشف وکرامات کے متعدد واقعات مشائخ دیوبند کی زبانی منقول ہیں۔ امیرالروایات اور قصص الاکابر میں بھی بکثرت حکایات آپ کے متعلق موجود ہیں۔

سلسلہ تدریس تحصیل علم سے فارغ ہوکر آپ اجمیر شریف تیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہوکر تشریف لے گئے۔ اجمیر کے پرنسپل نے آپ کی ذکاوت اور ذہانت دیکھ کر آپ کے لئے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ منظور کرایا۔ لیکن آپ نے انکار کردیا۔ بعدازاں سو روپیہ ماہوار پر آپ کو بنارس بھیجدیا گیا۔ وہاں سے پھر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ پر ضلع سہارنپور تشریف لائے۔ کچھ عرصہ کے بعد ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو آپ گھر ہی موجود تھے۔ اسی ہنگامہ میں حضرت مولانا قاسم العلومؒ کے اشتباہ میں پولیس نے آپ کو گرفتار کرلیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ منجانب اللہ مجھے متنبہ کیا گیا ہے۔ کہ شریک کیوں نہیں ہوا بالآخر چھوڑ دیئے گئے۔

ایام غدر کی چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔ کہ جب میں نے کام نہیں کیا تو کیوں لوں۔ جب دارالعلوم قائم ہوا تو چالیس روپے مشاہرہ پر دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب دیوبندیؒ۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ۔ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ وغیرہ آپ کے ممتاز تلامذہ

لہ ملاحظہ فرمایئے نقش حیات جلد ثانی

میں سے ہیں۔ سوانح عمری حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے علاوہ آپ کی کوئی تصنیف میری نظر سے نہیں گذری۔ البتہ آپ کے مکتوب اور منظوم کلام مختلف رسالوں میں ملتے ہیں۔

حج اور وصال

آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ساتھ دونوں حجوں میں شریک رہے۔ ۱۳۰۲ھ شب شنبہ یکم ربیع الاول کو آپ ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور شب دوشنبہ کو تقریباً ایک بجے وفات پائی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

نانوتہ میں باغ نو میں لب سڑک آپ کا مزار مقدس ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ روز آپ کے مراتب علیہ میں ترقی فرمائے اور قبر کو نور سے منور کرے۔ (آمین)

ظرافتِ طبع

آپ نہایت لطیف مزاج کے مالک تھے۔ خوبصورت، خوب سیرت اور خوش لباس بزرگ تھے۔ بات بات میں ظرافت بھری ہوتی تھی۔ بطور نمونہ چند پیش کرتا ہوں۔

(۱) فرمایا کہ مولوی فوجیوں سے کم نہیں، وہ پلٹن اور رسالہ سے لڑتے ہیں اور یہ کتاب اور رسالہ سے۔

(۲) ایک ہندو مجسٹریٹ جس کے پلک اور بھویں سب صاف تھیں اس کو فارغ البال فرمایا کرتے تھے۔

(۳) جنت کے بارے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جنت میں چھوٹی سی خدائی ہوگی۔ جو چاہا ہوگیا۔

(۴) مولانا کے ایک خادم عبداللہ تھے۔ ان سے مولانا کے گھر میں سے کچھ کہا۔ کہ مولانا سے یہ بات کہو۔ وہ بھاگ کر آئے کہ سانس پھول گیا اور صرف اتنا لفظ کہہ سکے کہ اجی حضرت! یوں کہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ بات یاد رکھنے کا

اہتمام نہ ہوا بھاگنے کا اہتمام کیا۔

(۵) کھٹمل کا ترجمہ فرمایا کرتے تھے 'چارپائی کا پہلوان'

(۶) فرمایا کہ غیر مقلدوں کا مذہب رخصتوں کا مجموعہ ہے۔ وتر اور تراویح کی روایتوں میں سے ایک اور آٹھ والی روایت لی۔

(۷) آپ کے بستر پر اگر کوئی لیٹ جاتا تو بتلا دیتے تھے کہ مرد لیٹا ہے یا عورت۔

(۸) جس وقت دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا تو علی گڈھ کے انگریز پرستوں نے کہا اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ چند قل اعوذ یئے اور بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے دعا کی۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کا عملی جواب تو ہی دے۔ اور فرمایا کہ مجھ سے وعدہ کرلیا گیا ہے۔ کہ دیوبند کے کسی بھی فارغ التحصیل کی دس روپیہ ماہوار سے کم آمدنی نہ ہوگی الخ سو فضلاء دارالعلوم دیوبند کو کبھی فاقہ کی نوبت نہیں آتی جبکہ بی۔اے، ایم۔اے پاس جوتیاں گانٹھتے پھرتے ہیں۔ اور بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔

(۹) ارشاد فرمایا کہ ایک مسجد کی محراب پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

چراغ و مسجد و محراب و منبر
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

چنانچہ ایک شیعہ کا اس طرف گذر ہوا۔ اور شعر پڑھ کر غصہ میں بھر گیا اور لفظ حیدر کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ حضرت! ہم آپ کی خاطر لڑتے پھرتے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ ان ہی تینوں کے ساتھ ہیں۔ اور فوراً لفظ حیدر کو چھیل دیا۔

(۱۰) دیوبند میں ایک آدمی کے ذہن پر تخیل کا غلبہ تھا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ پلاؤ کے تصور سے پلاؤ کا مزہ آتا ہے۔ چنانچہ انھیں وہم ہوگیا تھا۔ رضائیاں سر

پر باندھے پھرا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ میرا سر غائب ہوگیا ہے۔ ایک دن حضرت مولانا قدس سرہٗ سے بھی ملاقات ہوگئی۔ مولانا نے پوچھا تو وہی ہانکا۔ تب آپ نے جوتا نکال کر کھوپری پر مارنا شروع کیا۔ تو چلّایا۔ ہائے مرگیا، ہائے مرگیا۔ مولانا نے فرمایا۔ کہ چوٹ کہاں لگی تھی۔ تو عرض کیا۔ سر میں۔ مولانا نے فرمایا۔ سر تو ہے نہیں۔ کہنے لگا۔ ہاں ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

از ۱۲۴۴ھ تا ۱۳۲۳ھ

گنگوہ گنگوہ ضلع سہارنپور کا قدیم قصبہ ہے۔ زمانہ قدیم سے بڑے بڑے اولیاء اللہ کا مولد اور مدفن رہا ہے۔ سہارنپور سے تقریباً ۲۲ میل اور تھانہ بھون سے ۱۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔ شاہی زمانہ میں اچھی حالت پر تھا۔ شاہ عبدالقدوس، اور شاہ بوسعید قدس اللہ اسرارہما کا یہی وطن تھا۔ اور اب بھی ہر دو حضرات اسی کی مقدس خاک میں مدفون ہیں۔ جب سے شاہان اسلام کا اقتدار ختم ہوگیا۔ دنیاوی اعتبار سے یہ قصبہ بھی زوال پذیر ہوگیا۔ آب وہوا کے اعتبار سے مرطوب خطہ ہے کیونکہ گنگا اور جمنا دونوں کا دوآبہ ہے تاہم آب وہوا نہایت خوش گوار ہے ہمیشہ سے شرفاء کی آبادی رہا ہے۔

ولادت ونسب آپ کی ولادت باسعادت قصبہ گنگوہ محلہ سرائے متصل خانقاہ شاہ عبدالقدوس صاحبؒ حضرت مولانا ہدایت احمد صاحب کے گھر میں ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ بروز دوشنبہ بوقت چاشت ہوئی۔ معرکہ بالاکوٹ سے دو سال قبل یعنی ۱۲۴۴ھ میں (معرکہ بالاکوٹ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء میں ہوا ہے)

والد ماجد کا نام مولانا ہدایت احمد ہے ۔اور والدہ ماجدہ کا نام کریم النساء بنت فرید بخش ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا ملا ہے۔ والد صاحب کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے جس کو آپ نے خود بیان فرمایا ہے۔

مولانا رشید احمد صاحب بن مولانا ہدایت احمد صاحب بن قاضی پیر بخش صاحب بن قاضی غلام حسن صاحب بن قاضی غلام علی صاحب بن قاضی علی اکبر صاحب بن قاضی

محمد اسلم صاحب الانصاری الایوبی رحمہم اللہ تعالیٰ

اور والدہ ماجدہ کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے ۔

مولانا رشید احمد صاحب بن مسماۃ کریم النساء بنت فرید بخش صاحب بن غلام قادر بن محمد صالح بن غلام محمد بن فتح محمد بن تقی محمد بن صالح محمد بن قاضی محمد کبیر انصاری بن قاضی امین الدین بن خواجہ فرید بن خواجہ شاہ بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤ الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ بڈھا بن خواجہ عبدالمجید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن اسماعیل بن خواجہ عبداللہ بن خواجہ ابو منصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ جعفر بن ابی منصور بن ایوب بن الشیخ ابی ایوب الانصاری مدنی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

آپ کا سلسلہ نسب دادی کی طرف سے گیارہویں پشت پر شیخ المشائخ شاہ عبدالقدوس سے اس طرح جا ملتا ہے ۔

مولانا رشید احمد صاحب بن مولانا ہدایت احمد صاحب بن قاضی پیر بخش صاحب بن مسماۃ بولی بنت محمد صلاح بن محمد صالح بن الشیخ عبدالاحد بن محمد طاہر بن فتح اللہ بن عبدالصمد بن عبدالحمید بن شیخ المشائخ شاہ عبدالقدوس صاحب رحمہم اللہ تعالےٰ۔

حضرت شاہ عبدالقدوس کا وصال ۲۳ جمادی الاول ۹۴۵ھ میں ہوا ۔ شاہ عبدالقدوس خاندان چشتیہ صابریہ کے تابندہ چشم و چراغ اور نہایت ہی اعلیٰ وارفع درجہ کے اولیاء عظام میں سے ہیں ۔ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں ۔

"شیخ عبدالقدوس مرید شیخ محمد شیخ عبدالقدوس صاحب مرید شیخ محمد

بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق است — بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق کے ہیں۔
صاحب علم و عمل و ذوق و حالت و حلاوت — صاحب علم و عمل اور ذوق و حالت و
ذوجد و سماع ؎ — حلاوت و وجد و سماع ہیں۔

بہت بڑے صاحب حال تھے۔ تمام رات ذکر میں مشغول رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔ ان کا ذکر جتنا بڑا تھا اتنا ہی بڑا حال تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں آج بھی پہونچ کر محرومی نہیں ہوتی۔

حضرت شاہ عبدالقدوس صاحبؒ نے اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ کی شرح اس شعر میں کی ہے ؎

عاشق حسن خود است آن بے نظیر
حسن خود با خود تماشہ می کند

تعلیم و تربیت

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ہدایت احمد صاحب شیخ غلام علی صاحبؒ کے خلیفہ و مجاز تھے۔ ابھی حضرت مولانا کی عمر شریف سات سال ہی کی تھی کہ والد صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا یعنی ۱۲۵۲ھ میں شہر گورکھپور میں انتقال ہوگیا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد آپ کی تمام تعلیم و تربیت کا بار بزرگ والدہ محترمہ (جو ایک راسخ العقیدہ مومنہ تھیں) اور دادا قاضی پیر بخش صاحب کے ذمہ آگیا۔ دادا صاحب کے وصال کے بعد آپ کے ماموں صاحبان نے آپ کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی لی۔ آپ کے چار حقیقی ماموں تھے۔ مولانا محمد نقی (جو حضرتؒ کے خسر بھی ہوتے ہیں) مولانا محمد تقی صاحب مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب ان چاروں میں مولانا عبدالغنی صاحبؒ کو اپنے اس یتیم بھانجہ سے سب سے زیادہ

ؔ اخبار الاخیار ص۲۱۳

محبت تھی۔ اور اپنی اولاد سے زیادہ برتاؤ کرتے تھے۔

حضرت نے ابتدائی طور پر الف با تا گنگوہ کے ایک میاں جی صاحب کے سامنے پڑھی۔ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا عنایت احمد صاحب سے پڑھیں (حضرت کے ایک چھوٹے بھائی سعید احمد صاحب کا انتقال ایام طفولیت ہی میں ہو چکا تھا) اور فارسی کی بقیہ بڑی کتابیں اپنے منجھلے ماموں مولانا محمد تقی صاحب اور مولانا غوث محمد صاحب سے بھی پڑھیں۔ اس کے بعد آپ کو عربی کا شوق ہوا تو ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں مولانا محمد بخش صاحب رامپوری[1] سے پڑھیں۔

مولانا محمد بخش صاحبؒ کی ترغیب سے ہدایۃ النحو پڑھ کر بعمر ۱۷ سال ۱۲۶۱ھ میں تحصیل علم کے لئے دہلی کا سفر کیا۔ اور چند دنوں قاضی احمد الدین صاحب پنجابی سے کچھ پڑھا۔ اور اسی سال ۱۲۶۱ھ میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہاں دل جمعی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ حضرت مولانا نانوتوی ۱۲۶۰ھ میں دہلی پہنچ چکے تھے اور شروع سے مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد علم نبوت کے دونوں شمس وقمر ایک ساتھ ہو گئے اور تاحیات ساتھ رہے۔

یہ دونوں شمس وقمر استاذ کل مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں عرصہ تک پڑھتے رہے۔ معقولات کی مشکل اور اونچی کتابیں صدرا، شمس بازغہ، میرزاہد قاضی وغیرہ ایسے پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل پڑھا کرتا ہے۔ ذکاوت وذہانت میں یہ دونوں صاحب دہلی میں مشہور ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے استاذ خصوصاً حضرت مولانا مملوک علی صاحب کو ان دونوں سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اگر طبیعت ناساز ہوتی تو عیادت فرماتے اور قیام گاہ پر جاکر پڑھاتے تھے۔ معقولات میں کچھ کتابیں آپ نے

---

[1] رامپور منہیاران ضلع سہارنپور، گنگوہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے۔

مفتی صدرالدین صاحب سے بھی پڑھی ہیں۔

علمِ حدیث

علم حدیث آپ نے ہندوستان میں خاندان ولی اللّٰہی کے آخری چشم وچراغ عمدۃ العلماء راس الاتقیاء حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی و مہاجر مدنی سے حاصل کیا ہے۔ شاہ صاحب علم ظاہر وباطن میں شہرۂ آفاق ہیں۔ ابن ماجہ پر انجاح الحاجۃ آپ ہی کا حاشیہ ہے۔

آپ نے غدر کے قضیہ میں وصال سے چند سال قبل ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔ اور عرصہ تک حرم نبوی میں حدیث پڑھاتے رہے۔ بالآخر ۶ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ اور جنت البقیع میں قبۂ عثمانی کے متصل مدفون ہوئے۔

حدیث شریف آپ نے اپنے والد ماجد شاہ ابوسعید صاحبؒ اور شاہ اسحٰق صاحبؒ سے پڑھی۔ ہر دو حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب بن شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے شاگرد رشید ہیں۔

مشکوٰۃ شریف مولانا مخصوص اللہ صاحب بن شاہ رفیع الدین صاحب بن شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کو پڑھ کر سنائی۔ مدینہ منورہ میں آپنے بخاری شریف کا کچھ حصہ حضرت الشیخ محمد عابد السندی ثم المدنی کو بھی پڑھ کر سنایا اور آپ سے سند حدیث حاصل کی۔ اس طرح آپ کو حدیث میں شیخ اسماعیل بن شیخ ادریس لری کی طرف سے بھی اجازت ہے۔

اس طرح سے علماء دیوبند کا سلسلہ حدیث موجودہ زمانہ میں اس طرح شروع ہوتا ہے۔

عن شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی عن مولانا محمود حسن صاحب عن مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی عن شاہ عبدالغنی صاحب عن ابوسعید صاحب و شاہ اسحٰق صاحب وعن شاہ عبدالعزیز صاحب عن شاہ ولی اللہ صاحب

دوسرا سلسلہ یہ ہے۔ عن شاہ عبد الغنی صاحب عن شاہ مخصوص اللہ صاحب عن شاہ رفیع الدین صاحب عن شاہ ولی اللہ صاحب۔

تیسرا سلسلہ یہ ہے عن شاہ عبد الغنی عن شیخ محمد عابد السندی وعن شیخ محمد اسمٰعیل بن شیخ ادریس الرومی۔

الحاصل حضرت گنگوہیؒ ۲۱ سال کی عمر میں تمام علوم وفنون میں کامل ہوگئے۔ سترہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے تھے۔ اور ۲۱ سال کی عمر میں کل چار سال دہلی میں تکمیل علوم کرکے واپس وطن ہوئے اور تب ہی آپ کا عقد ہوا۔ نکاح کے بعد آپ نے قرآن شریف حفظ کیا۔

نکاح آپ کا نکاح آپ کے بڑے ماموں جناب مولانا محمد تقی صاحب کی...... صاحبزادی خدیجہ خاتون سے ہوا۔ مولانا محمد تقی صاحب طریقہ قادریہ میں جناب شاہ سیف اللہ صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ ریاست جھجر میں ملازم تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے۔ آپ نہایت ہی پاک باز اور پاک باطن بزرگ تھے۔ آپ کی صاحبزادی بھی ایک بزرگ خاتون تھیں۔ جس وقت حضرت گنگوہیؒ کا نکاح ہوا۔ تو آپ کی عمر ۲۱ سال اور آپ کی اہلیہ محترمہ کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

بیعت وسلوک حضرت گنگوہیؒ جب دہلی سے واپس تشریف لائے اور وطن عزیز میں قیام پذیر ہوئے تو بمقتضائے طبیعت آپ کو شوق ہوا کہ کوئی طالب علم ذہین مل جاتا تو اس کو پڑھانا ہی شروع کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خواہش کو پورا کیا۔ اور ایک صاحب سید مومن علی صاحب کو بھیجدیا۔ ان ہی ایام میں ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی تحریر دربارۂ مسئلہ روضۂ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں جو جگہ ایک قبر کے لئے افتادہ ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہوں گے۔ شیخ صاحب نے حکم لگایا تھا۔ کہ یہ

قطعی ہے اور اس کا منکر ایسا ہے ویسا ہے۔

یہ تحریر کسی نے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پیش کردی حضرت نے اس پر تحریر فرما دیا۔ کہ سارا ثبوت باحادیث اخبار احاد ہے۔ اس لئے اس سے علم ظنی حاصل ہوگا۔ قطعیت کا ثبوت دشوار ہے۔

یہ جواب جس وقت حضرت شیخ صاحبؒ کی نظر سے گذرا تو جوش و غضب میں بھر گئے اور پھر کیا تھا۔ طرفین سے سوال و جواب شروع ہو گئے۔ بالآخر مولانا گنگوہیؒ نے بغرض مناظرہ ایک بارات کے ساتھ تھانہ بھون کا سفر اختیار کیا۔ اور بارات کے متعلق امور نکاح وغیرہ سے فارغ ہو کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد استفسار آنے کا منشا ظاہر کیا تو حاجی صاحب نے یہ کہہ کر "وہ ہمارے بڑے ہیں" مناظرے سے منع فرمایا۔ چنانچہ آپ نے حاجی صاحب کی بات مان لی۔ اور مناظرے سے باز آئے اور اپنا ارادہ بیعت ظاہر کیا۔ تب حضرت حاجی صاحبؒ نے باصرار و بسفارش حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید بیعت کر لیا۔[۱]

---

[۱] ابتداً حضرت گنگوہیؒ کا رجحان طبع حضرت شاہ عبد الغنی کی طرف تھا چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ نے دریافت کیا کہ میاں رشید احمدؒ اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی بھی تمنا ہے۔ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ حضرت! جی تو بہت چاہتا ہے۔ آپ نے دریافت کیا۔ کہاں اور کس کی طرف میلان ہے؟ حضرت نے جواب دیا کہ حضرت اب تک تو جتنا بھی غور کیا ہے۔ دو حضرات میں سے ایک کا ضرور رہوں گا۔ حضرت شاہ عبد الغنی صاحبؒ کا یا آپ کا الخ (حاشیہ تذکرۃ الرشید وہکذا فی تذکرۃ الرشید ص۲۴)

علاوہ ازیں چونکہ حضرت حاجی صاحب کی توجہات زمانہ طالب علمی ہی میں ان دونوں حضرات (مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ) پر کافی تھیں۔ ہر دو حضرات کو حضرت حاجی صاحبؒ نے جلد بندی (باقی حاشیہ ص۱۳۵ پر)

حضرت گنگوہیؒ کے بیعت ہونے سے پیشتر حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر حضرت گنگوہیؒ کا مرید ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بھاوج آپ کے مہمانوں کا کھانا پکا رہی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھاوج سے فرمایا۔ اٹھو تو اس قابل نہیں ہے کہ امداد اللہؒ کے مہمانوں کا کھانا پکائے۔ اس کے مہمان علماء ہیں۔ اس کے مہمانوں کا کھانا میں پکاؤں گا۔ [۱]

بیعت ہونے کے بعد آپ نے بموجب ارشاد حاجی صاحب ذکر و شغل شروع کیا۔ اور بقول خود "کہ پھر تو میں (مر مٹا)" چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے آٹھویں دن فرمایا میاں رشید احمد جو نعمت حق تعالٰے نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دیدی۔ آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے۔

جب آپ کو بیالیس [۴۲] دن رہتے ہوئے ہوگئے تب آپ نے وطن عزیز کو رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے گنگوہ کے لئے رخصت کرتے وقت خلافت اور اجازت بیعت ان الفاظ کے ساتھ عنایت فرمائی "اگر تم سے کوئی بیعت کی درخواست کرے تو اس کو بیعت کر لینا۔" [۲]

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال ⁂ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۳ کے بعد ملاحظہ کریں)

بھی سکھائی تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی زبانی بہت کچھ تعریفیں بھی سن چکے تھے۔ اور بعض کرامات حضرت حاجی صاحبؒ کی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس وجہ سے بلا پس و پیش اس ملاقات میں اپنا ارادہ بیعت ظاہر کر دیا۔ اور بیعت ہو گئے۔

۱ حضرت مولانا قدس سرہٗ نے اس کی تعبیر میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرما لیا ہے کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کے جملہ متوسلین (بلا توسط ہوں یا بتوسط) سوء خاتمہ سے محفوظ اور ہمیشہ اتباع شریعت کے زیور سے آراستہ ہوں گے (انشاء اللہ)

۲ اس کے جواب میں حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا "مجھ سے کون (باقی حاشیہ ص۱۳۶ پر)

اس خدائی نعمت (کہ جس کے لئے دَر دَر کی خاک چھانی جاتی ہے) کو پا کر جب آپ گنگوہ تشریف لائے تو خانقاہ شاہ عبدالقدوس صاحبؒ کو (جو تین سو سال سے ویران اور خراب وخستہ پڑی تھی مرمت کراکے) آباد کیا اور رات دن ذکر و فکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ صاحب سوانح کا بیان ہے کہ راتوں کو رویا کرتے تھے اور جو لحاف اوڑھا کرتے تھے باراں اشک کی وجہ سے داغدار ہو گیا تھا۔ ؎

شب وصل بھی کیسی شب ہے الٰہی
نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

غرضکہ ذکر الٰہی کی خوشبوؤں نے جب گنگوہ کے کوچہ و بازار اور خانہ و صحرا کو معطر کرنا شروع کر دیا تو ایک نیک بخت سعید طالعت خاتون نے حضرت والا سے بیعت کی درخواست کی لیکن آپ نے انکار فرما دیا۔ اتفاق سے چند دنوں بعد حضرت حاجی صاحب تشریف لے گئے۔ اور خاتون موصوفہ نے موقعہ کو غنیمت جان کر بتوسط حضرت حاجی صاحبؒ پھر درخواست کی بالآخر حضرت حاجی صاحبؒ کی تعمیل حکم میں آپ نے بیعت فرما لیا[1] سلسلہ بیعت میں داخل ہونے والی پر سب سے پہلی خاتون تھیں[2]۔

معمولات | معمولات پر مداومت اور استقامت مشائخ دیوبند کی خصوصی شان ہے۔ اور حقیقتہً یہی کمال ولایت اور علامت عبدیت

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۵ کے بعد ملاحظہ کریں)

بیعت کی درخواست کریگا۔ اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا تمہیں کیا جو کہتا ہوں وہ کرنا۔ (تذکرۃ الرشید ص۵۱)

[1] حضرت مولانا قدس سرہٗ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مجھ کو حضرت حاجی صاحبؒ کی سخت تاکید بیعت کرنے کی ہے اس وجہ سے بیعت کر لیتا ہوں ورنہ جی اندر سے نہیں چاہتا۔ (تذکرۃ الرشید ص۵۲)

[2] گروہ علماء میں سب سے پہلے بیعت ہونے والے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ ہیں۔ جن کا تذکرہ مفصل آئندہ صفحات میں آتا ہے۔

ہے۔ چنانچہ ان مشائخ کے یہاں جو چیز روز اول معمولات میں داخل ہوئی اُس کو ہمیشگی اور دوام حاصل رہا۔ ان حضرات نے احب الاعمال عند اللہ ادومھا کو دل نشین کر کے اعمال میں شانِ محبوبیت پیدا کی اور تقرب اور ولایت کے اعلیٰ منازل کو طے کیا۔
چنانچہ حضرت مولانا قدس سرہٗ کے مجاہدات و ریاضات کا پیرانہ سالی میں یہ عالم تھا۔ کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا۔ دن بھر صائم رہتے۔ اور بعد مغرب ۶ رکعت نوافل کی بجائے ۲۰ رکعات صلوٰۃ الاوابین پڑھا کرتے تھے۔ جس میں تقریباً دو پارے قرآن شریف کے تلاوت فرماتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر جب دولتکدہ برائے تناول طعام تشریف لے جاتے تو اثنا راہ اور گھر ٹھہرنے کے وقفہ میں کئی کئی پارے تلاوت فرمالیتے تھے۔ اور بعد نمازِ عشار تھوڑی دیر استراحت فرماتے اور دو بجے تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ (بعض نے تو آپ کو ایک بجے بھی وضو کرتے دیکھا ہے) اور ڈھائی تین گھنٹے صلوٰۃ اللیل میں مشغول رہتے اور صبح کی نماز سے فارغ ہو کر ساڑھے آٹھ بجے تک اوراد و وظائف ذکر و مراقبہ میں مصروف رہتے، قریب چاشت، نمازِ چاشت سے فارغ ہو کر ڈاک اور جوابات استفتاء میں مصروف رہتے۔ بعد دوپہر کو قیلولہ فرما کر بعد ظہر تا عصر تلاوتِ کلام الٰہی میں مشغول رہتے۔ رمضان شریف میں تو آپ کے یہاں دن رات مساوی ہوتے تھے۔

مطب

امام ربانی حضرت گنگوہیؒ کو دہلی سے آئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا کہ ۱۲۶۷ھ میں آپ کے مطب کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ کی خالہ صاحبہ ورم معدہ میں مبتلا تھیں۔ جس کی وجہ سے اکثر معدہ میں درد رہتا تھا۔ آپ کے ماموں جناب مولانا محمد تقی صاحب حکیم بھی تھے۔ ہر چند علاج کیا، دوائیں پلائیں لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن آپ کی خالہ صاحبہ نے فرمایا۔ بیٹے تو بھی تو عالم فاضل ہے۔ تو ہی کوئی تدبیر سوچ۔ آپ سے اپنی خالہ کی تکلیف نہ دیکھی گئی۔ اور میزان الطب

میں امراضِ معدہ کی فہرست نکال کر ملاحظہ فرمائی۔ اور بعدہٗ ماموں صاحب سے تبادلۂ خیال کیا۔ اور تبلایا کہ خالہ صاحبہ کو ورم معدہ کی شکایت ہے۔ ماموں صاحب نے بھانجے کی فہم پر آفرین و تحسین کی۔ اور علاج شروع ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چند دنوں کے بعد خالہ صاحبہ کو صحت حاصل ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا چاروں طرف شہرت ہوگئی۔ اور دور دور سے پرانے مریض آنے لگے اور شفا پانے لگے۔ آپ کے مطب کے سامنے بڑے بڑے کہنہ مشق اطباء ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے۔ آپ کا طریقۂ علاج نہایت سہل ہوتا تھا۔ علاج عموماً جنگلی جڑی بوٹیوں اور چھال وغیرہ مفرد ادویہ کے ذریعہ سے کیا کرتے تھے[1]۔

الزامِ بغاوت و گرفتاری

جب ۱۸۵۷ء کا ہولناک حادثہ ختم ہوا تو ظالم حکومتِ برطانیہ نے ہراس آدمی کو تختہ دار پر ٹانگ دیا یا گولی کا نشانہ بنا دیا جس کے متعلق ذرا بھی شبہ تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت امام ربانی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے اور مخبری کرنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات مقرر ہوئے حضرت حاجی صاحب نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔ اور یہ دونوں حضرات روپوشی کی زندگی گذارنے لگے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی روپوشی کے حالات مفصلاً ان کے تذکرہ میں بیان کئے جاچکے۔ حضرت امام ربانی حضرت حاجی صاحب سے آخری ملاقات کرنے کے لئے بزمانہ روپوشی جب تھگری تشریف لے گئے تھے۔ تو ان کے پیچھے گنگوہ میں بہت ہڑبونگ مچا۔ اور آپ کے دھوکہ میں آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصر کو

---

[1] اصول کے اعتبار سے طبِ یونانی جتنا بہترین طریقہ علاج ہے دوسرا نہیں ہے۔ و نیز طبیب کے لئے بھی بہت سہل ہے۔ اخلاط اربعہ کو ذہن نشین کرکے امراضِ جزئیہ اور ان کے علل و اسباب پر عبور کرنا نہایت سہل ہے۔ (بندہ غفرلہٗ)

گرفتار کرکے زدوکوب کیا گیا بعد میں چھوڑ دیا گیا۔ جب حضرت امام ربّانی تشریف لائے۔ تو گنگوہ کے حالات سُنے۔ اور عزیز واقارب کے مشورے سے آپ اپنے دادھیال رامپور تشریف لے گئے۔ لیکن مخبر کی خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کرلئے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارنپور جیل کی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ اور حالات وواقعات کی تفتیش ہوتی رہی۔ مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ مفسد ہیں۔ اور مفسدوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حضرت امام ربّانی نے فرمایا "نہ ہم مفسد ہیں اور نہ مفسدوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں۔ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے" سہارنپور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا۔ رہا کر دیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو ابھی کام لینا تھا۔ اور آپ کے ذریعہ ان افراد کو پیدا کرنا تھا کہ جن کے ذریعے آئندہ زمانہ میں ظالم حکومت کا تختہ لوٹے گا۔ اس وجہ سے ظالم حکومت آپ کا بال بیکا نہ کر سکی۔

زمانۂ حبس میں بہت سے قیدی آپ کے معتقد ہوگئے تھے اور بہت سے تائب ہوکر بیعت بھی ہوگئے تھے۔ ہمیشہ جیل خانہ میں نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے ان ایام میں حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ کی متعدد کرامات عالیہ کا صدور رہا۔

زمانہ جیل میں آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصر صاحب نے آپ کی وجہ سے بہت زیادہ تکالیف برداشت کیں۔ اور آپ کی رہائی کے لئے انتھک کوشش کی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صاف بَری کرا دیا۔ اس کے بعد درس وتدریس اور سلوک و تصوّف میں مشغول ہوگئے۔ اور آئندہ کے لئے ظالم حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے

رضا کار اور بڑے بڑے جرنیلوں اور کرنیلوں اور سپہ سالاروں کو تیار کرنے لگے ۔ اور دارالعلوم دیوبند اور مظاہرالعلوم سہارنپور کی دو مشہور علمی و دینی چھاؤنیوں کی ترقی اور فلاح میں مصروف ہوگئے ۔ رہائی کے تین چار سال بعد آپ نے پہلا حج فرض ادا کیا ۔

زیارت بیت اللہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے تین حج کئے ۔ پہلا حج ۱۲۸۰ھ میں دوسرا حج ۱۲۹۴ھ اور تیسرا حج ۱۲۹۹ھ میں ۔

پہلا حج رام پور کے ڈپٹی عبدالحق صاحب پنشنر کے خرچ سے کیا ۔ ڈپٹی عبدالحق صاحب نہایت مخیر آدمی تھے ۔ اپنے ساتھ بکثرت آدمیوں کو حج کے لئے لے گئے تھے ۔ اور مدینہ منورہ پہنچ کر مع اہل و عیال ... وہیں ہی قیام پذیر ہوگئے تھے ۔

اس حج میں حضرت امام ربانی کے ہمراہ علاوہ رامپوری قافلہ کے حکیم ضیاءالدین صاحب رامپوری مولانا ابوالنصر صاحب (آپ کے ماموں زاد بھائی) معہ اہل کے تھے ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی حاجی امداد اللہ صاحبؒ حیات تھے ۔ آپ حضرت حاجی صاحبؒ کے مہمان رہے ۔ مدینہ منورہ میں شاہ عبدالغنی صاحبؒ موجود تھے وہاں ان کے مہمان رہے ۔ جب واپس ہوئے تو آپ کو خارش ہوگئی ۔ اور اس کی حدت و سوزش کی وجہ سے اسہال شروع ہوگئے ۔ اور ایسی حالت ہوگئی کہ بچنے کی امید نہ رہی ۔

اس علالت میں جناب مولانا ابوالنصر صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ نے وہ وہ خدمات انجام دیں کہ حقیقی بھائی بھی انجام نہیں دے سکتا ۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے ۔ کہ مولوی ابوالنصر کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں کہ جس پر میرا پاخانہ یا پیشاب یا پیپ نہ لگا ہو ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کو آپ سے کام لینا تھا اس وجہ سے واپسی میں اندر رہ پہنچکر حکیم اعظم خاں صاحب ...... کے نسخہ سے آرام ہوا ۔

۲ دوسرا حج

دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں کیا اس سفر حج میں ہندوستان کے مشاہیر علماء ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحبؒ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ برادر حضرت شیخ الہندؒ حکیم محمد اسمٰعیل صاحبؒ حضرت مولانا پیر محمد صاحبؒ، مولانا عبدالعدل صاحبؒ مولانا محمد منیر صاحب مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ۔ مولانا الطاف الرحمٰن صاحبؒ۔ مولانا ظہور احمد صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ ان مشاہیر کے علاوہ اس مقدس قافلہ میں قریباً سو افراد تھے۔ مکہ معظمہ میں یہ قافلہ حضرت حاجی صاحبؒ کا مہمان رہا اور مدینہ منورہ میں شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے یہاں مہمان رہا۔

۳ تیسرا حج

تیسرا حج آپ نے ۱۲۹۹ھ میں کیا۔ اس حج میں آپ کے ہمراہ حاجی ظہور احمد صاحبؒ اور منشی تجمل حسین صاحب تھے۔ اس کے بعد آپ نے اور کوئی حج نہیں کیا۔ بلکہ گنگوہ شریف تشریف لاکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اسی حج کے بعد آپ نے دوسرے علوم کا درس کم کر دیا تھا اور بالاستقلال دورۂ حدیث شروع کرا دیا تھا۔ ایک سال میں صحاح ستہ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد، نسائی) پڑھاتے تھے۔

سلسلہ تدریس

آپ کے والد صاحب محترم بزمانہ ملازمت گورکھپور تا حیات ماہانہ خرچ روانہ فرماتے رہتے تھے۔ گھر میں دادا صاحب کے ہاتھ میں انتظام تھا۔ والد صاحب محترم تاکید فرماتے رہتے تھے کہ خرچ سے جو روپیہ پس انداز ہو اس سے مکان یا دوکان یا دوسری چیزیں خرید تو سکتے ہو لیکن رہن کا سلسلہ ہرگز نہ کیا جائے۔ لیکن آپ کے دادا قاضی پیر بخش صاحب اتنے متقی پرہیزگار نہ تھے۔ دنیاوی منفعت کی طرف بھی نظر جاتی تھی۔ اس لئے متعدد قطعات آراضی

رہن رکھ لئے تھے۔ لہٰذا جب قاضی پیر بخش صاحب کا انتقال ہوا اور انتظام حضرت امام ربانی رح کے ہاتھ میں آیا۔ تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آمدنی وصول یابی سے دستاویزات کا میلان کیا اور مالکانِ آراضی کا حساب صاف کرکے سب کی آراضی اور دیگر اشیاء واپس کر دیں۔ اس میں یہاں تک ہوا کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کا زیور تک فروخت ہوگیا۔ بہرحال جوں توں کرکے حساب صاف کیا گیا۔

اس کے بعد گھر والوں کے طعنوں کی بھرمار شروع ہوئی۔ اور گھر کے اخراجات کا چلنا مشکل ہوگیا۔ تب آپ نے سہارنپور کے مشہور رئیس شائستہ خاں کے یہاں ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دس روپیہ ماہوار کی ملازمت کرلی۔ چھ ماہ تک یہ سلسلہ چلا۔ بالآخر آپ نے اس ملازمت کو بھی ترک کر دیا اور اللہ پر توکل فرما کر گنگوہ ہی میں قیام فرمایا۔ اور یہیں درس وتدریس اور مطب کا سلسلہ فی سبیل اللہ شروع کردیا۔

حضرت رح کے توکل کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک انگریز تفتیش حال کے لئے آیا۔ اور دریافت کیا۔ کیا کرتے ہو؟ فرمایا کچھ نہیں۔ ملازمت، تجارت، کاشت سب کی نفی کردی۔ اس نے پوچھا آخر کچھ کرتے بھی ہو۔؟ فرمایا توکل۔ انگریز چپ ہوا اور آخر میں دس دس روپے کے دو نوٹ پیش کئے۔ تب فرمایا۔ میں یہ کرتا ہوں۔

دورۂ حدیث

یوں تو آپ کو تمام علوم مروجہ۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ اسماء الرجال، منطق، فلسفہ میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اور آپ تمام علوم کے بحر ذخار تھے۔ لیکن احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آپ کو بہت زیادہ شغف تھا۔ آپ نے ۱۴ مرتبہ سے زائد ہدایہ کو پڑھایا ہے۔ آپ کے یہاں دورۂ حدیث کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ جب تک آپ نابینا ہوئے (یعنی آپ کی ظاہری بصارت ختم ہوئی) اس وقت تک برابر آپ کے یہاں دورہ حدیث ہوتا رہا۔ احادیث میں صحاح ستہ کا دورہ کراتے تھے۔ ہاں اگر کسی جگہ بات تفصیل طلب ہوتی تو اس کی

ضرور تشریح فرماتے فن حدیث میں آپ کی تقریر "الکواکب الدری" مشہور و معروف تقریر ہے جس کو آخری زمانہ میں آپ کے شاگرد رشید اور خادم خاص حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ نے عربی زبان میں تحریر فرمایا ہے۔ باوجود مختصر ہونے کے ترمذی شریف کی ایک جامع شرح اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ حقیقت میں اس کتاب میں حضرت امام ربانی نے مسلک امام ابو حنیفہؒ پر ایسے قوی اور ٹھوس دلائل کو ذکر کیا ہے۔ کہ جن کا تذکرہ متقدمین کی کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا طریقہ درس و حلقہ درس بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ آخری زمانہ میں حضرت شیخ الاسلام کا آپ...... حلقہ درس کے غبی سے غبی طالب علم کے بیجا سوالات سے کبھی برہم نہ ہوتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو محض ترجمہ میں حل فرما دیتے تھے۔ اگر طلباء میں کبھی سستی یا تھکاوٹ محسوس کرتے تو کوئی ایسا لطیفہ بیان کر دیتے تھے۔ کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک مرتبہ بیان فرمایا

"میاں ہم جب دہلی پڑھتے تھے اس وقت کا قصہ ہے۔ ایک سقہ کمر پر مشک لادے قلعی دار کٹورا بجاتا اور جھنکار کی آواز پر لوگوں کو بلا رہا تھا کہ "سبیل ہے سبیل" بہتیرے آدمی آتے اور ٹھنڈا پانی پی پی کر چلے جاتے تھے۔ ایک بیچارہ گنوار بھی دیر سے اس آواز کو سن رہا تھا حیران تھا کہ دہلی میں سب کچھ کھایا، بڑے بڑے مزے کی چیزوں کے نام سنے۔ مگر خدا جانے سبیل کیا چیز ہے۔ اور کیسا مزہ ہے۔ لاؤ اسے بھی پی کر دیکھوں۔ غرض کہ سقہ کے پاس گیا۔ اور ادنک لگا کر بولا۔ بھئی ہمیں بھی سبیل پلاؤ۔ اس نے مشک کا دہانہ کھول دیا وہ غٹ غٹ پینے لگا۔ اتفاق سے پانی کے ساتھ ایک تنکی بھی منہ میں آگئی گنوار اس کو چبا کر نگل گیا۔ جب پی چکا تو اوپر منہ اٹھا کر کہا۔ گل (دشیر) تو اتنا کہ کان بڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور سبیل بس ایک ہی ہے۔"[1]

---

[1] تذکرۃ الرشید ص ۹۱ ج ۱

چنانچہ سب طلباء فرحت وانبساط سے تازہ دم ہو جاتے لیکن بایں ہمہ مجلس کا وقار وہی رہتا۔ حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ کا درس حدیث صرف علم ظاہر تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ اسی میں روحانی اصلاح بھی فرماتے اور وعظ و نصیحت فرماتے، زہد و تقویٰ اور دیگر خصائل کی طرف بھی ترغیب دلاتے اور اپنے باطنی تصرفات سے بھی کام لیتے۔ غرض کہ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہٗ کے حلقۂ درس میں علم و عرفان کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ ذیل میں حضرت قدس سرہٗ کے تفسیری و حدیثی چند نکات درج ہیں۔

س:۔ ایک مرتبہ مولوی میر شاہ خان صاحب نے دریافت کیا۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی تھی۔ کہ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (میری زبان کی گرہ کھول دیجئے کہ لوگ میری بات سمجھنے لگیں) حق تعالیٰ نے قبولیت دعا کا اظہار بھی فرمایا۔ اُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ (تمہاری درخواست منظور ہے اے موسیٰ ع) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کی لکنت عمر بھر نہ گئی۔ جب بات کرتے تو ضغط لسان کے باعث رانوں پر جوش غضب میں ہاتھ مارا کرتے تھے۔

ج:۔ فوراً ہی حضرت امام ربّانی نے جواب دیا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہی ناتمام تھی۔ خود ہی اس کا سوال کیا تھا کہ اتنی گرہ کھول کہ لوگ بات کو سمجھنے لگیں۔ پس جو بات کہتے گو بدقت کہتے مگر لوگ سمجھ ضرور لیتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر يَفْقَهُوا قَوْلِي عرض نہ کرتے تو دعا تام ہوتی اور ساری لکنت جاتی رہتی۔

س:۔ ایک شخص نے دریافت کیا۔ کہ حضرت! اگر وظیفہ شب کو نہ ہو سکے تو دن میں قضا کرنے سے وہی ثواب ملے گا۔

ج:۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیوں نہیں۔ ؟ هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ

خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ (الآیة)

س:۔ حدیث شریف میں وارد ہے:۔ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لاالٰہ الا اللہ کہا اور اسی پر مرگیا جنت میں داخل ہوجائے گا۔

اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ وان زنی وان سرق (گو زنا کرے اور گو چوری کرے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وان زنی وان سرق (ہاں اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے) اس حدیث میں اور ان احادیث میں جہاں فسق وفجور اور محرمات وکبائر کے ارتکاب کی سزائیں بیان کی گئی ہیں، تعارض معلوم ہوتا ہے۔

ج:۔ دخول جنت مطلق ہے اور مطلق کے لئے کسی فرد کا وجود ہونا مطلق کے وجود کو بس ہے۔ پس کلمہ پڑھ کر اور تصدیق جملہ ماجاء بہ الرسول علیہ السلام کرکے اگرچہ ترک اعمال سے فاسق ہے۔ مگر مسلم ہے۔ بعد صفائی معاصی کے دخول جنت کا ہوگا۔ اور حدیث ابوذر رضی کا صدق صاف ظاہر ہوجائے گا۔ اب نہ کوئی حدیث عذاب کی اس کے معارض ہے۔ اور اس سے عذاب کا نہ ہونا فساق کو معلوم ہوتا ہے۔ اب کوئی شبہ نہیں۔ حضرت ابوذر رضی کا بار بار تحقیق کرنا اس واسطے تھا کہ وہ ان افعال کو خلاف اسلام کے جانتے تھے اس واسطے تعجب کرتے تھے کہ وان زنی وان سرق۔ جب آپ نے تاکید فرمادی۔ سمجھ گئے کہ یہ کفر نہیں۔

س:۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تحریر فرماتے ہیں کہ پیشاب کرکے جو کلوخ سے استنجا خشک کرتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ کسی حدیث سے اس کا ثبوت نہیں۔ ایک بار حضرت امام ربانی رح سے دریافت کیا۔

ج:۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ استنزهوا من البول فان عامة عذاب

القبر منہ۔ اور کلوخ لینا یقیناً استنزاہ میں داخل ہے۔

(ماخوذ از تذکرۃ الرشید)

فقہ وافتاء اپنے زمانہ کے فقیہہ بے مثل تھے ہندوستان اور بیرون ہندوستان آپ کے فتاوئ نہایت وقعت اور قبولیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ فقہ دانی میں تو آپ کی مثال فقہاء متقدمین کے طبقہ ہی میں مل سکتی ہے۔ پیچیدہ ترین مسائل چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بلا تامل جواب دیا۔ کہ ایک عورت نے اپنے صغیر سن خاوند کو دودھ پلا دیا۔ پھر کسی دوسرے سے نکاح کر لیا۔ اب اس کی سوکن اس بچے کو دودھ پلائے۔ تو دوسری عورت یعنی بچہ کو پہلی دودھ پلانے والی اپنے موجودہ خاوند پر حرام ہوجائے گی[1]

فقہ وافتاء کا معاملہ تبحر علمی کے علاوہ ذکاوت اور ذہن کی تسلامت روی پر بھی موقوف ہے۔ دل ودماغ اگر آزاد ہے۔ اور صرف صاحب مسلک اور کتاب وسنت کا مقلد ہے کسی کی غلط عقیدت کا طوق اس کی گردن میں نہیں پڑا ہے۔ اور دیانت داری کے ساتھ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس کے فتاوئ میں صداقت اور حقانیت ہی ہوگی لیکن جہاں کسی کا اثر قبول کر لیا تو پھر فتاوئ نویسی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ گویا فتاوئ نویسی پل صراط ہے۔ دشمنی، عناد سے جہاں لے ڈوبتی ہے وہاں اس راہ میں بے جا عقیدت بھی تباہ کن ہوتی ہے پھر تو مفتی کا قلم یا تو عقیدت کیش ہوتا ہے۔ یا جلاد کی تلوار، اس کو مفتی کا قلم کہنا ایک احمقانہ جرم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ اوصاف حضرت گنگوہی کے فتاوئ نویس قلم ہی کو حاصل ہیں۔ ان کا قلم نہ تو لعنت وملامت سے گھبراتا ہے اور نہ دار ورسن سے خائف ہے، اور نہ ہی بے جا اور

---

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۳۳ ج ۱

مجرمانہ عقیدت ہی میں مبتلا ہے۔ بلکہ ان کا قلم خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مطیع اور فقہ حنفی کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے۔ ذیل میں چند ایسے واقعات سپرد قلم ہیں۔ جو اہل حق ہی کے قلم کے لئے مخصوص ہیں۔

قیام میلاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کیؒ قیام میلاد فرماتے .... تھے۔ اور اس کے قائل بھی تھے۔ ان ہی کی اقتدار میں بعض مصالح کی بنا پر حضرت تھانویؒ بھی قیام کانپور کے ابتدائی دور میں اسی پر قائم تھے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے ان کو جواب میں تحریر فرمایا:-

اور امر ثانی کے باب میں اگرچہ سر دست آپ کو بوجہ فرط عقیدت و محبت کے ناگوار گذرے اور اس بندہ کو گستاخ بے ادب تصور کرو۔ مگر حق کہدینے سے مجھے یہ امر مانع نہیں۔ وہ یہ ہے کہ بندہ حضرت شیخ (حضرت حاجی صاحب) سے جو بیعت ہوا ہے۔ اور جتنے اہل علم و ذی فہم قدیم سے بیعت ہوتے رہتے ہیں۔ تو باوجود علم، غیر عالم سے جو بیعت ہوئے اور ہوتے ہیں کہ جو کچھ استادوں سے کتب دینیہ میں انھوں نے پڑھا ہے۔ اور علم حاصل کیا۔ کسی شیخ عارف سے اس علم کو علم الیقین بنالیویں۔ تاکہ عمل کرنا نفس کو اس علم پر سہل ہو جاوے۔ اور معلوم مشہود بن جائے علی حسب استعداد کوئی اس واسطے بیعت نہیں ہوتا۔ اور نہ ہوا تاکہ جو کچھ ہم نے پڑھا ہے۔ اس کے صحت و سقم کو کسی شیخ غیر عالم سے پڑتال لیں۔ اور احکام محققہ قرآن و حدیث کو اس کے قول سے مطابق کرالیں۔ کہ جس کو وہ غلط فرمادیں، اس کو آپ غلط مان لیں۔ اور جس کو وہ صحیح کہیں اس کو صحیح رکھیں کہ یہ خیال سراسر باطل ہے[1]

یہی نہیں بلکہ حضرت حاجی صاحبؒ کی کتاب ہفت مسئلہ جب آپکے پاس پہونچی تو آپ نے

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۲۲

اس کو جلوادیا۔[1] لوگوں نے آپ کے خلاف بہت ہلڑ بپا کیا، اور یہاں تک مشہور کر دیا۔ کہ حضرت گنگوہیؒ کی تو نسبت سلب ہو گئی ہے[2] لیکن آپ نے ذرہ برابر کسی چیز کی پرواہ نہ کی اور بات جو اصل تھی وہ بیان کی۔ حضرت حاجی صاحبؒ رمضان المبارک میں تہجد کی نماز بجماعت کثیرہ ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے حنفی مسلک کے مطابق اس کو مکروہ تحریمی قرار دیا۔[3] اور اس کی پرواہ بھی نہ کی کہ اس کی زد کہاں پڑے گی۔ اور لوگ کیا کہیں گے۔ اسی طرح امکانِ کذب اور کوّے کی حلّت پر آپ نے جو فتاویٰ دیئے، جس کی بنا پر آپ کو نعوذ باللہ کافر اور بے دین تک کہا گیا۔ مگر یہ سب چیزیں آپ کو متاثر نہ کر سکیں۔ آپ کی اس حق گوئی اور مسلک حق کی اختیار و اشاعت کی داستانوں سے تذکرۃ الرشید اور فتاویٰ رشیدیہ اور مکتوبات رشیدیہ بھرے پڑے ہیں۔ بلاشک و شبہ آپ قطب اللہ شاد اور مجدد ملّت تھے۔ حق گوئی اور صاف گوئی میں آپ کو غلط پروپیگنڈہ اور لوگوں کی قلّت و کثرت متاثر نہ کر سکی۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ص ۲ یہ جاہل مریدین کا پروپیگنڈہ ہے جو حضرت گنگوہیؒ کے خلاف ہوا تھا۔ حالانکہ سلب نسبت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پھونک مارتے ہی صاف ہو جائے۔ نسبت دراصل ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو اکثر کثرت ذکر اور عبادت سے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے اس کے لئے کسی سے بیعت ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ کیفیت مخصوصہ صرف معصیت کی وجہ سے تو سلب ہو سکتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"تصوف کے یہ جتنے طریقے اوپر بیان ہوئے ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفس ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو صوفیا نے نسبت کا نام دیا ہے۔ اور اس کو نسبت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے۔

سلسلہ بیعت تھانہ بھون بارگاہ امدادیہ سے حصول اجازت بیعت و خلافت کے چند روز بعد گنگوہ میں ایک نیک خاتون نے آپ سے درخواستِ بیعت کی لیکن آپ نے اس کو منع کر دیا۔ اتفاق سے کچھ دن بعد حضرت حاجی صاحبؒ گنگوہ تشریف لے گئے۔ اور آپ کے مہمان ہوئے تو اس نیک بخت خاتون کو موقع ملا۔ اور حاجی صاحبؒ کی خدمت میں کہلا بھیجا "کہ دیکھئے حضرت! میں مرید ہونا چاہتی ہوں اور مولانا مرید نہیں کرتے" فوراً ہی حاجی صاحب مخاطب ہوئے "کیوں صاحب! سائل کی درخواست کیوں منظور نہیں ہوتی" اور اپنے ساتھ حضرت امام ربانی رحؒ کو اس عورت کے گھر لے گئے اور بیعت کرایا۔ اسکے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور علماء میں سب سے پہلے مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور مولانا صدیق احمد صاحبؒ بیعت ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵ کے بعد ملاحظہ ہو)

طالب جب عبادات طہارات اور ذکر و اذکار پر برابر عامل رہے تو اس کے نفس ناطقہ کے اندر فرشتوں کے مشابہ ایک مستقل صفت اور عالم جبروت کی طرف توجہ کا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے الخ ان نسبتوں کے حصول کا ایک طریقہ یہ اشغال و وظائف ہیں لیکن ان کے علاوہ ان کے حصول کے اور طریقے بھی ہیں الخ (القول الجمیل)

۔ ؎ شیخ الاسلام نمبر میں حضرت مدنی رحؒ کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس میں تداعی کے ساتھ بجماعت کثیرہ رمضان المبارک میں تہجد کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور استدلال میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ کے اعمال پیش فرمائے ہیں۔ اور حضرت گنگوہیؒ کے فتویٰ کو مرجوح قرار دیا ہے۔ حالانکہ حضرت گنگوہیؒ کا فتویٰ بلا شک و شبہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ مسلک حق کا ترجمان بھی ہے جہاں تک حضرت مدنی رحؒ کے فتویٰ کا تعلق ہے۔ میں کیا عرض کروں۔؟ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں تالیف حقیر تذکرہ شیخ الہندؒ)

مریدین کو تعلیم سلوک میں ذکر و شغل و مراقبہ اور نوافل کے علاوہ سب سے زیادہ اتباعِ سنت اور اتباعِ شریعت کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"جتنے اہل علم وذی فہم قدیم سے باوجود علم، غیر عالم سے جو بیعت ہوئے تو اس خیال سے بیعت ہوئے اور ہوتے ہیں۔ کہ جو کچھ استادوں سے کتب دینیہ میں انھوں نے پڑھا اور علم حاصل کیا۔ کسی شیخ عارف سے اس علم کو علم الیقین بنالیویں تاکہ عمل کرنا نفس کو اس علم پر سہل ہو جاوے اور معلوم مشہود بن جاوے" الخ[۱]

جناب مولانا محمد روشن خان صاحبؒ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"اب صریح لکھتا ہوں کہ راہ سنت میں فتور نہ ہونا چاہیئے۔ کمال طریقت و شریعت یہی ہے۔ ورنہ کشف و کرامات وخرق عادات، خلاف شرع کے ساتھ کچھ وقع نہیں رکھتے۔[۲]"

اصلاح کا طریقہ آپ کا نہایت عجیب وغریب تھا عموماً توجہ باطنی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ایک دیہاتی آپ سے بیعت ہوا اور اپنی دیہاتی زبان میں عرض کیا۔ مولبی جی! اور تو ساری چیزیں چھوڑ دوں گا پر اہیم (افیون) نہ چھوڑوں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ جا نہ چھوڑ نا، چنانچہ وہ دیہاتی چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے دل میں خیال ہوا کہ پیر صاحب کے پاس چلنا چاہیئے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ پیر صاحب نے افیون کے بارے میں دریافت کیا تو کیا جواب دوں گا۔ اس خیال سے افیون چھوڑ دی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد آیا۔ اور دو روپے حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ کے دست مبارک پر رکھ دیئے کہ یہ آپ کا نذرانہ ہے۔ حضرت نے دریافت کیا۔ تو عرض کیا کہ حضرت جی! میں نے اہیم چھوڑ دی ہے۔ اور اہیم چھوڑنے سے میرا نفس خوش ہوا کہ دو روپیہ

---

[۱] تذکرۃ الرشید ص۱۲۳ ج ۱ [۲] مکتوبات رشیدیہ ص۱

مہینہ کی بچت ہوگئی۔ لہٰذا میں نے نفس کی مخالفت کی، اِس طرح پر کہ دو روپیہ مہینہ آپ کی خدمت میں پیش کردیا کروں گا۔

استاذ مرحوم حضرت مولانا حامد حسن صاحب گنگوہیؒ (جو حضرت گنگوہیؒ کے زمانہ میں کافی بڑے تھے دیوبند پڑھتے تھے اور حضرت گنگوہیؒ کے صحبت یافتہ تھے) فرماتے تھے کہ جن ایام میں حضرتؒ نے کوّے کی حلّت کا فتویٰ دیا تھا۔ یورپ کے ایک بزرگ نے ایک مُردہ کوّے کو بانس پر رکھ کر نچایا تھا اور استہزا کیا تھا "اب یہ حلال ہے" اللہ تعالیٰ کو یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ اور ان کے قلب کی وہ سب کیفیات جو ذکر کے باعث پیدا ہوئی تھیں ختم ہوگئیں۔ یہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے فرمایا تمہارا علاج گنگوہ کے علاوہ کہیں نہیں ہوسکتا۔ یہ صاحب عازم گنگوہ اسی نیت سے ہوئے اور سہارنپور پہونچتے ہی وہ پچھلی کیفیات عود کر آئیں۔ راقم الحروف کا بہت مرتبہ کا تجربہ ہے کہ قبض کی حالت میں، میں نے جب بھی گنگوہ کا سفر کیا ہے شفا پائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حضرت شاہ محمد یٰسین صاحب نگینویؒ نے بیان فرمائی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کی بھی ایسی تھی جو وہاں رہا کندن بن گیا۔ اور جو ادہر سے صرف گذر ہی گیا وہ بھی محروم نہ رہا۔ وہاں کی تو ہوا ہی کچھ عجیب تھی۔

چنانچہ راقم الحروف کی حضرت گنگوہی رح کے ایک مرید حافظ اللہ دیا صاحب جھنجھانویؒ زید مجدہم سے ملاقات ہوئی۔ موصوف بقید حیات ہیں۔ فرمایا:-

میری عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ میں قرآن پاک حفظ کیا کرتا تھا اور شام کو سامنے والے میدان میں کھیلا کرتا تھا۔ ادھر سے لوگ گذرا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ بڑے مولانا سے بیعت ہونے جارہے ہیں۔ میرے دل میں بھی خیال آیا۔ میں بامرار اپنے خالو کے

له از مواعظ اشرفیہ معنا

سامنے گنگوہ حاضر ہوا۔ حضرت کو ٹیکھا جھلا جا رہا تھا میں نے بھی تھوڑی دیر جھلا
میرے خالو نے میرے لئے بیعت کی سفارش کی۔ حضرت نے تھوڑی دیر اپنے پاس
بٹھایا۔ چند تسبیحات بتلائیں۔ بدعات اور رسومات سے پرہیز کے لئے فرمایا بس
اتنی سی ملاقات تھی۔

میں نے حافظ صاحب سے ملاقات کی ہے۔ باوجود عالم نہ ہونے کے باکمال بزرگ پایا ہے۔
عجیب صحبت تھی جس نے دنیا ہی بدل دی۔ ایک نظر سے اللہ والا بنا دیا۔

ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ؒ نے اپنے ایک عالم مرید کو آپ کی خدمت
میں بھیجا اور تحریر فرمایا "کہ ان کو ہر قسم کے مجاہدات اور ریاضات کرا چکا ہوں مگر معتد بہ
فائدہ نہیں ہوا۔ لہٰذا اب آپ کے پاس بھیجتا ہوں" چنانچہ وہ صاحب گنگوہ حاضر ہوئے۔
حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے دریافت کیا کہ آپ کا کیا مشغلہ ہے۔ جواب دیا۔ کہ
احادیث اور کتب دینیہ کے مطالعہ سے زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہی ؒ نے اس
سلسلہ کو بند کرا دیا۔ اور وہی ذکر و اذکار پھر سے کرائے تو فوراً ہی حالت میں تبدیلی ہوگئی۔
اور منزل مقصود کو پہونچے۔

راوی نے اس جگہ بیان فرمایا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اگر حاجی صاحب ؒ ان صاحب
سے اس مشغلہ کو ترک کرا دیتے تو وہ حاجی صاحب کی طرف سے بدظن ہو جاتے۔ اور یہ
نہ سوچتے کہ علاجاً اس مشغلہ کو ترک کرایا ہے۔ بلکہ یہی گمان کرتے کہ حاجی صاحب ؒ
غیر عالم ہیں وہ حدیث کی قدر کیا جانیں۔ حضرت گنگوہی ؒ کے یہاں ان کا یہ گمان نہیں
چل سکتا تھا کیونکہ حضرت گنگوہی ؒ خود بھی بڑے محدث اور عالم تھے۔ حضرت حاجی صاحب
قدس سرہٗ نے حضرت گنگوہی ؒ کی شان میں بالکل صحیح فرمایا ہے۔

"مولوی رشید احمد صاحب میں اور مجھ میں کچھ فرق نہیں۔ لوگوں کو یہاں آنے
کی کیا ضرورت ہے۔" (سوانحعمری صـ ۱)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں :۔

"آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو، جوں ہی آپ کی صحبت میں بیٹھے، قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی جس سے سب کدورت رفع ہوگئیں۔ اور قریب قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی درستی دین کی پختگی، خصوصاً حب فی اللہ و بغض فی اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ سب برکت آپ کی صحبت کی ہے الخ"

(تذکرۃ الرشید ص۱۲۵ ج ۲)

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ طالب کو اس وقت اجازت بیعت عنایت فرماتے تھے کہ جب احسان اور ملکۂ یادداشت پیدا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اپنے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

سب اذکار و مراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہوتے ہیں۔ جب نسبت یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست کچھ عجیب بات ہے اب تمہارا سب ذکر لسانی قرآن وصلوٰۃ و ذکر مسنون مراقبہ ہے سب میں یادداشت ہے کہ ثمرہ مراقبات یہی ہے۔ اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں۔ اذکار مسنونہ احادیث پڑھو قرآن و نوافل ادا کرو اور لیس[1] الخ

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"اور جس گاہ کہ حق تعالیٰ نے تم کو واصل کیا اور شرط اجازت متحقق ہوگئی تو اجازت میں کیا عذر ہے خرقہ و اجازت دونوں حاصل ہوں گے[2] الخ

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو تحریر فرماتے ہیں۔

وہ ذات بحتِ مطلق ہے کہ ہستی و اطلاق سے بھی بالاتر ہے سا اطلاق کو بھی وہاں

---

[1] مکتوبات رشیدیہ صلا[؟] [2] ص ۱۹

گنجائش نہیں اور جو کچھ کسی کے قلب میں یا عقل میں آیا ہے یا آتا ہے وہ سب غیر ہے
ذات پاک اس سے مبرہ ہے پس ایسی حالت میں کسی کیف کا ہونا کیا گنجائش
رکھتا ہے محض حضور حظ بندہ کا ہے اور بس سو الحمد للہ اس میں سے
حصہ آپ کو حاصل ہے۔ ان تعبد ربک کانک تراہ (الحدیث)
مقصود سب کا رہا ہے۔ اور یہی مدعا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔
جس قدر اس سے کسی کو میسر ہوا وہی صاحب نصیب ہے، سوائے اس
کے جو کچھ حالات ہیں مقصود نہیں[1]

غرضکہ آپ کے جتنے خلفاء ہوئے معراج کمال پر پہونچے ہوئے تاریخ تصوف کے شموس وقمور تھے کہ ان کے فیض صحبت سے سینکڑوں تابندہ ستارے بن کر فلک ہند پر منور ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ذیل میں آپ کے خلفاء کرام کے اسماء گرامی پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی ونیز اجازت یافتہ از حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

(۲) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب " " " " "

(۳) حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ " " " "

(۴) حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الاسلامؒ

(۵) حضرت مولانا محمد صدیق صاحبؒ برادر حضرت شیخ الاسلامؒ

(۶) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ (آپ کو شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری قادری سے بھی اجازت حاصل تھی)

(۷) مولانا محمد روشن خاں صاحب مرادآبادیؒ

---

[1] مکتوبات رشیدیہ ص۳۷

(۸) مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ نہٹوری۔ ضلع بجنور
(۹) مولانا محمد صالح صاحبؒ جالندھر
(۱۰) مولانا قدرت اللہ صاحب مراد آبادیؒ
(۱۱) مولانا عبدالصمد صاحب سونی پتیؒ
(۱۲) مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مراد آبادیؒ
(۱۳) حافظ محمد یٰسین صاحب نگینویؒ۔ ضلع بجنور
(۱۴) مولانا صدیق احمد صاحبؒ کاندھلویؒ
(۱۵) مولانا نصیر الحق صاحب کاندھلویؒ
(۱۶) مولانا محمد اکرام صاحبؒ گرسہائے
(۱۷) شیخ عبدالغفور صاحبؒ جے پور
(۱۸) مولانا مخلص الرحمٰن صاحبؒ بنگالی
(۱۹) مولانا رمیض احمد صاحبؒ "
(۲۰) مولانا ضمیر الدین صاحبؒ " (مصنف وعظ بے نظیر)
(۲۱) قاری محمد ابراہیم صاحبؒ "
(۲۲) مولانا عبدالباری صاحبؒ "
(۲۳) مولانا عبداللطیف صاحبؒ "
(۲۴) مولانا صادق الیقین صاحبؒ " (آپ کو حاجی صاحبؒ سے بھی اجازت حاصل ہے)
(۲۵) مولانا محمد مظہر صاحبؒ (نانوتوی) (عمر میں حضرت گنگوہیؒ سے بڑے تھے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو آپ نے پڑھایا بھی ہے)

(۲۶) مولانا داؤد احمد صاحب گنگوہیؒ
(۲۷) مولانا قادر علی صاحبؒ دہلویؒ
(۲۸) مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ صاحب پور
(۲۹) مولانا بہاؤ الدین صاحبؒ کابل
(۳۰) مولانا قمر الدین صاحبؒ سہارنپور
(۳۱) مولانا مغیث الدین صاحبؒ ساڈھوری اھ (ماخوذ از تذکرۃ الرشید)

وصال

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے حالات وصال کو لکھتے ہوئے قلم میں غیر معمولی لرزہ پیدا ہونے لگا۔ اور دل غم کے بوجھ کی وجہ سے بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

۱۲ ریا ۱۳ ر جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کی شب میں نوافل تہجد میں آپ کی خنصر و بنصر دو انگلیوں میں کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا اور آپ کو پتہ بھی نہ ہوا۔ خدام نے جب خون کے دھبے دیکھے تو معلوم ہوا کسی موذی جانور نے کاٹ لیا ہے۔ خون چونکہ کافی نکل چکا تھا اور جانور بھی زہریلا تھا اس وجہ سے ضعف بڑھتا رہا۔ اور زہر کا اثر بھی ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ ۲۰ ر جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کو نہایت شدت کا بخار چڑھا۔ اور بڑھتا رہا۔ چنانچہ فوراً ہی آپ کے صاحبزادے عالی جاہ حکیم مسعود صاحبؒ نے علاج کی طرف خصوصی توجہ کی۔ لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر ۸ ریا ۹ ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ ریا ۱۲ ر اگست ۱۹۰۵ء کو بعد اذان جمعہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے آپ واصل بحق ہوگئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

متعدد حضرات نے آپ کی تاریخ وصال لکھی ہے۔ جن میں سے چند۔۔۔ پیش کرتا ہوں۔

۱۳۲۳ھ	" اِنَّہٗ فی الاٰخرۃ لمن الصالحین "	از حضرت شیخ الہندؒ
	" مولانا عاش حمیداً مات شہیداً "	از حضرت تھانویؒ
۱۳۲۳ھ	" بِسْمِ اللّٰہِ الجلیل العظیم "	از مولانا نور محمد صاحب پنجابیؒ
۱۹۰۵ء	" جائے مولانا رشید احمد بفردوسِ بریں "	از مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ

آپ کے کمالات

آپ کے روحانی کمالات اور علمی کمالات پر نمونتہً کچھ عرض کیا جاچکا ہے۔ مزید کمالات کو شمار کرانے کی نہ مجھ میں اہلیت ہے اور نہ ان کا احاطہ میرے نزدیک ممکن، صرف اتنا عرض کر دینا بس ہے۔ کہ آپ کے فیضِ صحبت اور کفش برداری سے حضرت شیخ الہندؒ حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ اور متعدد حضرات فلکِ ہند کے نیرّ اعظم ہوئے ہیں۔

آپ کے کمالاتِ روحانیہ کے متعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ آپ کے شیخ طریقت کا خراجِ عقیدت ہی کافی ہے۔ چنانچہ ضیاء القلوب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

> " ہر کہ ازیں فقیر محبت وارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہٗ و مولوی محمد قاسم سلمہٗ کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری وباطنی اند۔ بجائے من راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق ازمن شمارند۔ اگرچہ معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من ومن مقام اوشان شدم وصحبت اوشاں راغنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زماں نایاب اند "

ترجمہ:۔ (جو آدمی کہ اس فقیر (مراد حضرت حاجی صاحبؒ) سے محبت وعقیدت وارادت رکھتا ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہٗ، کہ تمام کمالات علوم ظاہری اور باطنی کو جامع ہیں۔ بجائے میرے بلکہ مجھ سے بھی

بڑھ کر شمار کرے۔ اگرچہ معاملہ برعکس ہے وہ بجائے میرے اور میں بجائے
ان کے ہوتا، ان کی صحبت غنیمت جاننی چاہئے کہ ان جیسے آدمی اس زمانہ میں
نایاب ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ اپنے اس ارشاد کے بارے میں ایک مکتوب میں تحریر
فرماتے ہیں۔

"میں نے جو ضیاء القلوب میں آپ کی نسبت کچھ لکھا ہے وہ الہام سے لکھا ہے"

(تذکرۃ الرشید ص۳۲ ج ۲)

حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک ملفوظ ہے کہ

"اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا۔ کہ امداد اللہ کیا لے کر آیا تو مولوی رشید احمد
صاحبؒ اور مولوی محمد قاسم صاحب کو پیش کردوں گا کہ یہ لیکر حاضر ہوا ہوں الخ

(تذکرۃ الرشید ص۳۲ ج ۲)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے سوانحعمری میں حضرت حاجی صاحبؒ کا
مقولہ نقل کیا ہے۔

مولوی رشید احمد صاحبؒ میں اور مجھ میں کچھ فرق نہیں، لوگوں کو میاں آنے
کی کیا ضرورت ہے۔ اھ ص۱

بس آپ کے کمالات ظاہرہ و باطنہ کے لئے صرف اتنا ہی تحریر کردینا کافی تھا۔
لیکن عنوان کو پورا کرنے کی خاطر آپ کے کمالات باطنہ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ کمالات
ظاہرہ یا علمیہ کا تذکرہ سابقہ سطور میں ہوچکا ہے۔ اگرچہ بہت قلیل ہے۔

"سنہ ۱۳۱۲ھ میں دار العلوم دیوبند کا جلسہ دستار بندی ہوا۔ بعد جلسہ کے
لوگوں نے آپ سے وعظ کی درخواست کی تو آپ نے اس کو منظور فرمالیا۔ اور
جمعہ کی نماز کے بعد دیوبند کی جامع مسجد میں منبر پر تشریف لے گئے۔ اور

ترمذی شریف کھول کر کسی حدیث کا ترجمہ شروع کر دیا۔ درمیانِ وعظ میں اخلاص کے سلسلہ میں آپ نے لفظ اللہ زبان سے ادا کیا۔ پس اللہ کا نام نہ معلوم کس قدر سوز و گداز سے شروع کیا تھا کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع بیخود تھا۔ اور در و دیوار سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دیتی تھی۔ (ماخوذ از تذکرۃ الرشید ملخصاً)

اسی جلسہ کا واقعہ ہے۔ کہ عصر کی نماز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے پڑھائی۔ چونکہ مجمع بہت تھا مصافحہ کی کثرت کی وجہ سے آپ جماعت تک دیر میں پہنچے جس کی وجہ سے آپ کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی۔ جس کا آپ کو بہت قلق ہوا۔ چہرے سے حزن و ملال کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ فرمایا کہ افسوس ۲۲ سال میں آج تکبیر اولیٰ فوت ہوئی۔ (ماخوذ از تذکرۃ الرشید ملخصاً)

آپ کی کرامات، اخلاق و عادات اور صفائے باطن کا ادراک ہم سے تو کیا آپ کے ہمعصروں سے بھی نہ ہو سکا۔ البتہ آپ کی قوت، ادراک و احساس سے کچھ صفائے باطن کا اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص کی نظافت ظاہرہ اور ادراک کا یہ عالم ہو اس کی نورانیت قلب کس مقام پر ہوگی۔

آپ کی ظاہری بینائی ختم ہو چکی تھی کہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن مجمع کثیر تھا حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی جن کی عمر گیارہ سال کی ہوگی، دبے پاؤں آکر ایک گوشہ میں دور بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا بچے کے سانس کی بو آتی ہے۔ عرض کیا گیا حضرت! محمد الیاس آیا ہے۔

ایک بار نمبردار فضل حق کا لڑکا اکرام الحق حاضر خدمت ہوا۔ آپ کو خبر نہ تھی کہ کون کون بیٹھا ہے۔ فرمایا: نمبردار فضل حق کی سی بو آتی ہے۔ حاضرین نے عرض کیا۔ وہ تو نہیں بلکہ ان کا لڑکا اکرام الحق بیٹھا ہے۔

اسی قسم کے بکثرت واقعات تذکرۃ الرشید میں موجود ہیں۔ غرض کہ اللہ تعالےٰ

نے آپ کو حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت اور جمیع صفات کا مقدس مجمع بنایا تھا، علم و عمل، کشف و کرامات، اتباعِ سنت میں آپ بطحائی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحیح جانشین تھے۔

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

ایک مرتبہ مولوی محمد قاسم صاحب افسر بندوبست گوالیار کسی جرم میں ماخوذ ہوگئے۔ اور ریاست کی طرف سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا تو بہت پریشان ہوئے چنانچہ ان کے بھائی صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا گنگوہ جاؤ۔ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ سے دعا کراؤ۔ تمہاری تمام مشکل کشائی مولانا گنگوہیؒ کی دعا پر موقوف ہے۔ بس اور روئے زمین کے تمام اولیا بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔ ہاں اگر مولانا گنگوہیؒ دعا کریں تو کامیاب ہوجاؤ گے۔ چنانچہ گنگوہ آئے اور دعا کرائی اور برأت ہوگئی۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی فرماتے ہیں کہ میاں مولانا رشید احمد صاحبؒ کا کیا حال پوچھتے ہو وہ تو دریا پی گئے اور ڈکار تک نہ لی۔

"ایک جوگی ہندو پنڈت نے کہا ہے کہ دلی کی بادشاہت میں ان جیسا فقیر نہیں ہے۔ میں نے دنیا میں گشت کیا ہے۔ مگر ایسا کامل شخص اپنی عمر بھر نہیں دیکھا۔"

(ماخوذ از تذکرۃ الرشید)

حضرت قدس سرہٗ العزیز کے کمالات اور اوصاف کہاں تک بیان کئے جائیں۔ بس اس شعر پر آپ کا تذکرہ ختم کرتا ہوں۔

حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مولانا محمد مظہر نانوتویؒ و مولانا محمد منیر نانوتویؒ ۔ !

از ۱۸۲۳ء تا ۱۸۸۵ء ٭ از ۱۸۳۱ء تا ـــــء

مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

مولانا محمد احسن صاحب نانوتویؒ کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۲۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم وحفظ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ پھر مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ علم حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حاصل کیا۔ مولانا محمد مظہر تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہوگئے۔ وہاں سے آگرہ کالج میں تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا.............. .... مولانا محمد مظہر کے پیر میں گولی لگی تھی۔ جہادِ شاملی کے بعد تمام شرکا مصائب وآلام میں مبتلا رہے۔ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ پھر روپوش ہوگئے۔ اس زمانہ میں کچھ دنوں بریلی بھی رہے۔ جب معافی عام ہوئی تو ظاہر ہوئے۔ ملازمت سرکاری سے قطع تعلق ہوگیا۔ گھر پر طلبا کو درس دینا شروع کردیا۔ مولانا کی شرکت جہاد کا حال اخفاد پوشیدگی کی نذر ہوگیا۔

رجب ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں مولوی سعادت علی سہارنپوری نے ایک مدرسہ سہارنپور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمرالدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنا مکان مدرسہ کے لئے وقف کردیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق صاحب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے مرید اور مولانا محمد مظہر

صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام مظہر العلوم تجویز ہوا۔ مگر مولانا محمد مظہر نے اپنے نام کی نسبت کو پسند نہ فرمایا۔ آخر بہت اصرار کے بعد 'مظاہر العلوم' تجویز ہوا۔ یہ مدرسہ ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ ہے۔[1] مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے ہمراہ مولانا محمد مظہر نے پہلا حج کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں دوسرا حج کیا۔ مولانا محمد مظہر کے تعلقات مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بہت خصوصیت کے تھے[2]

مولانا محمد مظہر حدیث و فقہ میں بڑا درک رکھتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی نے جب مولوی خرم علی بلہوری کے ورثا سے درمختار کا اُردو ترجمہ اشاعت کی غرض سے خریدا۔ تو اس کتاب کے بقیہ ترجمے اور صحت و درستی میں مولانا محمد مظہر نانوتوی پورے پورے شریک رہے۔ جیسا کہ مولانا محمد احسن نے کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے[3]۔ مولانا محمد مظہر نانوتوی نہایت متقی، پرہیز گار، منکسر المزاج اور نیک نفس بزرگ تھے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں سہارنپور میں لاولد فوت ہوئے۔ آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے ممتاز مثل مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی وغیرہ تھے۔

مولانا محمد منیر نانوتوی

مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی۔ پھر دہلی پہونچکر مولانا مملوک علی نانوتوی، مفتی صدر الدین آزردہ اور شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی سے جملہ علوم کی تکمیل کی۔ مولانا محمد منیر

---

[1] مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو "فرنگیوں کا جال" از مولانا امداد صابری دہلوی

[2] ملاحظہ ہو "مذہب منصور" از مولانا منصور علی خاں مرادآبادی و "تذکرۃ الرشید" حصہ دوم از مولوی عاشق الٰہی میرٹھی

[3] ملاحظہ ہو "غایۃ الاوطار" مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی۔

صاحبؒ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے۔ آپ جنگ شاملی میں دوسرے اکابرین کے ساتھ شریک رہے۔ اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مولانا محمد منیر حربی سکریٹری تھے۔ اور خوب داد شجاعت دی جیسا کہ سوانح قاسمی سے اندازہ ہوتا ہے۔ جنگ شاملی کے بعد مولانا محمد منیر بھی روپوش ہو گئے۔ معافی عام کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی کے پاس بریلی پہونچے۔ ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے۔ مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم تھے۔ اور اس کا نظم و نسق زیادہ تر ان ہی سے متعلق رہا۔ بریلی ہی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔

مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ ایمانداری اور دیانتداری میں جواب نہیں رکھتے تھے "ارواح ثلاثہ" میں تحریر ہے کہ

"ایک مرتبہ مولانا محمد منیر نانوتوی دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روداد چھپوانے کے لئے ڈھائی سو روپے لے کر دہلی گئے۔ اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے۔ مولانا محمد منیر اس حادثہ کی کسی کو اطلاع کئے بغیر نانوتہ آئے۔ اپنی زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا۔ اور اس سے روداد چھپوا کر لائے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مجلس ارکان شوریٰ کو اس کا علم ہوا۔ تو انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اس کے متعلق فتویٰ دریافت کیا۔ مولانا گنگوہیؒ کے پاس سے جواب آیا کہ مہتمم صاحب امین تھے۔ اور روپیہ چونکہ بلا تعدی کے ضائع ہوا۔ اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا ارکان مجلس نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتویٰ دکھا کر مولانا محمد منیر سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں۔ مولانا محمد منیر نے فرمایا کہ فتویٰ کی بات نہیں ہے۔ اگر خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے۔ چنانچہ اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد احسن کے انتقال کے بعد دارالعلوم کی مہتممی سے مستعفی ہو کر ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں نانوتہ واپس آگئے۔ خارج

اوقات میں دارالعلوم میں مولانا محمد منیر عربی ادب کی کتابیں طلباء کو پڑھایا کرتے تھے۔"

مولانا محمد منیر کی صورت نہایت نورانی تھی۔ قد بڑا، چہرہ لمبا، داڑھی گھنی، قدرے لمبی تھی۔ بلا ضرورت بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے، ہر موسم میں بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ جب ہر مہینے پنشن لینے سہارنپور جاتے تو اپنے اعزا کے گھروں پر جاکر دریافت کرتے کہ "کچھ منگانا تو نہیں ہے"؟ ان کی فرمائشیں لکھ کر لے جاتے اور خرید کر لاتے۔ محلہ کے تمام لوگ مولانا محمد منیر کا نہایت احترام کرتے تھے۔ مولانا نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ آخر زمانہ میں مطبع مجتبائی دہلی سے بھی تعلق رہا۔

مولانا محمد منیر نے امام غزالیؒ کی کتاب منہاج العابدین کا اُردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا۔ جو کہ مطبع صدیقی بریلی سے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں طبع ہوا۔ مولانا کی ایک دوسری تصنیف "فوائد غریبہ" ہے۔ جو کہ مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی ہے یہ رسالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب توحید و رسالت سے متعلق ہے۔ دوسرا باب نفس کے بیان میں ہے تیسرا باب قرآن شریف کی تلاوت کے متعلق ہے۔ کتاب نہایت مدلل ہے اس مختصر سے رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا منقولات کے علاوہ معقولات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ افسوس کہ تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء تک کی تحریر تو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں حج ادا کیا۔

مولانا محمد منیر کے ایک صاحبزادے حافظ محبوب الرحمٰن اور ایک صاحبزادی ام فضل تھیں۔ ام فضل مولانا محمد احسن نانوتوی کے صاحبزادے مولوی حافظ فضل الرحمٰن صاحب کو منسوب تھیں۔ حافظ محبوب الرحمٰن صاحب کے تین صاحبزادے حافظ مقبول الرحمٰن حافظ مطلوب الرحمٰن اور عطاء الرحمٰن ہوئے۔ جن کا سلسلۂ اولاد پاکستان اور بھارت میں موجود ہے

ازہرالہند دارالعلوم دیوبند

از ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ ہجری

انگریزوں کی برابر چالباز اور جہاندیدہ مکار قوم دنیا میں دوسری نہیں ہے چنانچہ ہندوستان میں جس مکر و فریب سے اس نے اپنی حکومت قایم کی، اس کی مثال گرگ باراں سے کم نہیں ہے۔ انگریز جانتا تھا کہ ہندوستان میں جب تک مسلمان، مسلمان ہیں۔ انگریزی اقتدار کو ہر وقت خطرہ ہے اس لئے کہ دنیا میں اس کے نزدیک۔ اگر اس کے اقتدار اعلیٰ کو پامال کرنے والی قوم اگر کوئی ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا ان کے مذہبی و دینی احساسات کو ختم کر دینا۔ اور ان میں تفریق پیدا کرنا۔ اس نے اپنا اولین فریضہ قرار دیا۔ اور اس کے لئے روپیہ کو پانی کی طرح بہایا، جاہل عوام کے عقائد خراب کرنے کے لئے عیسائی مشن کو مقرر کیا۔ انگریزی تعلیم کو عام کیا۔ کیونکہ۔

ع " دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے "

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے دور ہوتے گئے اور ان میں دینی احساسات کم ہونے لگے۔

مشائخ دیوبند جن کو اللہ تعالیٰ نے نور بصیرت سے نوازا تھا اس سے غافل نہ تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ چکے تھے اور دیکھ رہے تھے وہ جانتے تھے کہ ہوا کس رُخ پر چل رہی ہے۔ اور آئندہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی آگ جب سرد پڑی تو ان حضرات نے مشورہ کیا۔ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے۔ اور آئندہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے لئے لائحہ عمل تجویز کیا۔ اور دیوبند اور سہارنپور میں مدارس قائم کرنے شروع کر دیئے۔ اور اس طرح کہ اس سے

قبل مدارس کے قیام اور دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کا ایسا مفید اور مستحکم طریقہ دنیا میں کسی کے ذہن میں بھی نہ آیا تھا۔ دنیا کی تمام حکومتیں بھی متحد ہوکر یہ کام کرتیں تو کامیاب نہ ہوتیں۔ یعنی دینی تعلیم کو عوامی تحریک بنادیا۔ بلاشبہ دنیا کی مالدار ترین قومیں اور حکومتیں اپنی مذہبی تعلیم کو اس عمومیت کے ساتھ رائج نہ کرسکیں جس عمومیت کے ساتھ ان گدڑی پوش مشائخ دیوبند نے رائج کیا۔ بلاشبہ دنیا کے کسی مذہب کے پاس اتنے علماء نہیں ہیں، جتنے اسلام کے پاس صرف ہندوستان پاکستان میں ہیں، اور یہ سب دارالعلوم دیوبند کا فیض ہے۔

دیوبند قصبہ دیوبند یوپی کے مغربی ضلع سہارنپور میں پنجاب دہلی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ سہارنپور سے بیس میل بجانب جنوب ہے۔ دلی یہاں سے قریباً ۹۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ شرفاء کی بستی ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ عثمانی، صدیقی، فاروقی شیوخ کی اولاد پر مشتمل ہے۔ ہندو مسلم آبادی عجیب طرز پر واقع ہے۔ شہر کی جانب غرب میں مسلمان اور شرق میں ہندو آباد ہیں۔ درمیان میں حد فاصل کے لئے بازار ہے۔ ہر فرقہ کا مستقل محلہ علیحدہ آباد ہے۔

دیوبند کی آبادی کے متعلق عجیب و غریب حکایتیں مشہور ہیں، جن کی اصلیت بچوں کی کہانیوں سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ زمانہ قدیم میں کفار و مشرکین کی بستی تھی۔ جس کا ثبوت یہاں کے قدیم منادر (دیبی کنڈ) وغیرہ ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کو دیوبن یا دیوبند کہا جانے لگا۔ قدیم تذکروں میں بھی اس کا نام دیبن ملتا ہے۔

" دیبن موضع است از مضافات سہارنپور "

(تاریخ دیوبند از زبدۃ المقامات ص۱۱۱)

دیوبند دوآبہ کا مشہور شہر ہونے کے علاوہ اکابر مشائخ کی قیام گاہ رہ چکا ہے

چنانچہ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ نے اپنے دورہ میں کافی عرصہ تک یہاں قیام کیا ہے۔ اور آپ کا قیام دارالعلوم سے جانب مشرق قاضی مسجد میں رہا ہے۔ یہاں حضرت سید صاحب کے بیشتر رفقاء دیوبند ہی کے باشندہ ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا سید مقبول احمد صاحب (۲) مولوی شمس الدین صاحب (۳) شیخ رجب علی صاحب (۴) شیخ منور علی صاحب (۵) مولوی بشیر اللہ صاحب (۶) مولوی فرید الدین صاحب (۷) شیخ عبدالرزاق صاحب (۸) شیخ حفیظ اللہ صاحب۔

سید صاحب کے زمانہ قیام میں یہاں آپ کے بکثرت مرید ہوئے کہ جن کی اولاد میں سے، سید محمد عابد صاحبؒ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب، حضرت مولانا مہتاب علی صاحب وغیرہ حضرات تھے۔

علاوہ ازیں یہاں دوآبہ کے مشہور مشائخ کا اجتماع دارالعلوم سے متصل مسجد (مسجد چھتہ) میں ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً حافظ ضامن شہید، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ حضرت مولانا فرید الدین صاحب وغیرہ۔ ان کے بعد حضرت سید محمد عابد صاحب۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب حضرت شاہ منے صاحبؒ وغیرہ حضرات کا اجتماع رہتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اس مسجد کا نام مسجد چھتہ (مسجد اجتماعی) ہوا ہو۔ ہمارے اس قیاس کی تائید مسجد کی بالائی

لہ منے شاہ صاحب میاں اصغر حسین صاحب کے نانا ہوتے ہیں۔ صاحب استغراق بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں مہتمم صاحب کی روایت ہے کہ ان سے کبھی گناہ کا ارادہ بھی نہیں ہوا۔ معصومیت کا یہ عالم تھا کہ بچے برسات کے دنوں میں آپ سے کہا کرتے تھے کہ میاں جی صاحب لائیے روپیوں کو دھوپ لگا دیں۔ اور بہانہ سے وہ کچھ روپے نکال لیتے تھے۔ اور کہہ دیتے تھے کہ اتنے روپے سوکھنے میں کم ہو گئے۔ روایت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ انہیں بزرگ نے رکھی تھی۔ (واللہ اعلم)

ہیئت اور ارد گرد کے حجروں سے بھی ہوتی ہے۔ مسجد کی چھت پر تین گنبد ہیں کہ جن میں داخل ہونے کے لئے چھوٹے چھوٹے دریچے ہیں جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان گنبدوں میں چلہ کشی کی جاتی ہوگی۔ اور حجروں میں بزرگوں کا قیام ہوتا ہوگا۔

بانی اوّل بلاشبہ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب مدرسہ عالیہ دارالعلوم دیوبند کے بانی اوّل ہیں۔ آپ کی ولادت سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء ہے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رح کے خلفاء عظام میں سے ہیں۔ بڑے عابد، زاہد متقی، پرہیزگار اور پابند اوقات لوگوں میں سے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح ارشاد فرماتے ہیں:۔

"آپ اس درجہ پابند معمولات و اوقات تھے کہ ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح نے ارشاد فرمایا کہ جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت حاجی صاحب فلاں کام میں مشغول ہوں گے۔ اور اگر کوئی اس وقت جا کے دیکھے تو ان کو اسی کام میں مشغول پائے گا۔ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا[1] اھ

باوجودیکہ تعویذات اور عملیات سے آپ کو بہت زیادہ شغف تھا لیکن اعمالِ قلبی اور اتباعِ سنت بھی کمال درجہ کا تھا۔

ایک روز آپ کو بہت رنجیدہ دیکھا گیا اور افسردگی کی یہ حالت کہ کسی نوجوان عزیز کی مرگِ ناگہانی کا شبہ ہوتا تھا۔ سبب دریافت کیا گیا تو بہت زیادہ اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال کے بعد آج جماعت صبح کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی ہے۔ اھ[2]

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے چند اشعار آپ کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔

---

[1] اشرف السوانح ص۱۷۹ ج ۱ [2] علماء حق ص۹۵ ج ۱

ہم شریک و مشورہ اے نور مبین — ہست حضرت حاجی عابد حسین
عالمِ کامل ولی مردِ خدا — پائے او بر پائے فخر انبیاء
ہم جمالی، ہم جلالی شان او — کان علم و مخزن خُلقِ نکو
نقش تعویذش مثال نقش قدر — فیض او بر خاص و عامی مثل بدر

آپ بہت زیادہ خلیق اور مہمان نواز تھے۔ رمضان المبارک میں افطاری کا اہتمام نہایت شوق کے ساتھ فرماتے تھے۔ اور تمام حاضرین کو اپنے پاس سے ہی روزہ افطار کراتے تھے۔ یہی معمول آپ کا حرم شریف پہونچکر رہا۔ سالکین کے حالات کی اصلاح بھی نہایت خوبی سے فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے ایک مرتبہ اپنی حالت بیان کی تو فرمایا:۔

"یوں سمجھنا چاہئیے کہ یہ خطرات قلب میں داخل نہیں ہو رہے بلکہ خارج ہو رہے ہیں۔ جیسے اگر چور گھر میں چوری کرنے کے لئے گھسے تب بھی دروازہ پر نظر آتا ہے اور اگر گھر والوں کے جاگ پڑنے کے بعد بھاگنے لگے۔ تب بھی دروازہ ہی سے گذرتا ہوا نظر آتا ہے[1]

حاجی محمد انوار صاحب دیوبندیؒ آپ کے بلند پایہ خلیفہ ہیں۔ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ بلکہ لوگوں کا خیال تھا کہ اپنے شیخ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ہر وقت جنون کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے فرمایا۔ کہ ایک بات کہتا ہوں میری زندگی میں کسی سے ظاہر نہ کرنا۔ فرمایا کہ حرم شریف میں میں نے حالت بیداری میں بعض انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہے۔

حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کا انتقال ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۲ء کو ۸۱ سال کی عمر میں ہوا۔

---

[1] اشرف السوانح ص ۲۴۰ ج ۱

مادہ تاریخ   مدار المہام بہشت برین رفت

۱۳   ۳۱

مدرسہ مسجد چھتہ

چونکہ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اور آپ کے رفقاء کو مدرسہ کے متعلق لگن...تھی اس وجہ سے آپ نے اور مولانا مہتاب علی صاحب (عم بزرگ حضرت شیخ الہندؒ) نے ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ مدرسہ مذکور کی ابتدا کی جو آئندہ چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔ فراہمی چندہ کے لئے آپ نے رومال پھیلایا۔ اور ۳ روپیہ سب سے پہلے اپنی جیب خاص سے رومال میں ڈالے۔

> اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ کو میرٹھ کو خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے لئے دیوبند تشریف لائیے۔ فقیر نے یہ صورت فراہمی چندہ کے لئے اختیار کی ہے[1]

ان دنوں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ میرٹھ کے مطبع میں کام کرتے تھے۔ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب نے آپ کو خط لکھا۔

> "کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہو گئے۔ اور اب آپ تشریف لے آئیے[2]"

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے جواب تحریر فرمایا۔

> میں بہت خوش ہوا خدا بہتر کرے۔ مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپیہ ماہوار پر مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھاویں گے۔ اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔[3]

چنانچہ زیر درخت انار مسجد چھتہ میں مدرسہ مذکور کا افتتاح ہوا۔ سب سے

---

[1] سوانح قاسمی ج۲ ص۲۵۱ [2] ایضاً ص۲۵۱ [3] تذکرۃ العابدین ص۶۹

پہلے متعلم محمود حسن (شیخ الہندؒ) معلم ملا محمود، ساعت محمود، یوم محمود (پنجشنبہ) ماہ محمود۔ (محرم الحرام) تھا پہلے سال یعنی ۱۲۸۳ھ کے اختتام پر مدرسہ مذکور میں مندرجہ ذیل کتابیں پڑھائی گئیں۔

شرح جامی۔ شرح وقایہ۔ میبذی۔ قطبی۔ اصول الشاشی۔ سراجی ا ھ

سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان یہ ہیں:۔

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (۲) حضرت حاجی عابد حسین صاحب
(۳) مولانا مہتاب علی صاحب (۴) مولانا ذوالفقار علی صاحب۔
(۵) مولانا فضل الرحمٰن صاحب (۶) شیخ نہال احمد صاحب (۷) منشی فضل حق صاحب رحمہم اللہ تعالےٰ۔

سب سے پہلا دورہ ۱۲۸۹ھ میں ہوا اور سب سے پہلے پانچ طالب علم ۱۲۹۰ھ میں یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

(۱) حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ (شیخ الہند) (۲) مولانا عبدالحق صاحب ساکن پور قاضی (۳) مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی (۴) مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ (۵) مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادی۔

اس کے بعد سب سے پہلا جلسۂ دستار بندی ۱۲۹۰ھ میں ہوا جس میں دارالعلوم کے لئے تجویز منظور ہوئی[۱]۔

دارالعلوم کی صورت

کچھ دنوں تک مدرسہ چھتہ کی مسجد میں چلا اس کے بعد جب طلباء زیادہ ہوئے تو قاضی کی مسجد اور دوسرے مکانات میں تبدیل ہوتا رہا۔ چنانچہ چند سال تک جامع مسجد میں رہا ہے لیکن طلباء کی زیادتی کی وجہ سے ضرورت ہوئی کہ مدرسہ کو کسی کشادہ جگہ میں ہونا چاہئے۔ اور مدرسہ

---

[۱] دارالعلوم کا بانی کون تھا۔ میرا تحقیقی مقالہ تذکرۂ شیخ الہند" میں ملاحظہ فرمائیں۔

کو اعلیٰ شکل دینی چاہیئے ۔ اس تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ تھے ۔ ان کی انتھک کوششوں کی وجہ سے ایک چھوٹے مدرسہ سے دارالعلوم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

چونکہ اس تجویز سے حضرت سید محمد عابد صاحبؒ کو مخلصانہ اختلاف تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ جبکہ جامع مسجد میں کمرے اسی لئے بنائے گئے ہیں ان کو کام میں لانا چاہیئے اس وجہ سے وہ کافی عرصہ تک ناراض رہے لیکن اکثریت کی پاس شدہ تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

۲ رذی الحجہ ۱۲۹۲ھ یوم جمعہ کو بعد نماز جمعہ بہت سے اکابر و مشائخ کا اجتماع ہوا اور شہری اور بیرونی حضرات جمع ہوئے ۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک تقریر فرمائی ۔ اور سب لوگوں کو فرمایا کہ آپ شریک ہوں ۔ چنانچہ یہ مقدس مجمع اس جگہ آیا جہاں آج نودرہ ہے ۔

اس جگہ پر پہلے شہر کی کوڑیاں تھیں ۔ روایت ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ کا جب ادھر سے گذر ہوا تو فرمایا کہ اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے ۔ دوسری روایت اسی قسم کی حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق ہے ۔ یہ جگہ شیخ نہال صاحب کی مملوکہ تھی جس کو انھوں نے مدرسہ کے لئے بیع کر دیا تھا ۔ اور بیعنامہ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کے نام لکھا گیا تھا ۔

بنیاد کے لئے مختلف خیالات تھے کہ کس جگہ بنیاد ہونی چاہیئے ۔ چنانچہ منقول ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں ۔ اور اپنی چھڑی سے نشان لگا کر فرما رہے ہیں کہ اس جگہ بنیاد ہونی چاہیئے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں آج نودرہ ہے ۔

حضرت حاجی صاحبؒ کو بنیاد کے وقت راضی کر لیا گیا ۔ اور دوسری اینٹ

ان ہی کے دستِ مبارک سے رکھی گئی۔

تاریخ تعمیر یہ ہے ”اشرف عمارات یافتہ اندؐ“

روایت ہے کہ سب سے پہلی اینٹ میاں منے شاہؒ نے رکھی۔ اور دوسری اینٹ حضرت حاجی صاحبؒ اور تیسری اینٹ حضرت گنگوہی صاحبؒ نے، اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور دوسرے حضرات نے رکھی، سنگ بنیاد رکھتے وقت مندرجہ ذیل حضرات موجود تھے۔

(۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۲) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (۳) حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ (۴) حضرت شاہ منے صاحب (۵) حضرت سید محمد عابد صاحبؒ (۶) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ (۷) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (۸) حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ (۹) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ (۱۰) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ (۱۱) حضرت شیخ نہال احمد صاحبؒ (۱۲) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ

آپ فرزند رشید حضرت مولانا فریدالدین صاحبؒ دیوبندیؒ کے ہیں۔ مولانا فریدالدین صاحبؒ کے متعلق گذر چکا ہے کہ آپ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے رفقاء میں سے ہیں۔ بڑے صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔ آپ کا مزار دارالعلوم دیوبند کے شمالی دروازہ کے سامنے ہے۔ مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ کی قبر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنی ہے آپ کے چار بھائی اور تھے۔ محمد صابرؒ، بلند بختؒ، مقصود علیؒ، سید احمدؒ۔ تینوں موخرالذکر حضرات معرکۂ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ مولانا فریدالدین صاحبؒ کے انتقال کے وقت ان کے جنازہ میں شریک تھے۔ اور بعد تدفین کے غائب ہوگئے۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب مولانا فرید الدین صاحبؒ کے نہایت بزرگ اور باخدا صاحبزادے تھے۔ سن ولادت ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء ہے۔ شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنیؒ سے بیعت تھے۔ اور انہیں سے اجازت بیعت وخلافت حاصل تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ روحانیت میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"مولانا گنگوہیؒ میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ مولانا گنگوہیؒ عالم ہیں اور وہ (شاہ رفیع الدین صاحبؒ) عالم نہیں۔ ورنہ نسبت باطنی کے لحاظ سے دونوں ایک درجہ کے ہیں۔" ۱؎

اگرچہ آپ باقاعدہ فارغ التحصیل عالم نہ تھے لیکن فارسی اور دینیات وغیرہ کا آپ کو کافی علم تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

"شاہ صاحب ہمارے حضرات، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا نانوتویؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔" الخ

دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے پیشتر آپ باہر جنگل میں رہا کرتے تھے۔ جب آپ کو مہتمم بنانے کا خیال ہوا۔ تو کچھ آدمی آپ کو لینے کے لئے گئے آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے حضرت مولانا محمود حسنؒ صاحبؒ کو ایک رفیق کے ساتھ بلانے کے لئے بھیجا۔ حضرت حجۃ الاسلامؒ کا پیغام سنکر آپ فوراً ہی تشریف لے آئے۔

آپ نے انتظام واہتمام کا کام اتنے حسن وخوبی سے انجام دیا کہ لوگ حیران تھے۔ اسی طرح سے دستار بندی کا جلسہ ہوا۔ اس کا بھی انتظام نہایت خوبی سے کیا۔ چنانچہ آپ ارشاد فرماتے تھے۔

۱؎ اشرف السوانح صـ ۱۳۹ ج۔۱

"یہ توخیر جلسہ ہی ہے ہم کو تو اگر سلطنت بھی سپرد کر دی جائے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا بھی ایسی ہی سہولت و اطمینان اور حسن و خوبی کے ساتھ انتظام کر کے دکھلادیں۔

مولانا محمد طیب صاحب اپنے والد صاحب یا مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے روایت کرتے ہیں۔

"اہتمام کے ہاتھ میں آنے کے بعد جب میں نے تعمیرات کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ جس جگہ نالی بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کی مجمہ نالی کی نشانی پائی۔ کہ جس کو شاہ رفیع الدین صاحب نے بنوا کر بند کرادیا تھا۔" اھ

اس روایت سے شاہ صاحب کا ذوق تعمیر اور انجینئرنگ کا کمال صاف ظاہر ہے دارالعلوم کی موجودہ عمارت شاہ صاحبؒ کے تیار کردہ خاکہ کے مطابق ہے (واللہ اعلم)

آپ کا وصال ۱۳۰۸ھ میں ہوا ہے آپ کے ارشد خلفاء میں سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ ہیں۔

دارالعلوم کی پہلی مجلسِ شوریٰ

مندرجہ ذیل ان حضرات کے اسمار گرامی ہیں۔ جو ۱۲۹۱ھ کی مجلس شوریٰ میں تھے

(۱) حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (۲) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۳) حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ (۴) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (۵) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی (۶) منشی فضل حق صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ (ماخوذ از علماء حق)

حضرات مہتمم صاحبان

ابتدائے قیام مدرسہ سے لیکر اس وقت تک جتنے مہتمم حضرات دارالعلوم دیوبند میں ہوئے ہیں ان کے اسمار گرامی بقید تاریخ مندرجہ ذیل پیش کئے جا رہے ہیں۔

(۱) حاجی سید محمد عابد صاحب از ۱۲۸۳ھ تا ۱۲۸۴ھ اور از ۱۲۸۶ھ تا ۱۲۸۸ھ تیسری مرتبہ از ۱۳۰۶ھ تا ۱۳۱۰ھ۔

(۲) شاہ رفیع الدین صاحب آپ دو مرتبہ مہتمم مقرر ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۸۴ھ تا ۱۲۸۵ھ دوسری مرتبہ ۱۲۸۸ھ تا ۱۳۰۶ھ

(۳) منشی فضل حق صاحب صرف ایک سال مہتمم رہے ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۱ھ۔

(۴) مولانا محمد منیر صاحب صرف ایک سال مہتمم رہے ۱۳۱۱ھ تا ۱۳۱۲ھ

(۵) حافظ محمد احمد صاحب از ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۴۱ھ پھر ۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۴ھ ۱۳۴۴ھ میں آپ حیدرآباد میں اونچی تنخواہ پر مفتی ہوکر چلے گئے تھے اور دارالعلوم کے اہتمام سے سبکدوش ہوگئے تھے۔ ۱۳۴۷ھ میں آپ کا حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ اور وہیں سپردِ خاک کردیئے گئے۔

(۶) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آپ ۱۳۲۵ھ میں نائب مہتمم مقرر ہوئے تھے اور پھر ۱۳۴۸ھ تک مہتمم رہے۔

(۷) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ۱۳۶۶ھ میں آپ پاکستان چلے گئے۔

(۸) مولانا محمد طیب صاحب آپ از ۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۸ھ تک نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ سے لیکر الی یومنا ھٰذا مہتمم ہیں۔

درمیان میں آپ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے انتقال کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ دنوں تک رہے۔ آپ کی مدتِ ویزا ابھی ختم ہوچکی تھی۔ اور آپ پاکستان کے شہری بھی بن چکے تھے لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ذریعہ حکومت سے کوشش کی جس کی وجہ سے حکومت ہند نے آپ کو پھر دوبارہ واپس بلالیا۔

حضرات صدر مدرس | دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب

صاحب تھے۔ آپ کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

(۱) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۰۲ھ

(۲) حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ از ۱۳۰۲ھ تا ۱۳۰۷ھ۔ آپ معقولات خصوصاً ریاضی میں فن کے امام تھے۔

(۳) حضرت شیخ الہندؒ دیوبندی از ۱۳۰۸ھ تا ۱۳۳۳ھ آپ حجاز تشریف لے گئے تھے۔ آپ کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ہے۔

(۴) حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری از ۱۳۳۳ھ تا ۱۳۴۶ھ معقولات و منقولات اور دیگر فنون میں نمایاں خصوصیت کے مالک تھے۔ ۱۳۴۶ھ میں استعفےٰ دیکر ڈابھیل چلے گئے تھے۔ وہاں ۱۳۵۱ھ تک رہے اور صفر ۱۳۵۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

(۵) حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ۔ از ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۷۷ھ

۔ آپ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی صدارت کے دو حصہ کر دیئے گئے۔ ایک صدر مدرس اور دوسرا شیخ الحدیث۔ چنانچہ اس وقت صدر مدرس مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی انصاری ہیں۔ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین صاحب مرادآبادی ہیں۔

حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہویؒ[1]

از ۱۲۶۷ھ تا ۱۳۳۰ھ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نسباً آپ کا تعلق سادات حسینیہ[2] سے ہے۔ اور امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ ابن[3] قدس سرہٗ کی اولاد میں سے ہیں۔ والد بزرگوار کا نام سید اکبر حسین ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت

آپ نے فارسی و عربی کی تعلیم امروہہ کے مشہور عالم جناب مولانا سید رافت علی صاحبؒ مولانا کریم بخش صاحبؒ مولانا محمد حسین صاحب جعفری سے حاصل کی۔ اور طب کی تعلیم امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خاں اثنا عشری سے پائی۔

---

[1] حضرت مولانا احمد حسن صاحب قدس سرہٗ کے زیر نظر حالات آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا سید محمد رضوی عرف بجے میاں صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج ..... کرتا ہوں۔ (بندہ غفرلہٗ)

[2] آپ حسینی سید ہیں جس وقت آپ خورجہ تشریف لے جانے والے تھے تو آپ کے پہنچنے سے قبل مولانا عبدالرحمٰن صاحب خورجوی کی دادی نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ یہ (اشارہ بجانب مولانا احمد حسن صاحب) ہمارا لڑکا تمہارے پاس آئے گا اس کا خیال رکھنا۔ ان خاتون نے عرض کیا کہ یہ صاحبزادے حضرت حسنؓ کی اولاد سے ہیں یا حضرت حسینؓ کی اولاد سے ہیں۔؟ فرمایا کہ حضرت حسینؓ کی اولاد ہیں الخ (از نوشتہ صاحبزادۂ محترم)

[3] یہ بزرگ اکبری دور کے مشائخ میں سے ہیں ۹۸۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (دارالعلوم)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی خدمت میں دیوبند، نانوتہ اور میرٹھ میں رہ کر تمام علوم فنون کی تکمیل کی۔ اور اپنے استاذ کے کمالاتِ علمیہ کے مکمل آئینہ بن گئے حضرت قاسم العلوم قدس سرہٗ اپنے اس جلیل القدر تلمیذ کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ ہمیشہ میر صاحب ' میر صاحب ' کے نام سے پکارتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ اپنے اس عزیز شاگرد کی وجہ سے چند مرتبہ امروہہ بھی تشریف لے گئے تھے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کے علاوہ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری۔ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی، مولانا عبدالقیوم صاحب ترلی بھوپال اور شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی سے بھی حدیث میں اجازت حاصل کی ہے۔

سلسلہ تدریس

اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی طرح آپ کو بھی علم دین کی نشر و اشاعت کا شوق ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ چنانچہ جس وقت آپ فارغ التحصیل ہوئے تو نوجوان تھے۔ سبزہ آغاز تھا۔ کہ خورجہ تشریف لے گئے۔ خورجہ کے بعد سنبھل، دہلی کے مدارس میں مختلف اوقات میں صدر مدرسی کے عہدے پر فائز رہے۔ اور علوم دین کی نشر و اشاعت فرماتے رہے۔

جس وقت ۱۲۹۶ھ میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے ایما سے مدرسۃ الغرباء عرف مدرسہ شاہی مراد آباد قائم ہوا۔ تو اس کے پہلے صدر مدرس آپ ہی تھے ۱۳۰۳ھ تک (گویا کہ ۷ یا ۸ سال) آپ کا اس مدرسہ سے تعلق رہا۔

۱۳۰۳ھ میں آپ مستعفی ہو کر وطن عزیز امروہہ تشریف لے آئے۔ اور یہاں علوم دین کی نشر و اشاعت شروع کی۔ اور جامع مسجد میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی تشکیل جدید کی اپنی بنیاد کے اعتبار سے یہ مدرسہ حضرت قاسم العلوم والمعارفؒ کا قائم کیا ہوا ہے۔ جو ایک مکتب کی حیثیت سے چل رہا تھا۔ آپ نے اسی کو جامع مسجد میں اعلیٰ پیمانہ پر چلانا شروع کیا۔ اور مختلف فنون مثلاً طب، منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر و فقہ

ذخیرہ کے ماہرین کو جمع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں مدرسہ دور و نزدیک شہرت پا گیا۔ اور خدمت دین کرنے لگا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے مدرسہ کے حق میں دعا فرمائی اور ایک مکتوب خاص تحریر فرما کر ارسال فرمایا۔

"از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا برکت عزیزم مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مدرسہ امروہہ رزقہ اللہ تعالیٰ محبتہٗ ومعرفتہٗ بعد سلام مسنون و دعائے خیر و برکت کہ واضح رائے سعادت ہو کہ آپ کا نامہ مرقومہ ۳۰ رشعبان ۱۳۰۵ھ قدسی وارد ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اپنے فضل و کرم سے آپ کے مدرسہ کی مدد و اعانت کرتا رہے گا۔ اور سب سہاروں سے باقی اور لازوال سرمایہ توکل ہے۔ جس چیز کا یا جس کا اللہ جلّ جلالہٗ خود کفیل ہوا تو اس کا کیا کہنا ہے آپ لوگ نظر حضرت حق کی رحمت پر رکھ کر اس کے بندوں کو با خلاص تعلیم و تلقین فرمائیے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مستطیع فرما کر شرف زیارت حرمین شریفین سے مشرف فرمادے۔

السلام علیکم و علیٰ من لدیکم ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ

(دارالعلوم صفحہ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ)

مدرسہ امروہہ کے قیام کے چند سال بعد بطلبی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔ مدرسہ عربیہ دارالعلوم دیوبند میں بھی آپ نے چند ماہ درس دیا ہے۔ بیضاوی شمس بازغہ صدرا آپ کے سپرد کی گئیں۔ اور آپ کو اور حضرت شیخ الہندؒ کو ایک ہی درجہ میں رکھا گیا البتہ آپ کی تنخواہ حضرت شیخ الہندؒ سے کچھ زیادہ تھی۔ کچھ عرصہ آپ کو مدرسہ امروہہ کے ذمہ دار حضرات یہ کہہ کر "ہمارا باغ اجڑنے کا اندیشہ ہے" لے آئے۔ اور پھر آپ نے مدرسہ امروہہ میں سلسلہ درس شروع کر دیا۔

حلقۂ درس | حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے تمام کمالات کا آئینہ

اور نمونہ آپ کو کہا جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ خود حضرت قاسم العلوم والمعارف ارشاد فرماتے تھے۔ کہ :-

ان کا ذہن چاندی ہے اور میرا ذہن سونا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے وہ مجھ سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اھ (معناً از قصص الاکابر)

اس ارشاد کے بعد حضرت محدث امروہی کے فضل وکمال کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم دارالعلوم دیوبند کی مدرسی اور حضرت شیخ الہندؒ کے برابر مرتبہ اور تنخواہ میں تفاضل ایک ایسی روشن دلیل ہے۔ جس سے آپ کا فضل وکمال بوضاحت ثابت ہوتا ہے۔

تقریر و تحریر میں حضرت نانوتویؒ کا رنگ غالب ہے۔ اگر یہ کہدیا جائے کہ:-

"فضل وکمال قاسمی کی صحیح جانشینی اگر کسی نے کی ہے تو وہ صرف حضرت محدث امروہیؒ کی ذات ہے" تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔

حضرت محدث امروہیؒ کی تقریر نہایت جامع اور رشستہ اور پُرمغز ہوتی تھی۔ تقریر میں وہ اپنے استاذ کا مکمل نمونہ تھے۔

بعض حدیث کی کتابوں کی وہ خود قرأت کیا کرتے تھے ان کے سامنے عبارت پڑھنے کے لئے بڑی قابلیت اور ہمت کی ضرورت تھی۔ عبارت کی غلطی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ فوراً چہرے پر جلال برسنے لگتا تھا۔ کتب صحاح دو سال میں ختم کراتے تھے۔ ایک سال میں ترمذی اور دوسرے سال میں بخاری پڑھاتے تھے۔ تقریر نہایت تفصیل سے فرماتے۔ ہر مسئلہ کو نقلی و عقلی حیثیت سے ثابت کرتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں ایک طرف حضرت مولانا قاسم العلوم کے طریقۂ استدلال کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اور دوسری طرف حکمت ولی اللّٰہی اور ذکاوت عزیزی اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ صاحب تذکرۃ الکرام تحریر فرماتے ہیں :-

" آپ ان جملہ علوم کی جو درس نظامیہ کے نظام تعلیم میں شامل ہیں تعلیم دیتے لیکن زیادہ تو شغل حدیث وتفسیر وفقہ کی تدریس سے تھا۔ آپ کے تلامذہ سے سُنا گیا کہ بیان ایسا واضح اور پُر شوکت ہوتا کہ دقیق سے دقیق مسائل طلبا کی سمجھ میں بہت سہولت سے آجاتے۔ اور اس کے ساتھ مضمون کی عظمت بھی ذہن نشین ہوجاتی " (دارالعلوم)

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تقریر کا ایک نمونہ پیش کر دیا جائے۔ لہٰذا ذیل میں ترمذی شریف کی ایک حدیث پر آپ کی تقریر ملاحظہ فرمایئے۔

باب ماجاء اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ نکرہ تحت نفی واقع ہوا جس سے عموم سمجھ میں آتا ہے یعنی کوئی صلوٰۃ نہیں جب اقامت صلوٰۃ کی جائے۔ مگر وہی نماز جس کی اقامت کی گئی ہے۔ تو جن صاحبوں نے یہ سمجھا کہ رکعتی الفجر بھی جائز نہیں۔ ان کے مذہب میں تو کوئی قصور نہیں۔ لیکن حنفیہ کو اس کا جواب دینا ہوگا کہ صریح حدیث موجود ہے کہ کوئی صلوٰۃ نہیں۔ پھر حنفیہ نے جو دو رکعت فجر (سنت) کو علیحدہ مکان میں پڑھنے کا حکم دیا۔ اس کا سبب؟ تو یا تو یہ جواب دیا جائے کہ حاشیہ بخاری میں جناب مولانا احمد علی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد اسحاق صاحب سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ بیہقی نے روایت کیا ہے۔ کہ اسی حدیث میں استثنار رکعتی الفجر کا موجود ہے۔ دلیل نقلی تو یہ کافی ہے۔ اور بپاس خاطر شوافع مان لیا جائے کہ یہ جو بخاری کے حاشیہ پر بیہقی کی روایت موجود ہے پایۂ صحت کو نہیں پہونچی۔ تو خاص حدیث میں اگر غور کیجئے اور تدبّر فرمایئے تو جواب نکل آتا ہے۔ آپ نے إِذَا کا لفظ فرمایا ہے اور اذا دو حال سے خالی نہیں یا مکانی یا زمانی۔ اگر زمانی مراد ہو تب تو چاہیئے کہ ہم کو مثلاً یقینی معلوم ہے کہ ظہر کی اقامت فلاں وقت

ہوتی ہے۔ کعبہ شریف (مسجد الحرام) یا جامع مسجد دہلی میں تو یہاں پر ہم کو سنن دنوافل کا پڑھنا ممنوع ہوا حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں یا مثلاً مسجد میں اقامت ہوئی تو معتدد کو یا جو اس مسجد سے علیحدہ نماز پڑھ رہا ہو۔ اس کو نماز پڑھنا ہرگز جائز نہ ہو تو چونکہ زمانہ پر حمل کرنا محال کو مستلزم ہے تو وہ تو مراد ہو نہیں سکتا تو اب متعین ہو گیا کہ اذا مکانی ہے تو حاصل حدیث یہ قرار پائے گا کہ جس مکان میں اقامت صلوٰۃ ہو۔ وہاں پر فرض صلوٰۃ جائز ہے نہ کوئی اور نماز جائز ہے۔ امام صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔ کہ بے شک اس جلسہ اور مکان میں جائز نہیں اگر کوئی سنن پڑھے تو علیحدہ باب مسجد پر یا فصیل مسجد پر یا اگر اقامت اندر ہو تو باہر اور باہر ہو تو اندر پڑھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں فقہا مختلف ہیں کوئی تو اس بات کا قائل ہوا کہ باب پر پڑھنا چاہیئے۔ اس نے تو اس بات پر نظر کی کہ مرور رجل مصلّی کے سامنے جائز نہیں۔ اگرچہ وہ باہر نماز پڑھتا ہو۔ اور کوئی اس بات کا قائل ہوا کہ باہر پڑھے۔ اگر اقامت اندر ہوئی ہو۔ اور اندر پڑھے اگر اقامت باہر ہوئی ہو۔ تو اس نے اس بات پر نظر کی کہ قاری قرآن ایک آیت سجدہ چند بار اندر چلتے ہوئے پڑھے تو اس پر ایک ہی سجدہ لازم آئے گا۔ اور اگر باہر آجائے اور اسی آیت کو پڑھے تو دوبارہ سجدہ لازم آجائے گا۔ تو چونکہ جلسہ مختلف ہو گیا۔ تو اس نے اس بات پر نظر کی کہ دونوں کا حکم علیحدہ ہے۔ وہ مکان اور ہے اور یہ ہے۔ اختلاف چھوٹی بڑی مسجد ہونے کے باعث ہے وہ حکم پہلا چھوٹی مسجد کا تھا۔ اور یہ بڑی مسجد کا۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ سنت ظہر میں بھی یہ حکم ہونا چاہیئے۔ تو اس کا یہ جواب ہے کہ اس کے (ظہر کے) بعد وقت ایسا نہیں جس کے بارے میں نہی وارد ہو۔ جیسا کہ بعد فجر نہی وارد ہے۔ تو اس کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے۔

(شکریہ نسیم فریدی صاحب)

آپ کے حلقۂ درس میں جنّات بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ مولانا بنے میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

میری والدہ مرحومہ فرمایا کرتی تھیں کہ تہجد کے وقت جہاں مولانا آرام کرتے تھے۔ ایک آواز آئی۔ کہ مولانا صاحب بیدار ہو جائیے۔ والدہ صاحبہ نے ایک مرتبہ دریافت کیا تو فرمایا کہ تم کو ان باتوں سے کیا مطلب۔

میرے تایا زاد بھائی منشی سید ناظر حسن صاحب (آپ ابھی حیات ہیں) نے بیان کیا کہ میں رانچی میں ملازم تھا میرے ساتھ چند صاحب امروہہ کے اور بھی ملازم تھے سب نے مل کر ایک بڑا مکان کرایہ پر لے لیا اس کا کچھ حصہ شکستہ تھا۔ مکان کا بیت الخلاء ذرا فاصلہ پر تھا۔ منشی خلیل اللہ کو جو حضرت امروہوی کے عزیز ہوتے تھے پیچش ہوگئی۔ رات میں بیت الخلاء تو نہ جا سکے۔ البتہ مکان کے اس شکستہ حصہ (کھنڈر) میں بیٹھ گئے جو غیر آباد تھا۔ اچانک کئی آدمی نمودار ہوئے۔ اور انھوں نے خلیل اللہ کو پکڑ لیا۔ اور آپس میں کہنے لگے مارو! پیٹو! اس نے ہمارا مکان خراب کر دیا۔ اور ان کو پکڑ کر چارپائی تک لائے۔ اور چاروں طرف سے گھیر لیا اور سزا کی تجویز ہونے لگی۔ وہیں میں (سید ناظر حسن) بھی سو رہا تھا۔ دریافت کیا کہ یہ کون سو رہا ہے؟ خلیل اللہ صاحب کی زبان سے نکلا۔ کہ یہ مولانا احمد حسنؒ صاحب کا بھتیجہ ہے۔ دریافت کیا کہ کون مولانا احمد حسنؒ؟ انھوں نے جواب دیا کہ امروہہ کے محدث اور میں ان کا خالہ زاد بھائی ہوں۔ یہ سنتے ہی انھوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے استاذ ہیں۔ اور فوراً ہی اپنی سختی کو چھوڑ دیا اور کہا کہ ہمارا قصور معاف کرو اور اطمینان سے رہو۔ جب بھائی صاحب امروہہ آئے تو حضرت امروہی نے فرمایا کہ بھتیجے تم نے اپنے چچا کو دیکھا۔ اھ (قلمی مسودہ)

(تذکرۃ الخلیل)

حضرت محدثؒ امروہیؒ کی علمی شان

مناظرہ نگینہ اپنے محترم استاذ کی طرح آپ کو بھی مناظرہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چونکہ حضرت نانوتوی کے ہمراہ متعدد مناظروں میں شریک رہ چکے تھے۔ اس لئے آپ کے مناظروں میں قاسمی رنگ غالب رہتا تھا۔

۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء نگینہ ضلع بجنور میں آریوں کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ اور جس میں حضرت محدث امروہوی اور حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے وکالت فرمائی۔ اور ایسی زوردار تقریر فرمائی۔ کہ آریوں کے چھکے چھوٹ گئے حضرت محدث امروہوی نے اپنی تقریر کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

"بس یہ محسوس ہو رہا تھا کہ استاذ مرحوم پاس کھڑے ہیں۔ اور جو وہ بتلا رہے، میں وہ بول رہا ہوں۔ جب وقت ختم ہوا تو اس کی اطلاع دی گئی۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ میری تقریر کا وقت ختم ہو گیا۔

سچ ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

جناب محمد ابراہیم صاحب ذوق پھلاودی نے ایک قطعہ بیان فرمایا ہے ؎

تیغ زبانِ حضرتِ احمد حسن نے کیا	مضمون آبدار کا جوہر دکھا دیا
ایسی لگائی مہر مخالف کے منہ تھی بند	کیا ہی نگینہ پر یہ نگینہ جما دیا
کانوں نے جو سنے وہ مضامین تھے عجیب	آنکھوں سے علم قاسمی سب کو دکھا دیا

۱؎ یہ تقریر بعد عوت الاسلام کے نام سے "افاداتِ احمدیہ" میں شائع ہو چکی ہے۔ تقریر ایسی ہے گویا حضرت نانوتوی نے بیان فرمائی ہے۔

مشتاق تھے جو حضرت قاسم کی دید کے
گویا جمال قاسمی ان کو دکھا دیا!

(از رسالہ دارالعلوم)

ردِّ قادیانیت

ردِّ قادیانیت میں ابوالحسن صاحب علی میاں ندوی نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی، مولانا محمد علی صاحب مونگیری کا نام لیا ہے لیکن اس سلسلے میں حضرت محدث امروہی نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ کے زمانہ میں امروہہ کے مولوی محمد احسن صاحب اور حکیم نورالدین صاحب مرزا کی مہدویت اور مسیحیت کی تصدیق کر کے مرتد اور بے دین ہوگئے تھے۔ صاحب تذکرۃ الکرام فرماتے ہیں۔

"انھوں نے آخر حصۂ عمر میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ مسیحیت و مہدویت کی تصدیق کی اور جماعت احمدیہ مرزائیہ مشرب کی تبلیغ بھی کرتے رہے تا الخ

ان کو قادیانی مشن کی جانب سے گھر بیٹھے تنخواہ برابر ملتی رہی۔

(از رسالہ دارالعلوم)

جب یہ فتنہ امروہہ پہونچا تو آپ نے شمشیر برہنہ ہو کر اس کا مقابلہ کیا اور اس فتنہ کا قلع قمع کر دیا۔ حضرت محدثؒ نے اس سلسلہ میں مرزا غلام احمد کو بھی مناظرہ و مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ آپ نے ایک خط مرزا کو لکھا۔

بسم اللہ۔ آپ تشریف لایئے میں آپ کا مخالف ہوں۔ آپ مسیح موعود نہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ آپ اپنے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میں بنام خدا مستعد ہوں خواہ مناظرہ کریں یا مباہلہ۔ آپ اپنے اس دعویٰ

کا احادیث صحیحہ معتبرہ اور قرآن پاک سے ثبوت دیں۔ اور میں انشاء اللہ تعالیٰ
اس دعوے کی قرآن واحادیث صحیحہ سے تردید کروں گا۔ والسلام علیٰ
من اتبع ۔ راقم :۔ خادم الطلبہ احقر الزمن احمد حسن غفرلہٗ

(دار العلوم)

بالآخر رام پور میں نواب حامد علی خاں کی زیر صدارت ۱۵ ار جون ۱۹۰۹ء کو
قلعہ میں یہ مناظرہ ہوا ۔ قادیانیوں کو بُری طرح سے شکست ہوئی ۔
ردّ قادیانیت میں آپ کی ایک عربی تقریر کا اقتباس رسالہ دار العلوم شعبان
۱۳۷۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس کا صرف اُردو ترجمہ پیش کرتے ہیں :۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ مسیح ابن مریم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ
آسمان کی طرف اٹھالیا۔ اور ان کو قتل وصلیب سے بچالیا۔ وہ قریب
قیامت میں خروج دجال کے بعد دمشق کے جانب شرقی منارہ کے نزدیک
اتریں گے وہ دو زرد چادروں میں لپٹے ہوئے ہوں گے وہ دو فرشتوں
پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا
ہوگا۔ گویا وہ ابھی غسل خانے غسل کر کے برآمد ہوتے ہیں۔ وہ صلیب کو
توڑیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیہ موقوف کر دیں گے۔ دجال اکبر ان
کے ہاتھ سے قتل ہوگا۔ ان کے سانس سے کافر مر جائے گا۔ جہاں تک
ان کی نظر جائے گی باطل ختم ہو جائے گا۔ یہ باتیں حق ہیں اس میں باطل
کو راہ نہیں، کتاب اللہ سے اور نبی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم
کے اقوال سے ہی ثابت ہے۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مسیح ابن مریم
وفات پاگئے اور وہ خود (نعوذ باللہ) مسیح موعود ہے۔ اس نے اللہ
اور اس کے رسول سے بغاوت کی۔ اور اس نے کتاب اللہ اور احادیث

کی نصوص ظاہرہ سے اعراض کیا۔ اور امر ثابت کی مخالفت کی وہ من یشاقق الرسول الآیۃ کا مصداق ہے۔ یہ مرزائی لوگ جھوٹ بولتے ہیں یہ نزولِ عیسیٰ کے منکر ہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے قول کو باطل کرکے دکھلائے گا۔ اور حق کی فتح ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہترین کارساز ہے۔ اے مسلمانو! اور اے کتاب اللہ کتاب الرسول کے شیدائیو! تم اس گمراہ اور گمراہ کن شخص سے بچتے رہو۔ اور اس کے میل جول سے سخت پرہیز رکھو۔ اس لئے کہ یہ اس امت کا دجال ہے جضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ قیامت قایم نہ ہوگی۔ جب تک تیس[۳۰] جھوٹے دجال نہ آجائیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اھ

(دارالعلوم ۱۳۷۳ھ)

فتاویٰ حضرت محدث امروہوی کے پاس اطرافِ ملک سے استفتا آتے تھے۔ آپ ان کا جواب تحریر فرماتے تھے۔ رسالہ دارالعلوم ۱۳۷۳ھ میں آپ کے دو فتوے شائع ہوئے تھے۔ جس میں ایک ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔

(س) اذان میں نام پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر انگوٹھا چومنا اور آنکھوں سے لگانا سنّت ہے یا فرض۔ یا کیا ہے۔؟

(ج) نہ سنّت ہے، نہ فرض، نہ واجب، نہ مستحب، بلکہ بدعت ہے۔ اور بے اصل احادیث جو کہ اس بارے میں نقل کی جاتی ہیں۔ اور جن روایات کے بھروسے سے تقبیل ابہام کو سنت یا مستحب سمجھا جاتا ہے۔ وہ جملہ بتحقیق محدثین نا معتبر ہیں۔ بلکہ جملہ موضوعات امام شوکانی اپنی کتاب فوائد مجموعہ فی احادیث الموضوعہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

حدیث مسح العینین بباطن انملتی الابہامین عند قول المؤذن

اشہد ان محمد الرسول اللہ الخ رواہ الدیلمی فی مسند
الفردوس عن ابی بکر الصدیق رضی مرفوعاً قال ابن الطاہر
فی التذکرۃ لایصح ۔ اھ

اور نیز تحریر فرماتے ہیں:۔

من قال حین یسمع اشہد ان محمد الرسول مرحبا بحبی
وقرۃ عینی محمد بن عبد اللہ ثم یقبل ابہامیہ ویجعلہما
علی عینیہ لم یسقم ولم یرمد ابداً قال فی التذکرۃ لایصح

اور شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی مقاصد حسنہ فی الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ
میں تحریر فرماتے ہیں۔

ولا یصح فی المرفوع من کل ھذا شیٔ

اور ملّا علی قاری علیہ الرحمۃ نے تذکرۃ الموضوعات میں ان احادیث کو از
جملہ موضوعات تحریر فرمایا ہے۔ روایات فقہ جواس کے استحباب میں خزانۃ الروایات
یا کنز العباد اور جامع الرموز و فتاویٰ صوفیہ سے نقل کی جاتی ہیں۔ وہ بھی نامعتبر ہیں۔
کتب متداولہ و معتبرہ عند العلماء میں کہیں اس قسم کی روایات کا پتہ نہیں۔ اور خود یہ
کتابیں جن سے ان روایات کو نقل کیا جاتا ہے۔ اور نام ان کے اوپر مرقوم ہوئے۔
عند العلماء نامعتبر ہیں۔ ان کتب میں رطب و یابس کو بلا تنقیح جمع کر دیا ہے۔
چنانچہ مولانا المولوی عبد الحیٔ صاحب نے النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر
میں اس مضمون کو مفصل لکھا ہے۔ بالجملہ مسئلہ تقبیل الابہامین ایک بے اصل
مسئلہ ہے۔ احادیث صحیحہ و روایات معتبرہ کے بالکل خلاف۔ واللہ تعالیٰ اعلم
بالصواب۔

حررہ خادم الطلبہ۔ احمد حسن غفرلہٗ

مخصوص تلامذہ

(۱) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر امروہوی۔
(۲) حضرت مولانا محمد انیس صاحب۔
(۳) حضرت مولانا سید رضا حسین صاحب
(۴) حضرت مولانا خادم حسین صاحب
(۵) حضرت مولانا عبدالغفور صاحب
(۶) حضرت مولانا ظہور الحق صاحب
(۷) حضرت مولانا خلیل اللہ صاحب
(۸) حضرت مولانا خان زماں صاحب
(۹) حضرت مولانا نور الزماں صاحب امروہوی
(۱۰) حضرت مولانا محمود حسن صاحب سہسوانی
(۱۱) حضرت مولانا قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادی
(۱۲) حضرت مولانا احمد حسن صاحب
(۱۳) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب
(۱۴) حضرت مولانا حکیم فریدا احمد صاحب عباسی
(۱۵) حضرت مولانا حکیم مختار احمد صاحب امروہوی۔
(۱۶) حضرت مولانا حکیم اسرار الحق صاحب۔
(۱۷) حضرت مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب کٹھوری۔

سلوک و تصوف | آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہیں۔ اجازت بیعت اور خلافت حضرت حاجی صاحب

موصوف اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے حاصل ہے۔ استاذِ محترم کی طرح آپ میں بھی انتہا سے زیادہ انخفائے حال تھا، اس وجہ سے اکثر وبیشتر علمی لائن سے ہی آپ کا تعلق رہا۔ حالانکہ اپنے زمانے میں تصوف کے اونچے مقام پر فائز تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں اپنا سلام اور حاضر نہ ہونے کی معذوری کہلا کر بھیجی۔ تو حضرت حاجی صاحب موصوف نے فرمایا۔

"ہماری یہ ٹوپی ان کو دیدینا اور یہ کہنا کہ جو کام تم امروہہ میں رہ کر کے انجام دے رہے ہو وہ یہاں کی حاضری سے بہتر ہے" الخ (دارالعلوم)

مولوی بدرالدین صاحب آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔ لیکن محمد احسن قادیانی کے یہاں آمد و رفت ہونے کی وجہ سے قادیانی ہوگیا تھا۔ ایک دن اس کو حضرت محدث امروہی کے پاس لایا گیا۔ تو آپ نے مولوی بدرالدین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:۔

حقیقت میں تم ہمارے طبیب روحانی ہو۔ ہمیں غرور ہو چلا تھا کہ ہمارے کوئی شاگرد اور ہمارے پاس بیٹھنے والا باطل میں گر فتار نہیں ہوسکتا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم نے ہمارے غرور کی اصلاح کردی۔ اھ

(دارالعلوم)

بس یہ الفاظ فرمائے تھے کہ بدرالدین رو کر پیروں میں گر پڑا۔ اور تائب ہوگیا۔

مرض الوفات

ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کے آخری ہفتہ چند دن بخار آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ امروہہ میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ آخر اسی میں مبتلا ہو کر "المطعون شهيد" کا مصداق ہوئے۔ اور ۲۸ ربیع الاول کو واصل بحق ہوئے۔ مادۂ تاریخ۔

(۱) شہید اعظم

(۲) ہوئی تصویر قاسم صفحۂ دنیاسے لو۔

(از شیخ الہند)

نہایت خوش لباس خوش اخلاق اور حسین وجمیل بزرگ تھے۔ وصال کے وقت تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادہ مدظلہٗ چھوڑے۔ صاحبزادہ جناب مولانا سید محمد رضوی صاحب عرف بنّے میاں مدظلہٗ (تذکرہ مشائخ دیوبند کے قلمی معاون) اپنے والد مرحوم کی نشانی اور انہی کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ امروہہ کے مدرسہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسرؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ قرأت حفص میں قاری ضیاءالدین صاحب کے شاگرد ہیں۔ ۳۰ سال تک حیدرآباد دکن میں علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ اب پنشن ہوکر امروہہ قیام پذیر ہیں۔

نوٹ:۔ کتابت ہوچکنے کے بعد مجھے یہ روایت پہونچی کہ جس دن حضرت نانوتویؒ نے حضرت مولانا احمد حسن صاحب اور حضرت شیخ الہندؒ کو بخاری شریف ختم کرائی۔ تو دونوں کا نام لے کر یہ وصیت فرمائی۔

" دیکھو! دین کی بات بلاخوف اور بلا رو رعایت بے کم وکاست بیان کرنا۔ اور اہل سلوک سے نہ الجھنا۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ

از ۱۲۸۷ھ تا ۱۳۳۴ھ

نام ونسب آپ کا اسم گرامی محمد یحییٰ، تاریخی نام بلند اختر اور سن ولادت ۱۲۸۷ھ ہے۔ والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد اسماعیل صاحب کاندھلویؒ آپ کاندھلہ کے صدیقی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا جدی نسب حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب اور مولانا مظفر حسین صاحبؒ سے چھٹی پشت میں مولانا فیض محمد صاحب سے اس طرح جا ملتا ہے۔

مولانا محمد یحییٰ بن مولانا محمد اسماعیل بن غلام حسین بن حکیم کریم بخش بن حکیم غلام محی الدین بن مولوی محمد ساجد بن مولوی فیض محمد بن مولوی محمد شریف بن مولوی محمد اشرف بن جمال محمد شاہ بن بابن بن بہاء الدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا اصل وطن جھنجھانہ ہو آپ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے سمدھیانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے۔ غدر کے بعد بستی نظام الدین میں رہنا اختیار کیا۔ اور آخر وقت تک وہیں رہے۔ لیکن پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ کا عقد ثانی کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش کے خاندان میں ایک نیک بی بی صفیہ بنت مولوی ضیاء الحسن صاحب بن مولوی نور الحسن صاحب بن مولوی ابو الحسن صاحب بن مفتی الٰہی بخش صاحب سے ہوا۔ اس وجہ سے کاندھلہ برابر آمد و رفت رہتی تھی۔ اور وہ بھی وطن کی طرح ہو گیا تھا۔

مفتی الٰہی بخش صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے

نامور مفتی ہیں۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب ذاکر و شاغل متقی و پرہیزگار اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ تلاوتِ قرآن اور درسِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ سے خاص شغف تھا جس کی وجہ سے آپ خاص مقام کے مالک تھے۔

"ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے طریق سلوک کے حصول کی خواہش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں، جو اس طریق اور ان ذکر و اذکار کا مقصود ہے۔ وہ آپ کو حاصل ہے الخ

(حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص۳۷)

تواضع اور خدمتِ خلق کا یہ عالم تھا کہ آتے جاتے مسافروں کا بوجھ اتروا کر پانی پلاتے تھے۔ پھر دو رکعت شکرانہ کی ادا کرتے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کو عبادتِ الٰہی کا اس قدر شوق تھا کہ گھر میں پروگرام مقرر کر دیا تھا کہ رات بھر گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور رجاگتا تھا۔ بارہ ۱۲ ایک بجے تک مولانا محمد یحییٰ صاحب مطالعہ میں مشغول رہتے۔ اس وقت مولانا محمد اسماعیل صاحب بیدار ہو جاتے۔ اور پچھلے پہر اپنے بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحب کو بیدار کر دیتے۔ آپ کی تاریخ وفات ۲۶ شوال ۱۳۱۵ھ ہے مادہ تاریخ "غفرلہٗ" ہے۔ آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ آپ کے جنازے میں اژدہام کثیر تھا۔ جنازہ میں بلّیاں لگا دی گئی تھیں۔ مگر بہت سے لوگوں کو کندھا دینے کی نوبت تک نہ آئی۔ لوگوں نے بار بار نماز جنازہ پڑھی۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی والدہ ماجدہ بھی کوئی معمولی درجہ کی بی بی نہ تھیں۔ حافظ قرآن تھیں۔ قرآن شریف اتنا اچھا یاد تھا کہ کبھی متشابہ نہ لگتا۔ اور ایک ہفتہ میں قرآن مجید پورا کر لیتی تھیں۔ اس کے علاوہ درود شریف پانچ ہزار،

اسم ذات اللہ پانچ ہزار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انیس سو یا مغنی گیارہ سو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ گیارہ سو اَللہُ الصمد گیارہ سو لا الٰہ الا اللہ بارہ سو یا حیی یا قیوم دوسو۔ حسبی اللہ نعم الوکیل پانچ سو۔ سبحان اللہ دوسو مرتبہ۔ الحمد للہ دوسو۔ لا الٰہ الا اللہ دوسو۔ اَللہُ اکبر دوسو۔ استغفار پانچ سو۔ افوض امری الی اللہ ایک سو۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل اکیسو۔ رب انی مغلوب فانتصر ایک سو۔ رب انی مسنی الضر وانت ارحم الرٰحمین ایک سو۔ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ایک سو اور ایک منزل قرآن شریف کی تلاوت کا روزانہ کا معمول تھا۔ (از تذکرۃ الخلیل)

یہ ہی نہیں اس گھرانے کی سب ہی بیبیوں کا یہی عالم تھا۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنے رسالہ میں بیان فرمایا ہے:۔

"گھر میں بیبیاں عام طور پر نوافل میں اپنے اپنے طور پر قرآن مجید پڑھا کرتی تھیں۔ اور عزیز مردوں کے پیچھے تراویح و نوافل میں سنتی تھیں۔ رمضان المبارک میں قرآن مجید کی عجیب بہار رہتی، گھروں میں جابجا قرآن مجید ہوتے اور دیر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ عورتوں کو علم کا اتنا ذوق تھا کہ قرآن مجید پڑھ پڑھ کر مزہ لیتیں۔ اور نماز کے بعد اپنے مقامات کا ذکر کرتی تھیں نماز میں ایسی محویت اور استغراق تھا کہ لیا اوقات بعض بیویوں کو گھر میں پردہ کرانے اور کسی حادثہ وغیرہ میں لوگوں کے آنے جانے تک کا احساس نہ ہوتا۔ قرآن شریف مع ترجمہ مع اردو تفسیر مظاہر حق، مشارق الانوار، حصن حصین۔ یہ عورتوں کا منتہیانہ نصاب تھا۔ اس خاندان کا یہ عام رواج تھا۔ اس وقت گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں اور صحبتیں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کے خاندان کے قصوں اور حبر چوں سے گرم تھیں۔ ان بزرگوں کے واقعات
مَردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے۔ مائیں اور گھر کی بیبیاں بچوں کو
طوطے، مینا کے قصوں کے بجائے یہی رُوح پرور واقعات سناتیں الخ

(حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت صلے)

تعلیم و تربیت یہ وہ ماحول اور وہ گودیں تھیں کہ جن میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب نے آنکھ کھولی تھی اور پرورش پائی تھی۔
پھر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ولی باپ اور ولیہ ماں کا سایہ سر پر قایم رکھا چنانچہ بچپن ہی سے آپ کے حرکات و سکنات کی نہایت سخت نگرانی ہوتی تھی۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

والد صاحب کو وضو کے اوراد کا خاص اہتمام تھا۔ اور ہم پر بھی اصرار تھا کہ پابندی کریں۔ مگر مجھے علم کی دھن تھی۔ اس لئے میں وضو کرتا ہوا بھی فارسی اور عربی کی لغات یاد کیا کرتا تھا۔ والد صاحب میری رٹائی کو سنتے تو ملامت کے طور پر فرمایا کرتے تھے۔ خوب وضو کی دعائیں پڑھی جا رہی ہیں۔ شرم کی بات ہے۔ (تذکرۃ الخلیل صـ۱۲۹)

قرآن شریف آپ نے سات سال کی عمر میں حفظ کر لیا تھا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

والد صاحب کی طرف سے حکم تھا کہ جب تک پورا قرآن شریف حفظ نہ کرلوگے روٹی نہ ملے گی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں عموماً ظہر سے قبل پورا قرآن پاک ختم کر لیا کرتا تھا اور کھانا کھا کر چھٹی کے وقت اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا تھا الخ (تذکرۃ الخلیل صـ۱۳۰)

لہٰذا ظاہر ہے کہ جب بچہ کو زمانہ طفولیت میں تحصیل علم کا اس قدر .... شوق ہوگا۔ تو اس کا تبحر فی العلم کس درجہ کا ہوگا۔ چنانچہ آپ کا علامہ

وقت ہونا مسلم ہے۔ فنون عقلیہ اور فنون نقلیہ میں آپ کی مہارت تامہ بچپن ہی سے مشہور تھی اکثر کتابیں خود ہی پڑھی تھیں۔ کسی استاذ سے استعانت کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "سلم ..... مجھے ازبر یاد تھی۔ اور قیسیح لے کر میں نے اس کی عبارت کو از اوّل تا آخر دو سو، دو سو مرتبہ پڑھا ہے۔ ادب عربی میں آپ کو اتنی مہارت تھی کہ عربی نظم و نثر بلا تکلف لکھ لیتے تھے۔ مگر یوں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"تمام ادب میں استاذ سے میں نے صرف مقامات حریری کے ۹ مقامے پڑھے ہیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ استاذ نے کہدیا تھا کہ میرے مکان کو آتے جاتے راستے میں پڑھ لیا کرو۔ اس لئے میں ساتھ جاتا۔ اور راستہ میں پڑھا کرتا تھا۔ اور اکثر جگہ استاذ فرمایا کرتے تھے کہ اس لفظ کے معنی مجھے یاد نہیں خود دیکھ لینا الخ (تذکرۃ الخلیل ص ۱۲۹)

ابتدائی عربی کی کتابیں آپ نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد دیوبند میں مقامات حریری کے ۹ مقامے تک مذکورہ کیفیت سے پڑھے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے وطن کے مدرسہ یعنی کاندھلہ میں مقامات حریری مولانا یدُاللہ صاحب سے اور منطق بھی مولانا یداللہ صاحب سے نہایت انہماک سے پڑھی چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"حمداللہ میں نے ۱۸ دن میں پڑھا ہے۔ ظہر کے بعد اس کا سبق ہوتا تھا اس لئے میں صبح ہی حمداللہ اور اس کے حواشی لے کر مطالعہ دیکھنے کو نانی اماں کی چھت پر جا بیٹھتا تھا۔ اور بارہ بجے اتر کر روٹی کھایا کرتا تھا بسا اوقات حمداللہ کے سبق میں استاذ سے بحث ہو جاتی کہ میں جو مطلب سمجھا ہوتا وہ اس کو غلط بتلاتے۔ اور دوسرے عنوان سے تقریر

فرماتے تھے ۔میں کہہ دیا کرتا تھا کہ مطلب تو یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں"۔

(تذکرۃ الخلیل صـ۱۲۹)

یہ خداداد لگن اور قابلیت تھی کہ آپ نے محض اپنے حافظہ سے ادب کی اکثر درسی کتابیں لکھ کر طلبا کو دیدی تھیں نفحۃ الیمن، متنبی، حماسہ اب بھی آپ کے لکھے ہوئے ہیں ۔اور اصل نسخوں سے حرف بحرف ملتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد یحیٰی جیسے حافظہ کا مالک نہ متقدمین میں گزرا نہ متاخرین میں ۔

ادب و منطق کے علاوہ باقی کتابیں آپ نے دہلی کے مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں مگر حدیث پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا ۔کہ دہلی میں حدیث پڑھنے سے غیر مقلد ہو جاتا ہے ۔اور ارادہ کیا تھا کہ اگر حدیث پڑھنی ہے تو حضرت گنگوہیؒ سے پڑھنی ہے لیکن جب مدرسہ حسین بخش کے سالانہ امتحان کا وقت آیا تو کارکنان مدرسہ نے آپ کا نام بھی بخاری شریف کے امتحان میں لکھ دیا ۔حالانکہ ایک سبق بھی آپ نے اس کا نہیں پڑھا تھا ۔لیکن اہل مدرسہ نے مولانا محمد اسماعیل صاحب پر زور دیا تو مولانا نے فرمایا" محمد یحیٰی کیا حرج ہے ۔ابھی پانچ مہینے باقی ہیں، اس میں پڑھ لو" آپ ارشاد فرماتے ہیں ۔

"چنانچہ وہ پانچ مہینے میں نے نظام الدین کے حجرہ میں گذارے ہیں کہ خود مسجد کے رہنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں ۔بجز ان دو لڑکوں کے کہ جن کے ذمے میری روٹی اور وضو کا پانی لانا مقرر تھا ۔چنانچہ اسی دوران میں کاندھلہ سے میرے نکاح کا تار آیا تو لوگوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا ۔کہ مکتوب الیہ کافی مدت سے یہاں نہیں ہے اور نہ معلوم کہاں چلا گیا ۔غرض اسی دوران میں میں نے بخاری شریف، سیرت ابن ہشام، طحاوی، ہدایہ، فتح القدیر بالاستیعاب اس اہتمام سے دیکھی ہیں کہ مجھے خود حیرت

ہے۔ اتفاق سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ ممتحن تجویز ہوئے۔ اور تشریف لائے تو میرے جوابات دیکھ کر یہ نقطہ فرمائے کہ ایسے جوابات مدرس بھی نہیں لکھ سکتا۔ (تذکرۃ الخلیل صفہ ۱۳)

شوال ۱۳۱۱ھ میں آپ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں دورہ حدیث پڑھنے حاضر ہوئے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت امام ربانیؒ نزول الماء کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بہرحال یہ دورہ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وجہ سے شروع ہوا۔ اور بہت سے حضرات کو اس دورہ میں آپ کے طفیل سے شرکت نصیب ہوئی۔ اسی دورہ کی حضرت امام ربانی کی تقریر ترمذیؒ آپ نے عربی میں قلمبند کی۔ جو الکوکب الدری کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

" الکوکب الدری " باوجودیکہ مختصر ہے۔ مگر مع شئی زائد وہ سب کچھ ہے جو مطولات میں ہے۔ اس کے اوپر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث ..... مظاہر العلوم نے حاشیہ لکھ کر اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔

سلوک و تصوف

سلوک میں اصل چیز خدمت شیخ اور محبت شیخ ہے اگر یہ چیز کسی مرید کو حاصل نہیں تو کچھ بھی حاصل نہیں۔ ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

چنانچہ ۱۳۱۱ھ میں آپ گنگوہ حاضر ہوئے لیکن ایک طالب علم بن کر ہی نہیں بلکہ نیک مرید اور سالک بن کر۔ چنانچہ آپ کو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز سے حد درجہ محبت تھی یہی وجہ تھی کہ جب تک آپ گنگوہ رہے تاحیات حضرت گنگوہیؒ کے پیشکار بن کر رہے۔ حضرت گنگوہیؒ کی جب ظاہری بینائی ختم ہو گئی۔ تو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کو فرمایا کرتے تھے "یحییٰ اندھے کی لاٹھی ہے۔" اگر تھوڑی دیر کے لئے آپ کہیں چلے جاتے تو حضرت امام ربانی بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ غرض کہ بارہ برس

تک حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں اسی لاڈو پیار سے رہے حضرت امام ربانی سے بیعت ہوکر ذکر و شغل بھی شروع کردیا تھا۔ آپ کے سلوک کے حالات بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے فرمایاہے۔

رات کو آپ تنہائی میں مسجد کے حجرے کی چھت پر جاکر رویا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا محمد اسحٰق صاحب نہٹوری نے آپ کو دیکھ لیا اور مزاحاً فرمایا۔ کیوں روتے ہو۔ ؟ کیا گھر والی یاد آرہی ہے۔ آپ نے آکر دن میں حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا حضرت! یہ ایسا کہتے ہیں۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا "بھائی! ایسا نہ کیا کرو۔

حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے وہ عمامہ جو آپ کے سر اقدس پر حضرت حاجی صاحب نے باندھا تھا۔ اور جس کو اصل بیچوں پر آپ نے سی لیا تھا حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کے سر اقدس پر یہ کہکر رکھ دیا۔

" اس کے مستحق تم ہو اور میں آج تک اس کا محافظ اور امین تھا۔ الحمد للہ کہ آج حق کو حقدار کے حوالہ کرکے بار امانت سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ کوئی طالب آئے تو اس کو سلاسل اربعہ میں بیعت کرنا۔ اور اللہ کا نام بتانا۔ الخ (تذکرۃ الخلیل ص۱۳۱)

تدریس اور وصال

۲۵ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مظاہر العلوم کے ناظم بھی مقرر ہوگئے تھے اس وجہ سے مدرسہ کے لئے اسفار بھی کرنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے کتابیں آخر سال میں بہت کافی باقی رہ گئیں۔ تو ۲۶ھ میں آپ نے مولانا محمد یحییٰ صاحب کو گنگوہ سے بلایا اور آپ نے آکر مہینوں میں تمام کتابیں ختم کرادیں۔ اور واپس گنگوہ تشریف لے گئے۔ ۲۷ھ میں بھی یہی کیفیت پیش آئی۔

۲۸ھ میں جب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب حج کے لئے تشریف لے

گئے۔ تو آپ نے مولانا کا قائم مقام بن کر مظاہر علوم میں درسِ حدیث دیا۔ اور تنخواہ ایک پیسہ نہیں لی۔ بلکہ سب تنخواہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے گھر پہونچا دینا آپ کا عمل رہا۔

۲۸ھ سے آپ مستقل مظاہر علوم میں پڑھانے لگے۔ اور کبھی ایک پیسہ اجرت میں نہیں لیا۔ اور ساڑھے پانچ سال بالکل مفت پڑھایا۔ یہ صرف حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کی ہی امتیازی شان ہے۔ بالآخر ۳۴ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ اور بہت بڑے صاحبِ کمال تھے علم و عمل کے پہاڑ تھے۔ طلباء و غرباء و مساکین اور حاجتمندوں کی خبر گیری اور ان کی ہر ممکن امداد کرنا۔ آپ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کا وصال ہوا تو آٹھ ہزار روپے کے مقروض تھے جس کو آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور نے ادا کیا۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ

از ــــــــھ تا ۱۳۳۷ھ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلئے

وطن ولادت

آپ کے والد ماجد کا نام راؤ اشرف علی خان ہے مسلمان راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ موضع تگری ضلع انبالہ (مشرقی پنجاب) آپ کا وطنِ ولادت ہے (سن ولادت نہ معلوم ہو سکا) چونکہ والد ماجد ایک بڑے زمیندار تھے اس لئے تگری اور رائے پور کے قرب وجوار کی کافی جائداد ترکہ میں آئی۔ اور آب وہوا خوشگوار ہونے کی وجہ سے آپ نے قیام گاہ رائے پور کو بنایا آج بھی آپ یہیں مدفون ہیں۔

رائے پور، سہارنپور سے تقریباً ۲۰ میل نہر گنگ کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے۔ یہاں سے جیکروتہ وغیرہ کو بس گاڑیاں جاتی ہیں۔

تعلیم وتربیت

ابتدائی تعلیم آپ نے تگری رہ کر حاصل کی ہے۔ باقی عربی فارسی کی تعلیم رام پور اور مظاہر العلوم سہارنپور حاصل کی ہے۔ اور کچھ کتابیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے بھی پڑھی ہیں۔[۱]

سلوک وتصوف

ابتدا ہی سے طبیعت سلوک وتصوف کی طرف مائل تھی شیر مادر کے ساتھ اکابر اور مشائخ کی محبت اور ان کی توجہات کے گھونٹ بھی نوش کئے تھے جس وقت اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

۱۔ تذکرۃ الخلیل

مکہ معظمہ کے لئے ہجرت فرمارہے تھے۔اس وقت آپ کی عمر تین سال کی تھی۔ راؤ اشرف علی خان صاحب حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے جاں نثار خدام میں سے تھے۔چنانچہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی فرماتے ہیں :۔

"آپ کی ذات جامع کمالات ہے۔جو قلب ابتدار ولادت سے حضرت (حضرت گنگوہیؒ) کی محبت کا تخم اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ وہ میرے علم میں صرف آپ کا قلب ہے۔لبقصہٗ غدر اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کی روپوشی کے زمانہ میں جبکہ امام ربّانی قدس سرہٗ پنجلاسہ جاتے ہوئے نگری میں ٹھہرے۔ تو آپ کے والد ماجد راؤ اشرف علی خان صاحبؒ کے مہمان بنے تھے۔مولانا ممدوح اس وقت طفل سہ سالہ تھے۔حضرت نے پیار کیا۔اور سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔اسی وقت سے آپ کو امام ربّانی کے ساتھ تعلق تھا۔جوں جوں ہوش سنبھالا باپ کی زبانی حضرت (حضرت گنگوہیؒ) کے مناقب سن سن کر گویا حضرت ہی کی محبت میں نشو و نما پایا جس قلب میں قطب وقت کی بدعقیدگی کا کبھی وسوسہ بھی نہ گذرا ہو اس کے مراتب علیا ... کا کوئی کس طرح ادراک کرے۔آپ نے طفولیت ہی میں گنگوہ کی آمد و رفت شروع کردی تھی۔اور حضرت کے مربیانہ فیضان سے مستفید ہونے لگے تھے۔ سہارنپور میں بزمانہ طالب علمی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب[1] سے مرید ہوگئے اور صاحب نسبت و مجاز طریقت بنے۔اس زمانہ میں بھی امام ربّانی قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضری اسی محبت اور شوق کے ساتھ رہی جو ماقبل و مابعد زمانہ میں تھی۔اور باوجود مولانا کے دوسری جگہ بامر اللہ مرید بن جانے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق بھی آپ سے رہی

---

[1] اتفاق سے آپ کا نام بھی عبدالرحیم صاحبؒ ہے۔

مربیانہ رہا جو اس سے قبل اور مابعد تھا۔ شاہ صاحب مرحوم کے وصال کے چار سال بعد آپ کو حضرتؒ نے بیعت کیا۔ اور بیعت کے ساتھ ساتھ مجاز طریقت بھی بنایا۔ الخ

(تذکرۃ الرشید ص ۱۵۵-۱۵۲ ج ۲)

کارنمایاں جب ۱۳۲۵ھ میں مظاہر علوم سہارنپور کے بعض جاہ طلب ممبران نے ہڑبونگ مچایا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے نام برطرفی کا نوٹس دیدیا تو ان دنوں میں آپ بحکم حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ہر تیسرے روز ریل گاڑی میں بیٹھ کر سہارنپور جاتے اور حضرت گنگوہیؒ کو حالات سے باخبر کرتے رہے۔[1] اس طرح آپ نے مظاہر علوم سہارنپور کے حالات کو بگڑنے نہ دیا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ مظاہر العلوم کا سرپرست آپ کو بنادیا گیا۔[2] اور آخر وقت تک آپ نے کارہائے متعلقہ کو نہایت جوانمردی اور اخلاص سے انجام دیا۔

دوسرا بڑا کام آپ نے ریشمی خطوط کے سلسلہ میں کیا ہے جس کی تفصیل ہم "نقش حیات" ج ۲ سے نقل کرتے ہیں۔

"آپ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت معتمد دوست تھے ابتداء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو خبر تک نہیں کی۔ اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفاء کو جیسا کہ مقتضائے وقت تھا کام میں لائے۔ الخ

(ایک مرتبہ) رائے پور بھی حاضر ہونے کی نوبت آئی مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ بیعت جہاد لیتے ہیں۔[3] یہ تو بہت

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص ۱۳۱ [2] آپ کے ساتھ حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بھی سرپرست مقرر ہوئے تھے تذکرۃ الخلیل ص ۱۳۱ [3] مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے بھی آپکے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی (ملاحظہ فرمائیے مولانا محمد الیاس صاحب اور انکی دینی دعوت)

خطرناک امر ہے۔ انگریزوں کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمانوں کا یہ علمی مرکز اُجاڑ دیا جائے گا۔ چونکہ مجھ کو حضرت شیخ الاسلامؒ اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور یہ عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا۔ واقعہ یہی تھا۔ باوجودیکہ حضرت مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے۔ مگر اس وقت تک کسی قسم کی کارروائی کی خبر نہیں کی گئی۔ مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کیا۔ کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کر لینا اور اپنی کارروائیوں کی خبر دینا چاہیئے تو فرمایا کہ وہ صرف چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ اس کو مشوش مت کرو۔ میں نے رائپور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقولہ ذکر کیا۔ تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قایم رہے گا۔ سو بحمداللہ پچاس برس گزر چکے ہیں۔ اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے۔ میں یہ جواب سن کر دم بخود ہو گیا[1]۔ اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جا رہے ہیں وہ صحیح ہیں۔ حضرت کا اس امر میں پختہ خیال قائم ہو گیا ہے۔ اب اپنے ارادے سے ٹل نہیں سکتے۔ اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی اور حضرت شیخ الہندؒ کی آپس میں کھل کر بات ہوئی۔ تو حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو بالکل ہم خیال اور ہمنوا بنا لیا اور دونوں حضرات یک جان دو قالب[2] ہو گئے۔ اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔ جب حضرت

---

[1] اسی تذکرہ میں مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا احمد حسن صاحب حضرت مولانا اشرف علی صاحب شریک تھے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔

[2] مرض الوفات میں ایک حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر عرض کیا۔ حضرت! آپ کو (باقی ص۲۱۲ پر)

شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں کو اپنا قایم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی۔ کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ صاحب انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح عمل درآمد رہا کیا۔

حضرت رائپوریؒ نہایت دل سوزی اور استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مہمہ کو انجام دیتے رہے۔ ایام دار و گیر میں سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا افسران کے پاس بھی تفتیش و استنطاق کے لئے گیا۔ مولانا مرحوم نے تمام الزامات کی تردید کر دی۔ اور بعض میں لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ جس پر وہ ناکام واپس آیا۔ اور کہنے لگا مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

تعلیم القرآن | قرآن شریف اور اس کی تعلیم سے آپ کو عشق تھا۔ بچوں کو صحیح و صاف اور سادہ لہجہ میں قرآن شریف پڑھتا ہوا دیکھ کر آپ بہت خوش ہوتے تھے۔ خود آپ نے اپنے باغیچہ میں ایک مدرسہ قایم

(بقیہ حاشیہ صـ۲۰۵ کے بعد ملاحظہ فرمائیں) تو بہت پرانی تپ معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا:" ہاں حکیم صاحب نے سچ فرمایا مجھے تپ شروع اس دن ہوئی۔ جس دن حضرت گنگوہیؒ نے دنیا کو الوداع کہا۔ اور اس کا بدن پر ظہور اس دن ہوا جس دن خبر سنی کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ مالٹا میں قید ہو گئے۔ آج مولانا رہا ہو کر تشریف لے آویں تو کچھ نہ سہی ایک دفعہ تو جھرجھری لے کر اٹھ ہی کھڑا ہوں گا" (تذکرۃ الخلیل صـ۱۲۱)

۵ خرم آں روز کہ از منزل ویراں بردم
راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

کیا جو توکل کا مجسمہ تھا۔ نہ چندہ کا سوال تھا نہ کوئی وقف وجائداد تھی یہیں پر ایک خام مسجد تھی۔ مدرسہ اور مسجد دیکھ کر عہد نبوت کے سادہ دور کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ دیہات کے چھوٹے چھوٹے بچے تعلیم پاتے تھے اور یہاں ہی سے ان کے خورد ونوش کا انتظام ہوتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ لکڑیاں اور آٹا ختم ہوگیا۔ نگران مدرسہ نے آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا خدا رازق ہے۔ وہی انتظام کرے گا۔ یہ فرماکر خاموش ہوگئے۔ چنانچہ صبح نہ ہوئی تھی کہ طالب علم جو نہانے کے لئے ندی پر گئے تھے وہ دوڑے ہوئے آئے اور کہا حضرت! ندی میں تو لکڑیاں بہی چلی آرہی ہیں۔ خوشی کے مارے آپ کا چہرہ دمکنے لگا۔ اور آپ نے فرمایا کریم رزاق نے تمہاری روزی کا سامان بھیجا ہے۔ جاؤ جتنی چاہو سمیٹ لاؤ۔ چنانچہ سارے طالب علم دوڑ پڑے اور روک لگا کر لکڑیاں لانا شروع کردیں کہ دو گھنٹہ میں اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا۔ جس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔ لکڑیوں کی آمد بھی بند ہوگئی۔ اور اب آٹے کی ضرورت رہ گئی۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکیہ آیا۔ اور ڈیڑھ سو روپیہ کا منی آرڈر پیش کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ مدرسۃ القرآن کے لئے بھیجتا ہوں۔ اس کے خرچ میں لائیں۔

(تذکرۃ الخلیل ص۱۶۱)

غرضکہ اسی متوکلانہ شان سے یہ مدرسہ اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتا رہتا تھا۔

سفر حج آخری سفر حج کے لئے جب روانہ ہوئے تو ۷۰ / ۸۰ نفر آپ کے ساتھ تھے بمبئی پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ پہلے جہاز میں صرف بارہ ۱۲ سیٹ باقی ہیں۔ اس لئے آپ نے رفقاء میں سے بارہ ۱۲ حضرات کو ٹکٹ خرید دیئے۔ اور آپ معہ فرزند، بہو اور دیگر رفقاء کے پندرہ دن تک مقیم رہے۔ بعد پندرہ دن کے بمبئی سے دوسرے جہاز کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں فرزند عبدالرشید مرحوم کو

پیچش ہوگئی اور مرض یہاں تک بڑھا کہ مرحوم سے حرکت کرنا دشوار ہوگیا۔ اسی حالت میں جُوں توُں کر کے ارکان حج پورے کئے۔ باوجودیکہ اکلوتا لڑکا فرزند ارجمند جاں بلب تھا لیکن اپنی اور فرزند کی تکلیف کا کچھ خیال نہ آیا۔ ہر وقت رفقاءِ سفر کے آرام و راحت میں مصروف رہتے تھے۔ اسی حالت میں سفر مدینہ اختیار کیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد جب ہندوستان واپس ہوئے تو راہ میں عدن کے قریب عبدالرشید مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ جہاز ہی میں نماز جنازہ ادا کی۔ اور فرزند کی نعش کو سپرد بحر کر دیا۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ) ۔

ضبط و تحمل، وصبر و رضا کا یہ عالم تھا کہ بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ فرزند کا انتقال ہوگیا ہے۔ لوگ تمنائیں کرتے کہ حضرت! مرحوم کا تذکرہ کریں۔ مگر کیا مجال کہ زبان سے یا چہرہ سے کسی قسم کا اظہار ہو جائے۔

نکاح بیوگان

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو آپ کو عشق تھا۔ ہر وقت اتباعِ سنّت اور احیارِ سنت کا خیال رکھتے تھے، خصوصاً نکاح بیوگان سے، کیونکہ اس زمانہ میں نکاح بیوگان فعلِ مذموم شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن برابر اس سنت کے احیار کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آپ نے اپنا نکاح بھی ایک بیوہ خاتون سے کیا تھا۔ جس وقت فرزند عبدالرشید مرحوم کا انتقال ہوگیا تو آپ کو بیوہ بہو کے نکاح کا فکر ہوا۔ چنانچہ آپ بیوہ بہو کے پاس تشریف لے گئے اور سمجھانا شروع کیا۔ اور فرمایا:

"بیٹی! اب تک تو بہو تھی آج سے میری بیٹی ہے۔ دنیا فانی ہے اور یہاں کا یہ تعلق ایک دن ٹوٹنے والا ہے۔ ہمارے عزیز ایک ایک کر کے ہم کو چھوڑ جائیں [illegible] تب، اور ایک دن ہم سب کو چھوڑ کر چلے جائیں تب۔ بہر حال موت [illegible] نے فراق اور جدائی ڈالدی الخ" (تذکرۃ الخلیل صفحہ ۲۷۶)

ایک دن آپ نے عبدالرشید مرحوم کے خسر عبدالعزیز خاں (جو آپ سے بیعت بھی تھے) سے نکاح بیوہ گان کے سلسلہ میں اپنا منشا ظاہر کیا۔ خان صاحب مرحوم کی یاد سے رونے لگے تو فرمایا:۔

"حاجی عبدالعزیز خاں رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا آج خدا نے وہ دن نصیب کیا ہے۔ کہ اس کے محبوب پیغمبر کی مُردہ سنت ہم ناکارہ گنا ہگاروں کے ہاتھ زندہ ہو۔ یہ سخی کی نچھاور کا وقت ہے کہ اتفاق سے میسر آگیا ہے پس لوٹ لو جتنا لوٹنا ہے، نہ ہوتا عبدالرشید پیدا، یا نکاح سے قبل ہی مرجاتا یا بیوہ چھوڑ کر نہ جاتا تو ہم کیا کرتے اور کیوں کر یہ نعمت پاتے الخ"
(تذکرۃ الخلیل ص۲۲۷)

بہرحال جوں توں کر کے عبدالعزیز خاں کو صاحبزادی کے نکاح پر راضی کیا۔ اور نہایت اہتمام اور خوشی کے ساتھ نکاح کرایا اور خود بھی شریک ہوئے۔ اگرچہ عبدالرشید مرحوم کی شادی میں خود شریک نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ چند احباب کو بھیجدیا تھا اتباع سنت تو ہر جگہ ملتی ہے اور مشائخ و اکابر۔۔۔ اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ مگر اتباع سنت کا جو اہتمام شاہ صاحب قدس سرہٗ کے یہاں پایا جاتا ہے ایسا شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔

مرض الوفات اور وصال

آپ میں کتمان حال وضبط وتحمل بہت زیادہ تھا۔ بڑی سے بڑی تکلیف کو چھپائے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ران میں دُنبل نکلا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ باوجود تکلیف شدید کے برابر مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے جاتے رہے۔ ایک دن جب پھوڑا پھوٹ گیا اور آزار پیپ و خون سے تر ہوگیا۔ تب خدام کو معلوم ہوا۔ کہ نمعلوم کتنے دنوں سے دنبل تھا اسی طرح سے کتنی ہی مرتبہ طبیعت خراب ہوئی۔

اوزدوا کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس وجہ سے کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کب طبیعت خراب ہوئی اور کب آرام ہوگیا۔ جیسے صحت میں خوش وخرم رہتے ایسے ہی مرض کی حالت میں رہتے آخری زمانہ میں مستقل بخار رہنے لگا۔ لیکن باوجود اس کے مجاہدات کا وہی عالم رہا۔ مدتوں تک حالت کو چھپاتے رہے۔ ایک دن ایک طبیب نے نبض دیکھ کر کہا۔ حضرت! آپ کو بخار بہت پرانا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ ہاں بھائی! سچ فرمایا مجھے تپ اس دن شروع ہوئی جس دن حضرت گنگوہیؒ نے دنیا کو الوداع کہا۔ اس کا ظہور بدن پر اس دن ہوا جس دن خبر سنی کہ مولانا محمود حسنؒ صاحب مالٹا میں قید ہوگئے ہیں۔ آپ عشق سوزاں سے شمع کی طرح پگھلتے رہتے تھے کسی دوا سے افاقہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اگر محبوب کا تذکرہ ہوتا تو طاقت اور توانائی بڑھ جاتی تھی۔ سوزش عشق کا یہ عالم تھا کہ جسم پر حالت صحت میں بھی ہاتھ رکھنا دشوار تھا۔ چنانچہ مولانا اسعد صاحب صاحبزادہ حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں۔

"ایک مرتبہ مولانا عزیز گل صاحب نے حضرت رائے پوری سے درخواست کی۔ حضرت! مجھے بدن دبانے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے۔ تو ارشاد فرمایا۔ تم برداشت نہ کرسکوگے۔ مولانا نے نہ مانا اور بدن دبانا شروع کیا۔ مولانا کا بیان ہے کہ مجھ سے جسم مقدس پر ہاتھ رکھنا دشوار ہوگیا۔ انگارے کی طرح آپ کا جسد مقدس گرم تھا فوراً ہی ہاتھ ہٹالیا۔ تب حضرت نے فرمایا۔ دیکھ لیا۔

غرضکہ اسی سوزش دروں اور عشق خداوندی نے مرض کی صورت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ ایک شب حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے خواب دیکھا۔ کہ

"آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے۔"

چنانچہ یہ خواب دیکھتے ہی بدخواس رائے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ جا کر دیکھا

توحضرت رائپوریؒ کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔آپ پہونچے اور حضرت رائے پوریؒ کے کمرہ میں داخل ہوئے۔حضرت رائپوریؒ نے آپ کو دیکھا۔اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سینے پر رکھا اور داعی اجل کو لبیک کہا۔اور واصل بحق ہوگئے۔(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥)

جس باغ میں آپ رہتے تھے اسی باغ میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔آپ کا مزار آج بھی منبع فیوض و برکات بنا ہوا ہے۔آپ کے اجل و اعظم خلفاء میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری ہیں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نہایت اعلیٰ وارفع و کامل و مکمل بزرگ اور ولی باصفا اور صاحب حال اکابر میں سے تھے۔کشف بہت زیادہ ہوتا تھا لیکن کتمان حال کا یہ عالم کہ کسی کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔

ایک دفعہ جناب چودہری مختار احمد صاحب سیوہاروی حاضر ہوئے۔چودہری صاحب کو چائے کا بہت زیادہ شوق تھا۔آپ نے خانقاہ میں پہونچنے کے بعد اپنے ملازم کو چائے بنانے کا حکم دیا۔ابھی تک چودہری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔فوراً شاہ صاحب نے اپنا خادم بھیجا کہ جاؤ چودہری صاحب آئے ہیں۔اُن کو بلا لاؤ۔خادم گیا اور بلا لایا۔چودہری صاحب فرماتے تھے۔کہ میں حیران تھا کہ حضرت کو کیونکر علم ہوا۔حضرت نے فوراً ہی خادم سے فرمایا۔جاؤ چودہری صاحب کے لئے چائے بنالاؤ۔چودہری صاحب فرماتے ہیں۔اب مجھے اور بھی حیرانی ہوئی۔چنانچہ حضرت کا خادم چائے کے لئے چلا گیا۔تو میرے دل میں خیال ہوا کہ اگر بیضہ ہوتا تو اور بھی اچھا تھا۔شاہ صاحبؒ نے فوراً خادم کو بلایا۔دیکھو! دو بیضے بھی لیتے آنا۔چنانچہ چائے کے ساتھ دو انڈے بھی آگئے۔

ایک مرتبہ ایک حکیم صاحب نے آپ کو زہر دیدیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو ابھی

کچھ دن اور زندہ رکھنا مقصود تھا اس لئے آپ بچ گئے لیکن خدام کا یہ عالم کہ حکیم صاحب کو اگر تنہا پائیں تو خوب خبر لیں۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو حکیم صاحب کو اپنے پاس بٹھلاتے اور آئندہ کوئی دوا بھی بغیر حکیم صاحب کے مشورہ کے اور رائے کے نہ پیتے اور فرماتے کہ حکیم صاحب تو میرے بڑے کرم فرما ہیں اور خیر خواہ ہیں۔ اتفاق سے غلطی ہوگئی آخر انسان ہی تو ہیں۔ انھوں نے کوئی بُرائی کی نیت سے تو ایسا نہیں کیا۔ غرضکہ اس طرح حکیم صاحب کی خفت بھی کم کی اور خدام کو بھی باز رکھا۔

یہ ہیں مشائخ دیوبند، کہ براہ راست صاحب کتاب و سنت سبز گنبد والے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کسب نور کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ

از ۱۲۶۸ھ تا ۱۳۳۹ھ

پائے کوباں کوئی جنگل میں نیا ہے مجنوں
آئی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

خاندانی شرافت و پیدائش

ہم اوراقِ گذشتہ میں ذکر کر چکے ہیں۔ کہ دیوبند کا غالب عنصر شیوخ ہیں۔ جن کا سلسلہ نسب خلفاء اربعہ میں سے کسی سے بھی جا ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے اور آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے جدِ امجد جناب شیخ فتح علی صاحبؒ ہیں۔ شیخ فتح علی صاحب کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب عثمانی دیوبندی ایک جیّد عالم اور صاحبِ تصانیف کثیرہ اور باقبال بزرگ ہوئے ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کا انتقال ۱۳۲۲ھ میں ہوا۔ آپ نے ساٹھ افراد اولاد ذکور واناث میں سے چھوڑے[1]۔

مولانا ممدوح حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ ادبِ عربی میں نہایت اونچے مقام کے مالک تھے، عربی زبان میں بہت سی نظمیں اور مراثی لکھی ہیں۔ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کی مشہور شرحیں تسہیل الدراسہ اور تسہیل البیان، قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کی شرح عطر الوردہ، اور الارشاد لسبعہ المعلقات کی شرح التعلیقات اور اردو زبان میں.....

---

[1] حضرت شیخ الہندؒ کے مفصل حالات ہماری کتاب "تذکرۂ شیخ الہند" میں ملاحظہ فرمائیں۔ (عزیز الرحمٰن غفرلہٗ)

تذکرۃ البلاغت آپ کی یادگار تصانیف ہیں۔ آپ کے چار صاحبزادے (۱) حضرت شیخ الہندؒ (۲) حضرت مولانا حامد حسن صاحبؒ (۳) مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ۔ (۴) مولانا محمد محسن صاحبؒ اور دو صاحبزادیاں تھیں۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں غدر سے ۶ سال قبل بریلی[1] میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ولد ذوالفقار علی ہے۔

تعلیم و تربیت آپ نے قرآن شریف میاں جی منگلوری صاحب سے پڑھا۔ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں اور فارسی کی بڑی کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں قدوری تک اپنے چچا مولانا مہتاب علی صاحب سے پڑھیں۔ جب آپ کی عمر ۱۵ سال کی ہوئی تو ۱۲۸۳ھ میں چھتہ کی مسجد میں جو مدرسہ قائم ہوا۔ آپ اس کے سب سے پہلے طالب علم ہیں۔ جہاں آپ نے ملا محمود صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا (یعنی ان سے پڑھنا شروع کیا) پھر ان کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے بھی پڑھا اور صحاح ستہ اور دیگر فنون کی تکمیل سفر و حضر میں ساتھ رہ کر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے کی۔ حضرت مولانا ممدوح ان ایام میں میرٹھ پھر دہلی کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور اسی حالت میں پڑھاتے بھی تھے۔ بالآخر ۱۲۸۹ھ میں آپ فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں آپ کے دستار فضیلت باندھی گئی۔ حدیث میں آپ کو قطب العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنیؒ سے بھی اجازت حاصل ہے۔

(تذکرہ شائخ دیوبند)

[1] ان ایام میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب بریلی میں انسپکٹر مدارس تھے۔

اشاعتِ علم آپ جامع شریعت اور طریقت تھے۔ علم میں بقول حضرت امام ربانیؒ "علم کا کُھلہ" تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنے اس استاذ جلیل کو "شیخ العالم" کہتے تھے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی "شریعت اور طریقت کا بادشاہ" کہتے تھے۔ اور مرشدی و مولائی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ "علم شریعت اور طریقت کا ناپید کنار سمندر" کہتے تھے۔ آپ کو فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی ۱۲۸۸ھ یا ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم کا معین مدرس بنا دیا گیا تھا۔ اس وقت آپ کے سپرد قطبی، قدوری، مختصر المعانی، ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، ترمذی شریف کے اسباق کر دیئے گئے تھے[۱]۔ ۱۲۹۵ھ سے بخاری شریف کا سبق بھی آپ ہی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس طرح آپ کو بالاتفاق دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس منتخب کر لیا گیا تھا۔

باوجودیکہ آپ کا حلقہ درس تہجد کی نماز کے بعد سے شروع ہو جاتا تھا اور دن رات اسباق کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لیکن جب ۱۳۱۲ھ میں بوجہ گرانی مدرسین کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا تو تجویز ہوا کہ آپ کی تنخواہ چالیس سے پچاس کر دی جائے۔ مگر آپ نے اس کو پسند نہ کیا فرمایا "مجھ سے ان ہی کا حق ادا ہونا مشکل ہے لیکن بعد میں حضرت گنگوہیؒ کے حکم سے اس کو منظور کر لیا۔ ہمیشہ چٹائی پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بواسیر کے عارضہ کی وجہ سے اس پر گدا گدّا بنوایا گیا تھا جس کو آپ نے قبول فرما لیا تھا۔

حلقہ درس مولانا کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا۔ دوسرے مدارس کے فارغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالبعلم

---

[۱] ان ہی ایام میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے حضرت قدس سرہٗ سے مختصر المعانی اور ترمذی وغیرہ کتابیں پڑھی ہیں (ملاحظہ فرمایئے اشرف السوانح)

نہایت مودب طریق سے حاضر خدمت رہتے تھے۔ اور حضرتؒ کمال عظمت و وقار سے درس دیتے۔ ادھر اُدھر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دوسروں کی تحقیر اور اپنی تعریف کا نام و نشان نہ تھا (جیسا کہ بعض عالمان ظاہرہ کے یہاں کبر و نخوت کی وجہ سے ظاہری اکڑفوں ہوا کرتی ہے) ہنسی مذاق اور تفریح طبع کے جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود تھا۔ خطاب بالکل عام ہوتا تھا کسی کی خصوصیت نہ تھی کم استعداد طالب علم قرات کرنے سے خود ڈرتے تھے۔ اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مستعد طالب علم بار بار، اور طرح طرح سے اپنے اپنے شکوک اور شبہات پیش کرتے تھے۔ اس طرح کہ حلقہ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتا۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے۔ اور کبھی جامع و مانع تقریر "شفا" کا کام دیتی الزامی جواب میں ملکہ تام تھا۔ دو چار دفعہ اس طرح ٹالتے رہتے۔ بہت رد و بدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا الخ

حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقہ تحدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرتؒ کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب از بر اور صحابہ و تابعین و فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتیں نہ منہ میں کف آتا اور نہ مغلق الفاظ ہوتے، بامحاورہ اُردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈا آرہا ہے۔ لہجہ میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ ہوتا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دل نشین ہو جاتی تھی۔ اور سننے والا یہی سمجھ کر اُٹھتا تھا۔ کہ جو فرما رہے ہیں حق ہے الخ

مفسرین، محدثین، شارحین و مصنفین کا اس درجہ ادب ملحوظ رکھتے

تھے کہ کہیں شائبہ تنقیص بھی نہ آنے پاتا۔
مسائل مختلف فیہ میں ائمۂ ثلاثہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے۔ اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابوحنیفہ رح کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل بر دلیل شاہد بر شاہد قرینہ بر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے۔ الخ

بیشک حضرت رح اس حدیث۔ من عمل بما یعلم اتاہ اللہ علم مالم یعلم (جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا علم عنایت کرتا ہے۔ جس کا پہلے سے علم نہیں تھا) کا صحیح محمل اور اس شعر کا مصداق تھے۔ ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستار

حضرت مولانا کا طرز تحدیث اور جمع بین اقوال الفقہا والاحادیث بالکل وہی تھا۔ جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہما کا تھا۔

الحاصل آپ نے چالیس سال تک مسلسل دارالعلوم میں درس دیا۔ اور زمانۂ اسارت مالٹا اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں بھی درس دیا۔ اس طرح آپ کا زمانہ درس کل ملا کر ۴۴ سال سے زائد ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں اطراف واکناف عالم میں آپ کے تلامذہ پھیل گئے۔ جن کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی ہے۔ آپ کے ممتاز تلامذہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرشدی ومولائی واستاذی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب رح
(۲) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
(۳) حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کاشمیری۔

(۴) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوریؒ۔
(۵) حضرت مولانا عزیر گل صاحب اسیر مالٹاؒ
(۶) حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ۔
(۷) حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ
(۸) حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصورؒ۔
(۹) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ
(۱۰) حضرت مولانا محمد صدیق صاحب برادر حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ۔
(۱۱) حضرت مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ " " "
(۱۲) حضرت استاذی مولانا اعزاز علی صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیوبند۔
(۱۳) حضرت مولانا فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔
(۱۴) حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندیؒ مدرس دارالعلوم دیوبند
(۱۵) حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ
(۱۶) حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ کراچی۔
(۱۷) حضرت مولانا عبدالوہاب صاحبؒ دربھنگہ۔
(۱۸) حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی
(۱۹) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزی
(۲۰) حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ۔

سلوک اور تصوّف

سلوک اور تصوف سے مقصود تزکیۂ نفس اور قربِ باری تعالیٰ ہے۔ اسی کے لئے مشائخ اور اولیاء اللہ کے دروں کی خاک چھانی جاتی ہے۔ ان کی کیمیا تاثیر صحبت اور عالی تصرفات کی برکت اور ذکر و فکر و ریاضت میں مداومت کے بعد گوہر مقصود حاصل ہوتا ہے۔

اسی مقصود کے حاصل ہونے میں خلوص کے ساتھ اشتغال بالعلم کو بھی بڑا دخل ہے۔ امام نوویؒ ایک بڑے محدث ہونے کے علاوہ بڑے صوفی بھی ہیں۔ صحیح مسلم کی شرح کے مقدمہ میں اما بعد کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

فان الاشتغال بالعلم من افضل القرب واجل الطاعات واهم انواع الخير واکد العبادات اولی ما انفقت فیه نفائس الاوقات وایضا قال ومن اهم انواع العلوم تحقیق معرفة الاحادیث الخ منہ

علم دین میں لگا رہنا قرب خداوندی کا سب سے افضل ذریعہ ہے اور سب سے بڑی عبادت اور سب سے بڑی نیکی اور سب سے موکد عبادت ہے۔ اور ان تمام اوقات کو کہ جن میں عمر عزیز کو صرف کیا جائے اولیٰ تر ہے آگے فرماتے ہیں کہ علوم میں سب سے زیادہ اہم علم احادیث کی تحقیق و تفتیش ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مقدس (زاد اللہ شرفا) پر حاضر ہو کر مشاہدہ کیا کہ جو لوگ اشتغال بالحدیث رکھنے والے ہیں۔ ان کے قلب اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک تک نورانی دھاگوں کا سلسلہ جاری ہے۔"

مدت العمر اشتغال بالعلم اور ذکر و فکر سے جو آپ کی حالت ظاہر ہوئی یہ تھی۔

"وفورِ علم و وسعت نظر اور خداداد تفقہ فی الدین کی وجہ سے مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے۔ مگر غایت تواضع سے محدثین و مصنفین کے سامنے اپنا کوئی درجہ نہیں سمجھا اور کبھی یہ نہ فرمایا کہ میرے نزدیک یہ راجح ہے۔ یا میں یہ کہتا ہوں۔"

(حیات شیخ الہندؒ)

بہر حال آپ شروع ہی سے نیک طینت و نیک فطرت تھے۔ اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی محبت اور صحبت اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کی توجہات نے روحانیت کے عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آپ کو شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحبؒ

نے آپ کے کمالاتِ رُوحانیہ سے خوش ہو کر دستارِ خلافت اور اجازت نامہ بیعت عنایت فرمایا اور دربارِ رشیدی سے بھی آپ کو یہ نعمتِ عظمےٰ حاصل ہوئی حاصل یہ ہے کہ آپ علم نبوت، شریعت وطریقت وروحانیت کے مجمع البحرین ہی نہیں بلکہ مجمع البحار تھے۔

آپ اگرچہ اکثر اوقات تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف و مطالعہ کتب میں مصروف رہتے لیکن اوراد و وظائف ذکر و مراقبہ اور صلوٰۃ اللیل پر بھی ہر حالت میں مداومت فرماتے تھے۔ اور حد یہ ہے کہ مالٹا کی طوفانی برف باری میں بھی آپ کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ کتمانِ حال کا یہ عالم تھا کہ اگر رات کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کسی آدمی نے دیکھ لیا تو نماز پڑھتے پڑھتے لیٹ جاتے تاکہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ آپ سو رہے ہیں۔ حضرت استاذی مولانا محمد جلیل صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

"جب میں بچہ تھا اور حضرتؒ کے زنان خانے میں آتا جاتا تھا تو ایک دن میں نے حضرتؒ کے کمرہ میں کیواڑوں کی جھریوں سے جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرتؒ کے جسم کے تمام اعضا سر دھڑ علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر گھبراگیا اور بھاگ آیا۔ اور باہر آکر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ سے بیان کیا تو مولانا نے فرمایا خاموش! کسی سے نہ کہنا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔"

ہر جمعرات کو آپ سبق پڑھا کر گنگوہ تشریف لے جاتے اور جمعہ کی نماز پڑھ کر اور اپنے پیرومرشد کی صحبت سے فیضیاب ہو کر دیوبند تشریف لاتے۔ آپ نے اپنے استاذؒ کی اس قدر خدمت کی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے چنانچہ حضرت نانوتویؒ ایک مرتبہ بیمار ہوئے۔ برسات کا موسم تھا شفیق استاذ نے دیوبند آنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے استاذؒ کو گھوڑے پر بٹھایا۔ اور ایک ہاتھ

سے چھتری سر پر لگادی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہوکر اُستاذ کی کمر کو سہارا دیا ۔ اور دیوبند تک ۱۴ میل کا سفر اسی حالت سے پورا کر دیا ۔ یہ ہے مشائخ دیوبند کا سلوک و تصوف ، لنگوٹہ دھاری تصوف دنیاداروں اور نفس پرستوں کا ہوتا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ مکتب سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا ۔

جب تک حضرت گنگوہیؒ حیات رہے بیعت نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ بڑوں کی موجودگی میں اس قسم کا سلسلہ جاری کرنا سوء ادبی اور گستاخی ہے ۔ لیکن جب حضرت گنگوہی کا وصال ہوگیا ۔ اور مخلوق نے تنگ کرنا شروع کیا ۔ تب مشکل تمام بیعت کرتے تھے ۔ اور حسب استعداد اوراد و وظائف تعلیم فرماتے تھے ۔ آپ کی خانقاہ پر حاضر ہونے کے لئے کوئی ضابطہ اور اصول نہ تھا ۔

آپ کے خلفاء میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں ۔

(۱) حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب مظفر نگری ثم فیض آبادی ۔
(۲) صوفی محمد اکرم صاحب پنجابی ۔
(۳) مولانا شاہ وارث حسن صاحب ۔
(۴) مولانا سہول صاحب بھاگلپوری ۔

آزادی کی تیسری کوشش

یعنی

جہادِ حریت میں شرکت اور دیگر حالات وواقعات تحریک ریشمی خطوط وغیرہ :-

ہم اوپر انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ اور یہ بھی بیان کر آئے ہیں کہ آئندہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا گیا۔ سطورِ سابقہ سے ربط قایم کرنے کے لئے یہاں مختصراً پھر عرض کرتے ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد دو مشہور تربیت گاہیں (دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور) قائم ہو چکی تھیں۔ دارالعلوم کی سرپرستی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور ان کے بعد ہر دو تربیت گاہوں کی سرپرستی حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے رہے۔ ونیز ہر دو تربیت گاہوں کے سپہ سالار (حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ[1]) کا تعلق آستانہ عالیہ گنگوہ اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں آستانہ عالیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب و شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی مہاجر مدنی) سے رہا۔ اور بعد وصال ہر سہ حضرات (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت شاہ عبد الغنی صاحب، حضرت مولانا گنگوہی صاحب رحمہم اللہ تعالے۔

---

[1] حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کا تحریک میں شریک ہونا آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔

یہ چار حضرات (حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ
حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ)
سرپرست قرار پائے۔

چونکہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ کے سامنے انقلاب ۱۸۵۷ء کی
ہولناکیاں حضرت مولانا گنگوہی صاحبؒ کی گرفتاری حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی
روپوشی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی ہجرت اور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ
وغیرہ کی شہادت کے لرزہ خیز واقعات اور ان کے نتائج تھے۔ اس لئے آپ نے ایک
ہمہ گیر تحریک شروع کرنے کا تہیہ کیا۔ اور اس کے لئے ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم دیوبند
کے جلسہ دستار بندی کا اعلان کیا جس میں تقریباً تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ اور
جلسہ کے اختتام پر تبادلہ خیالات اور مخصوص مشورے ہوئے۔ اور جمعیۃ الانصار کا
قیام عمل میں آیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد دوسرا عظیم الشان جلسہ مرادآباد میں ہوا۔
جس کے بعد گورنمنٹ برطانیہ ان اکابر..... کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور
خفیہ پولیس کے ذریعہ نگرانی کرنے لگی۔

تحریک ریشمی خطوط

اس تحریک کا منشا ایک ہمہ گیر انقلاب اور جہاد کے ذریعہ برطانوی حکومت کا تختہ ٹوٹ دینا تھا۔ اس
لئے حضرت شیخ الہندؒ نے اس تحریک کو انتہائی صیغۂ راز میں رکھا۔ اور نہایت ہی معتمد
لوگوں کو اس کا رکن منتخب کیا۔ اور مختلف مقامات پر اس کے خفیہ مرکز قائم کئے۔ مولانا
عبیداللہ سندھیؒ کو منتظمین دارالعلوم دیوبند نے چند داخلی مصلحتوں کی وجہ سے
دارالعلوم کی مدرسی سے علیحدہ کر دیا تب یہ دہلی آئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ "نقش حیات"
میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ کی ڈائری سے نقل فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ واقعہ یہ

ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقاء و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریز کی پالیسی ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تصوّر کیا۔ اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھیؒ کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اس زمانہ میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان اختلاف پیدا کرادیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو علٰحدہ کردیا گیا۔ چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھیؒ سے بہت زیادہ بعید[1] کردیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ خفیہ آمدورفت جاری رہی۔ رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں الخ (نقش حیات ج ۲ ص۱۴۴)

حضرت شیخ الاسلامؒ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نواب وقار الملک مرحوم شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر جمیۃ الانصار اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے

---

[1] حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائینگے (حاشیہ نقش حیات ج۔۲ ص۱۴۴)

اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی سے ملایا۔ اسی طرح دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف ہا۔ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لئے میری طبیعت ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کردیا اور میں افغانستان پہونچ گیا۔ روانگی کے وقت دہلی کی سیاسی جماعتوں کو میں نے بتایا کہ میرا جانا کابل طے ہوچکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتاسکے۔ کابل جاکر مجھے معلوم ہوا۔ کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے اس کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت ہے۔ اب

لہ اس سے اس تحریک کی طرف اشارہ کیا ہے جو انقلاب ۱۸۵۷ء میں ناکامیاب ہونے کے بعد بظاہر دارالعلوم کی شکل میں اور بباطن سینہ بسینہ چل رہی تھی۔ جس کا ماحصل پھر حضرت مولانا سید احمد صاحب شہیدؒ کے لائحہ عمل اور نقش قدم پر شمالی مغربی ہندوستان پر باہر کی اسلامی طاقتوں کی امداد سے گوریلا جنگ کے ذریعہ آزادی حاصل کرکے اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا۔ اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا۔ کہ شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ ہو۔ اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کردیا جائے۔ ا ھ

(نقش حیات ص۲۳۸ ماخوذ از رپورٹ رولٹ کمیٹی پیرا یہ ۱۶۴)

مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا میں
سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔
۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا
حکم دیا الخ (نقش حیات ج ۲۔ ص ۱۴۵-۱۴۶)

اس کے بعد کیا ہوا؟ حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان سے بارادہ ہجرت حجاز کے لئے روانہ ہوئے اور آپ کی معیت میں مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری مولانا عزیر گل صاحب مولانا حکیم نصرت حسین صاحب وغیرہ حضرات تھے حضرت شیخ الہندؒ نے مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشاہ سے خفیہ بات چیت کی اور ان سے خطوط لے کر مولانا محمد میاں صاحب کو دے کر ہندوستان ہوکر یاغستان کے لئے روانہ کیا بہت کافی مصائب برداشت کرنے کے بعد مولانا موصوف نے اس خط کو یاغستان پہونچانے میں کامیابی حاصل کی۔ ادھر مولانا عبید اللہ سندھی نے امیر افغانستان کے خطوط لے کر خفیہ طریقہ سے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں اس طرح پہونچانا چاہتے تھے کہ ایک شخص کے کپڑوں پر ان خطوط کو لکھ دیا تھا لیکن افسوس کہ مخالفوں کی مخبری کی وجہ سے یہ خطوط پکڑ لئے گئے جس کی وجہ سے اس تحریک کے متعدد ہندوستانی اراکین کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور حضرت شیخ الہندؒ، انور پاشا اور جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں ملاقات کرنے کے بعد جب یاغستان کے لئے روانہ ہونا چاہتے تھے (تاکہ اس پچاس سالہ تحریک کو عملی جامہ پہنایا جائے) گرفتار کر لئے گئے۔ اور اسیر کر کے مالٹا پہنچا دیئے گئے۔ اور وہاں پانچ سال تک آپ اور آپ کے رفقاء (حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ۔ مولانا عزیر گل صاحب مولانا وحید احمد صاحب حکیم مولانا نصرت حسین صاحب جن کا انتقال مالٹا ہی میں ہوگیا تھا) مصائب برداشت کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے

در افسوس کہ دشمنوں اور غداران وطن کی سازش سے یہ پچاس سالہ تحریک ناکام ہوگئی۔

چوتھی کوشش اور حضرتؒ کا وصال

چونکہ ہم نے نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ اگر مفصل ذکر کیا جائے تو بہت سی مجلدات ناکافی ہوں گی لیکن اگر کوئی صاحب تفصیل سے حالات معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ تو ہماری تالیف تذکرہ شیخ الہند ملاحظہ فرمائیں جس میں راز ہائے سربستہ مذکور ہیں۔

ہندوستان واپسی | حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس ۷ مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم مالٹا سے روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لئے تمام ترکی آفیسر (جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ٹرکی سے لیکر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہوگئے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھاکر آواز سے دعا مانگنی شروع کی۔ اور تمام آفیسروں نے ان کی موافقت کی۔ آمین! آمین! کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے تپاک سے آبدیدہ ہوکر رخصت کیا۔ (نقش حیات ج۔۲ ص ۲۳۵)

حاصل کلام یہ ہے کہ بفضلہ تعالی حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء (سوائے حضرت مولانا حکیم نصرت حسین صاحب کے کہ ان کا انتقال مالٹا ہی میں ہوگیا تھا۔ اور مرحوم کو وہیں سپرد خاک کردیا تھا) بعزت و احترام اسارت مالٹا کا زمانہ ختم کرکے اپنے وطن عزیز کو رخصت ہوئے اور ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو ساحل ہند پر بسلامت پہونچ گئے۔ واپسی کی اطلاع حضرت شیخ الاسلام

سید حسین احمد صاحب مدنی نے بذریعہ تار عدن سے دیدی تھی (ملاحظہ فرمائیے "حیات شیخ الہند" از مولانا اصغر حسین صاحب)

پھر کیا تھا یہ اطلاع پورے ہندوستان میں شرقاً، غرباً، شمالاً، جنوباً ہوا کی طرح پھیل گئی۔ اور ملک کے گوشہ گوشہ سے ہندو مسلمان بمبئی پہونچنے شروع ہوگئے۔ بمبئی پہونچ کر استقبال کرنے والے حضرات میں علاوہ علمار دیوبند کے مہاتما گاندھی، مولوی رحیم بخش (جو گورنمنٹ کی طرف سے انتظام اور دوسرے امور کے لئے بھیجے گئے تھے جس میں وہ حکومت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ آئندہ کسی طرح حضرتؒ کو سیاسی تحریکات سے علیٰحدہ رکھا جائے۔)

ڈاکٹر انصاری، حکیم عبدالرزاق صاحب برادر ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالباری، وغیرہ حضرات بمبئی پہونچ گئے اور حضرت سے ملاقات کی۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے حضرت شیخ الہندؒ کو ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

بمبئی سے روانہ ہوکر ۱۳۰؍ جون ۱۹۲۰ء مطابق ۲۵؍ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ آپ دہلی پہونچے۔ وہاں میں بھی بے پناہ ہجوم نے آپ کا استقبال کیا۔ یہاں آپ نے ایک شب ڈاکٹر انصاری صاحبؒ کے مکان پر قیام کیا۔ اور ۱۴؍ جون ۲۶؍ رمضان المبارک کو دیوبند کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں تمام اسٹیشنوں پر آپ کے لئے بے پناہ ہجوم منتظر دید تھا۔ اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے آپ کا استقبال کیا جاتا تھا۔ بہر حال چار سال کے بعد دیوبند اور پورے ہندوستان کی بہا مانچے وطن میں لوٹ آئی۔ اس موقعہ کے حسب حال کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

اے تماشہ دیکھنے والوں خدا کی شان ہے
بھیس میں درویش کے فرمانروا آیا ہے آج

* * *

مرض الوفات اور چوتھی کوشش کی ابتدار

اول تو آپ پہلے ہی سے دائم المرض تھے۔ بواسیر وجع المفاصل نے آپ کو نحیف اور کمزور کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ صفر ۱۳۳۹ھ میں دیوبند اور اطرافِ دیوبند میں وبائی ملیریا پھوٹ نکلا تھا۔ چنانچہ آپ بھی جاڑے بخار میں مبتلا ہوگئے۔ درمیان میں کچھ دنوں کے لئے آرام ہوگیا تھا لیکن مرض نے پھر دوبارہ حملہ کر دیا۔ اثنا مرض ہی میں آپ کو مختلف اسفار پیش آئے۔ آپ کو علی گڈھ بھی جانا پڑا حضرت شیخ الاسلام نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں :-

تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی، ترکِ موالات کا جوش تھا۔ اس لئے چاہتے تھے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترکِ تعلق کرے مگر ہا نے سرکار دوست ٹرسٹیان یونیورسٹی کب اس کو برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی صاحب مرحوم اُن کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی جماعت علیحدہ اور آزاد درس گاہ قائم کرنے کے لئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔ تیاری کرنے لگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ناگپور اجلاس کانگرس ہوا تھا اور اس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبۂ یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا[1] الخ (نقش حیات ج ۲ ص ۲۵۳)

---

[1] اس فتوے کو ہم حضرت شیخ الاسلام کے تذکرہ میں بیان کریں گے۔

علی گڑھ جا کر آپ نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی اسی زمانہ میں جامعہ ملیہ کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت حضرتؒ نے فرمائی۔ باوجود یکہ خدام اور اطبا نے ہر چند منع کیا کہ آپ بیماری میں شریک نہ ہوں لیکن آپ نے فرمایا۔

اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس میں ضرور شریک ہوں گا۔ [۱] (نقش حیات ج ۲ ص ۲۵۶)

بہر حال آپ نے اس جلسے کی صدارت حالت مرض ہی میں فرمائی۔ اس کے بعد حضرت کی علالت بڑھتی گئی۔ اور آپ کو برائے علاج دہلی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر قیام فرمایا۔ اور علاج شروع ہوا۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور حکیم عبدالرزاق صاحب آپ کے معالج تھے۔ غرضکہ ان حضرات نے ہر چند کوشش کی اور ایسی ادویہ استعمال کرائیں جو بادشاہوں ہی کو میسر آسکتی تھیں۔ اسی حالت میں جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس ہوا۔ آپ نے اس کی صدارت بھی فرمائی۔ لیکن اس وقت آخری سانسیں جاری تھیں۔ آپ کی طرف سے خطبہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے مرتب کیا جو ترمیم اور اصلاحات کے بعد طبع ہوا۔ اور جلسہ میں پڑھ کر سنایا گیا جس کے الفاظ "علماء حق" اور "نقش حیات" میں موجود ہیں۔

بہر حال آپ آخیر دم تک ملک اور قوم اور آزادی وطن کے لئے انگریزوں سے ٹکر لیتے رہے۔ اور بالآخر ۱۸ ربیع الاول کو ذکر اللہ کرتے ہوئے آپ اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔ ؎ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

---

[۱] آپ جلسہ میں دو آدمیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گئے تھے۔ آپ کی طرف سے خطبہ صدارت حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے پڑھ کر سنایا تھا۔

بزم تھی، ساقی بھی تھا، مے تھی اور پیمانہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

دہلی سے آپ کا جنازہ دیوبند لایا گیا۔ راستے میں متعدد مقامات پر نماز جنازہ ہوئی۔ بالآخر آپ کو آپ کے شفیق استاذ کے قدموں میں دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرض الوفات اور جنازے کی روانگی کا قیامت خیز منظر حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اپنی تالیف "حیات شیخ الہند" میں نہایت تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی

از ۱۲۶۹ھ تا ۱۳۴۶ھ

خلیل آسا در ملک یقین زن
صدائے لا احب الآفلین زن

وطن مالوف آپ کا مولد شریف ضلع سہارنپور کا ایک قدیم اور تاریخی قصبہ انبیٹھہ ہے جو سہارنپور سے بجانب جنوب ۱۶ میل ہے۔
صاحب سوانح نے بیان کیا ہے کہ اس کو فیروز شاہ تغلق کی فوج کے سپہ سالار سعد اللہ بیگ نے ۷۷۴ھ میں آباد کیا۔ اور فیروز آباد نام رکھا۔ اور اس کو فوجی کیمپ قرار دیا۔ مرور ایام کے بعد انبیٹھہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں فرمایا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس زمین کی صلاحیت اور زراعت و غلّہ جات کی کثرت پیداوار کے سبب اس کا نام انبیٹھہ ہوا۔ اَن غلّہ کو کہتے ہیں۔ یا چونکہ انبہ اس جگہ بکثرت ہوتا ہے اس لئے انب ہٹہ یعنی انبہ کی آڑت اور منڈی بن کر انبیٹھہ کہلانے لگا الخ (تذکرۃ الخلیل ص۲)

یہ قصبہ شرفاء اور مشائخ عظام کی بستی ہے۔ عربی النسل کے مشائخ، صدیقی، فاروقی، ایوبی۔ اس میں زمانہ قدیم سے آباد چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ ۱۱۰۰ھ میں یہاں خاندان چشتیہ کے چشم و چراغ شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ آباد ہوئے۔ غالباً یہ زمانہ ہندوستان میں محمد شاہ کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ۱۱۱۲ھ میں شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ نے وصال فرمایا۔ اور یہیں مدفون ہوئے بستی سے غربی جانب آپ کا مزار اور خانقاہ اب بھی منبع فیوض و برکات بنا ہوا ہے۔ اس وقت سے اس کو انبیٹھہ

پیرزادگان کہنے لگے۔

شاہ ابوالمعالی صاحب فضل وکمال اور صابر وشاکر اور صاحب مقامات عالیہ ایک بزرگ گذرے ہیں۔ بڑے ہی صاحب کشف وکرامات تھے۔ آپ کے خلفاء عظام میں شاہ مدار اور شاہ بھیک ہوئے ہیں۔ شاہ بھیک کا دوہا جو انھوں نے اپنے پیرومرشد کی تعریف میں کہا ہے۔ اب بھی مشہور ہے ؎

بھیکا مالی پرداریاں پل میں سو سو بار
کاگا سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

شاہ ابوالمعالی رح کے دختری سلسلہ سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا بھی تعلق ہے۔ اور تمام مشائخ ایوبی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کو ہم سطور ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

نسبی شرافت

آپ شیخ ایوبی اور نجیب الطرفین ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام مجید علی شاہ ہے۔ دسویں پشت میں قاضی امن پر آپ کا سلسلہ نسب حضرت گنگوہیؒ کے سلسلہ سے ملحق ہوجاتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح شروع ہوتا ہے۔

مولانا شاہ خلیل احمد بن شاہ مجید علی بن شاہ احمد علی بن شاہ قطب علی بن شاہ غلام محمد بن شرف الدین بن غلام محی الدین بن عبدالرشید بن محمد فضیل بن نظام الدین۔ بن امن الدین عرف قاضی امن صاحب سے سلسلۂ نسب وہی ہے۔ جو حضرت گنگوہیؒ کا ہے۔ اگرچہ اوپر چل کر چند اسماء میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر وہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کاتبان سلسلۂ انساب کی غلطی ہے۔

ہم اوپر عرض کرچکے ہیں کہ شاہ ابوالمعالی صاحب کی دختری اولاد سے مشائخ انبیٹھہ کا تعلق ہے۔ اس طرح کہ پانچویں پشت میں شاہ غلام محمد صاحب

کی شادی شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس طرح سے آپ کا تعلق سلسلۂ انساب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جا ملا ہے۔

تعلیم وتربیت آپ کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو آپ کے نانا جناب مولانا مملوک علی صاحبؒ نے آپ کی بسم اللہ خود ہی شروع کرائی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے قصبہ کے ایک مکتب میں قرآن شریف پڑھ کر ختم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں ۱۸۵۷ء کا سانحہ پیش آیا۔ ابتدائی اردو اور فارسی میں بوستاں تک آپ نے مختلف اساتذہ سے انبیٹھہ اور نانوتہ میں پڑھا۔ اس کے بعد عربی کی کتاب میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج تک اپنے چچا حضرت مولانا انصار علی صاحب سے پڑھا۔

مولانا انصار علی صاحب ریاست گوالیار میں ریاست کے ممتاز عہدہ (صدر الصدور) پر فائز تھے۔ شفیق چچا نے لائق بھتیجے کے ذہن کو دیکھ کر عربی پڑھانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ہمراہ گوالیار لے آئے۔ صاحب سوانح نے اس موقعہ پر حضرتؒ کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے:۔

> "جس وقت میں اپنے چچا کے ساتھ بہلی میں سوار ہو کر بقصد گوالیار چلا ہوں تو میری عجیب کیفیت تھی۔ کبھی وطن کا چھوٹنا، والدہ کا فراق، اور اقربا و ہمجولیوں سے جدا ہونا، اپنا اثر ڈالتا۔ اور مجھ کو پریشان بنا دیتا تھا۔ اور کبھی وطن میں تعلیم کی بدنظمی اور حصول علم میں اپنی ناکامی و نقصان ------ کا تصور ہو کر گوالیار میں یکسو ہو کر پڑھنے لکھنے میں مشغولیت اور چچا کی شفقت اور حسن تعلیم کا رنگ غالب آتا تھا الخ"
>
> (تذکرۃ الخلیل ص۱۱)

اس سے حضرت مولاناؒ کا جذبہ طلب علم بخوبی واضح ہوتا ہے۔ آپ ابھی

میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج ہی پڑھنے پائے تھے کہ والد صاحب نے وطن واپس بلالیا۔ بقیہ کتابیں کافیہ تک آپ نے اپنے قصبہ کے مشہور عالم مولانا سخاوت علی صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد طے ہوا کہ سرکاری اسکول میں داخل کرادیا جائے۔ اور انگریزی پڑھائی جائے۔ چنانچہ چند دنوں کے لئے آپ اور آپ کے چچا زاد بھائی مولانا صدیق احمد صاحب انگریزی پڑھتے رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے قایم ہونے کی خبر ملی۔ تو آپ دونوں اپنے حقیقی ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ یہ واقعہ ۱۲۸۳ھ کا ہے۔ یہاں بھی آپ کافیہ کی جماعت میں شریک ہوئے اور چھ مہینہ کے بعد آپ سہارنپور اپنے دوسرے ماموں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہاں آپ کا داخلہ مختصرالمعانی والی جماعت میں ہوگیا۔ اور درس نظامی کی تمام کتابیں یہیں پڑھیں۔ اس طرح آپ انیس سال کی عمر ۱۲۸۸ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ حدیث میں آپ کا سلسلہ اسناد یہ ہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب عن مولانا محمد مظہر صاحب عن مولانا مملوک علی صاحب عن مولانا رشید الدین صاحب عن مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب عن شاہ ولی اللہ صاحب مولانا محمد مظہر صاحب نے بخاری شریف حضرت شاہ اسحٰق صاحب سے بھی پڑھی ہے۔

ہمارے حضرت سیدی مرشدی مولانا شیخ الاسلامؒ کو حدیث میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی اجازت تھی۔ اس طرح سے ہمارا سلسلہ حدیث یہ ہے۔

عن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی عن مولانا خلیل احمد صاحب عن مولانا مظہر صاحب عن مولانا مملوک علی و شاہ اسحٰق صاحب عن شاہ عبدالعزیز صاحب عن شاہ ولی اللہ صاحب۔

آپ کو حدیث میں مکہ مکرمہ کے مشہور مفتی شیخ احمد زحلان سے بھی اجازت ہے جن ایام میں آپ سہارنپور میں تعلیم پاتے تھے۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ جب آپ

رمضان المبارک کی چھٹیوں میں گھر آئے تو آپ کے محلہ کی مسجد میں کوئی حافظ قرآن مجید سنانے والا نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے اور آپ کے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب نے ایک دوسرے حافظ صاحب سے استدعا کی کہ امسال قرآن شریف ہماری مسجد میں سنا دیجئے لیکن جب انھوں نے انکار کردیا۔ تب آپ نے پختہ ارادہ کرلیا۔ اور سال بھر میں حفظ کرکے اگلے سال محراب سُنائی۔ مولانا صدیق احمد صاحب نے دو سال میں حفظ کیا۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے لڑکوں نے بھی قرآن شریف حفظ کرلیا۔ چونکہ آپ کو ادب عربی کا بھی شوق تھا۔ اس لئے بعد فارغ التحصیل ہونے کے جب آپ سہارنپور میں معین مدرس ہوگئے۔ تو اس کو چھوڑ کر آپ لاہور جناب مولانا فیض الحسن صاحب ادیب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ادب عربی سے متعلق کتابوں کو پڑھا۔ جناب مولانا فیض الحسن صاحب ان دنوں لاہور کے عربک کالج میں پروفیسر تھے۔

ملازمت اور نکاح

آپ ۱۲۸۵ھ یا ۱۸۶۸ء میں بعمر ۱۹ سال مظاہر علوم سہارنپور میں معین مدرس ہوگئے اور اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے لاہور مولانا فیض الحسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد فراغت جب وہاں سے واپس ہوئے تو آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب نے آپ کو دس روپے ماہوار پر قاموس کا ترجمہ کرنے کے لئے منصوری بھیجدیا۔ وہاں کا کام چند ماہ کرکے آپ منگلور کے مدرسہ میں ملازم ہوگئے۔ اسی دوران غالباً ۱۲۸۸ھ میں آپ کا نکاح قصبہ گنگوہ بہا انصاری خاندان میں ہوا

قصبہ گنگوہ میں جناب شاہ عبدالرحمٰن صاحب بن شاہ حبیب اللہ صاحب تھے۔ جن کی شادی حضرت شاہ حسن عسکری شہیدؒ کی صاجزادی مسماۃ الٰہی بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے تین صاجزادیاں ہوئیں جن میں ایک

صاحبزادی مسماۃ انبیاء بیگم سے حضرت مولانا قدس سرہٗ کا عقد ہوا تھا۔ ان ہی کے بطن سے ۱۲۹۰ھ میں صاحبزادہ محمد ابراہیم اور ۱۲۹۳ھ میں صاحبزادی منیر النساء اور ۱۲۹۵ھ میں ایک صاحبزادی اور پیدا ہوئیں۔ اس ولادت میں ماں اور بیٹی دونوں عالم آخرت کو سدھار گئیں۔

دوسرا عقد ۱۲۹۷ھ میں قصبہ انبیٹھہ میں جناب حاجی نظام الدین صاحب کی بیوہ صاحبزادی محترمہ منیر النساء سے ہوا۔ موصوفہ حضرت قدس سرہٗ کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لے گئیں۔ اور حضرت کے بعد تک حیات رہیں۔

بیعت اور خلافت

چونکہ آپ کا عقد گنگوہ میں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اکثر سسرال میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اور آستانہ عالیہ قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ پر کبھی حاضری کا موقع ملتا تھا۔ آپ کے آستانے پر بڑے بڑے حضرات آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ بھی تشریف لاتے تھے۔ اگرچہ مولانا محمد مظہر صاحب عمر کے اعتبار سے بڑے تھے۔ لیکن جب آستانے رشیدیہ پر حاضر ہوتے تو مریدانہ حاضر ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی آنکھیں دیکھا کرتی تھیں۔ بالآخر ایک مرتبہ اپنے بڑے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اپنا ارادہ بیعت[1] ظاہر فرماکر آستانہ رشیدیہ کے لئے ایک سفارشی رقعہ لکھواکر حاضر آستانہ ہوئے اور حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور جواب کے

---

[1] تذکرۃ الرشید کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی بیعت کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے سفارش کی تھی۔ اور مولانا ممدوح نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سے بنفس نفیس جاکر فرمایا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مولانا محمد یعقوب صاحب کا بھی پرچہ لے گئے ہوں۔ واللہ اعلم (بندہ غفرلہٗ)

منظر رہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا:۔

"میاں تم خود پیرزادے ہو، پیر ہو تمہیں کسی کے مرید ہونے کی کیا ضرورت ہے؟
آپ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا۔ کہ حضرت کیسی پیرزادگی؟ میں تو
اس دربار کے کتوں کے بھی برابر نہیں بیعت کا حاجتمند ہی نہیں۔ بلکہ
سرتاپا احتیاج ہوں۔ چھاتی لگائیے یا دھکے دیجئے میں تو حضرت کا غلام
ہو چکا۔ الخ (تذکرۃ الخلیل ص۳۶)

یہ الفاظ سنکر حضرت گنگوہیؒ نے بیعت کر لیا۔ اور آپ وہاں سے بامراد واپس ہوئے۔ اور تعلیم فرمودہ ذکر و فکر میں مشغول رہنے لگے۔ بالآخر جب ۱۲۹۷ھ میں دوسرے حج کے ارادے سے حجاز مقدس تشریف لے جانے لگے۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں لکھا کہ:۔

"مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہوتے ہیں۔ آپ ان کی حالت پر مطلع ہو کر
مسرور ہوں گے۔" (تذکرۃ الخلیل ص۳۷)

حاجی صاحبؒ نے جب مولاناؒ کی باطنی کیفیت مشاہدہ فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور سر سے دستار اتار کر مولانا قدس سرہٗ کے سر پر رکھ دی۔ اور اجازت نامہ بیعت مہر سے مزین فرما کر حوالہ کیا۔ بعد فراغت حج جب آپ حاضر آستانہ عالیہ رشیدیہ ہوئے تو یہ دو عطیے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پیش کر دیئے حضرت گنگوہیؒ نے "مبارک" فرما کر مکرر دستار خلافت آپ کے سر پر رکھ دی اور اجازت نامہ بیعت پر دستخط فرما کر عنایت فرمایا۔ اس طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو شیخین قدس اللہ اسرارہما کی طرف سے اجازت بیعت اور دستار خلافت حاصل ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ آپ کے

بارے میں فرمایا کرتے تھے ”میاں جو ہیں وہی خلیل احمد ہے“

قیام بھوپال اور سفر حج

۱۲۹۳ھ میں آپ باجازت امام ربانیؒ مدرس ہوکر بھوپال تشریف لے گئے جس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا جمال الدین مدار المہام شوہر والیۂ ریاست بھوپال سکندر جہاں بیگم حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ اور آپ کی خواہش یہ تھی۔ کہ استاذ زادہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کو تین صد روپے ماہوار پر ریاست میں جگہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو لکھا۔ لیکن مولانا اس وقت دارالعلوم دیوبند میں تیس۳۰ روپیہ ماہوار پر صدر مدرس ہو چکے تھے۔ آپ نے باوجود قلیل تنخواہ کے خدمت دین کے مقابلہ میں اتنی کثیر رقم پر ٹھوکر مار دی۔ اور درخواست نامنظور کر دی۔ فرمایا ہم کو بقدر حاجت اللہ تعالیٰ عنایت فرما دیتا ہے۔ مولانا جمال الدین صاحب کے پاس جب یہ جواب پہونچا تو انھوں نے پھر لکھا کہ اگر آپ تشریف نہیں لاسکتے تو اپنے معتمد کسی اور عالم کو بھیجدیں۔ تب حضرت قدس سرہٗ نے مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو حکم دیا۔ چنانچہ آپ باجازت اپنے پیر و مرشد حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ساٹھ روپیہ ماہوار پر ریاست بھوپال تشریف لے گئے۔ باوجودیکہ آپ کو ریاست میں ہر قسم کا آرام تھا۔ اور اس زمانہ کے اعتبار سے معقول تنخواہ تھی۔ لیکن آپ کی طبیعت فقیرانہ تھی۔ اور یہاں شہنشائیت تھی۔ اس وجہ سے آپ نے استعفےٰ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور حضرت امام ربانیؒ کو لکھا وہاں سے جو جواب آیا درج ذیل کیا جاتا ہے۔

”مولوی خلیل احمد صاحب مدت فیوضہم بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آج خط آیا حال معلوم ہوا۔ درصورتیکہ ہوا وہاں آپ کو موافق نہیں تو ترک وہاں کا ضروری ہے۔ اس جگہ کا کہ ہوا ناموافق ہو ترک کرنا بحکم حدیث

ثابت ہے مگر چونکہ معاش کا قضیہ نازک ہے ۔ لہٰذا جب تک دوسری جگہ سامان نہ ہو جائے ترک مناسب نہیں اس لئے چندے قیام وہاں کا مناسب ہے ۔ مرادآباد میں آپ کی طلب بہت رہی اب وہاں مولوی عبدالحق صاحب رام پوری آگئے ہیں ۔ مگر جیسا چاہئے ویسا کام ان سے نہیں ہوتا ۔ اگر مناسب ہوا وہاں یا دوسری جگہ کی تدبیر کرتا ہوں ۔ اور تجویز ہو کر مطلع کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ ۔ مورخہ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ بروز جمعہ

انہیں ایام میں موسم حج قریب آگیا آپ کے دل میں بھی زیارت دیار حبیبؐ کا شوق پیدا ہوا اور ریاست سے رخصت لے کر عازم حج ہوئے لیکن رفقائے وطن سب جا چکے تھے ۔ لہٰذا آپ تن تنہا روانہ ہوئے لیکن اتفاق سے بھوپال کے قریب کے ایک نواب صاحب بھی سفر کر رہے تھے ۔ اور آپ تنہا تھے ونیز کھانے پکانے سے واقف بھی نہ تھے ۔ انہوں نے آپ کی پریشانی کو دیکھ کر اپنے کھانے میں شریک کرنا چاہا تب آپ نے فرمایا میں شریک طعام ہو سکتا ہوں مگر کوئی کام آپ مجھ سے لیں ۔ نواب صاحب نے ایک کتاب نقل کے لئے نکال کر دیدی اور اجرت طے ہو گئی ۔ اسی طرح آپ مکہ معظمہ پہونچے ۔ اور شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں مہمان ہوئے اور بعد فراغت زیارت مدینہ آپ ہندوستان تشریف لائے ۔ اور بھوپال سپرد نہ گئے ۔ بلکہ سکندرآباد کے مدرسے میں ملازم ہو گئے ۔ یہ واقعہ ۱۲۹۴ھ کا ہے ۔

قیام بھاولپور اور حج

غالباً ۱۲۹۵ھ کا واقعہ ہے کہ جب حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ حج سے تشریف لائے تو بھاولپور کے چیف جج نے ایک قابل مدرس کے لئے

۱؎ تذکرۃ الخلیل صلا ۔

لکھا کہ جس میں ایسے ایسے اوصاف ہوں بھیجدیں۔ مولانا قدس سرہٗ نے حضرت کو تجویز کیا۔ تو حضرتؒ نے فرمایا۔

"میں نے عذر کیا کہ جن شرائط کا مدرس ان کو درکار ہے۔ مجھ میں مطلق نہیں پائی جاتیں۔ مگر حضرت مولانا نے فرمایا میاں رہنے دو۔ لکھنے والے یوں ہی لکھا کرتے ہیں۔ اور اہلِ علم اپنے آپ کو یوں ہی سمجھا کرتے ہیں۔ تم کو اپنی نا قابلیتی یہیں نظر آتی ہے کہ سر پر بڑے نظر آتے ہیں۔ باہر جا کر دیکھو گے تو اتنا بھی کسی کو نہ پاؤ گے۔ اس وحشت کو دور کرو۔ اور اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ بالآخر حضرت مولانا اور حضرت امام ربّانی کی رائے متفق ہوگئی۔ اور میں تیس[۳۰] روپے ماہوار پر مدرس ہو کر چلا گیا[۱]"

اسی قیام میں مولوی شمس الدین صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جانا چاہا۔ آپ نے رفیق سفر مناسب سمجھ کر حج کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنی جگہ حضرت امام ربّانیؒ کے بھانجے مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کو مقرر کر کے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ یہی وہ حج ہے کہ جس میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ نے دستارِ خلافت اور اجازت نامہ بیعت عنایت فرمایا تھا۔ یہ واقعہ ۱۲۹۷ھ کا ہے

مناظرہ بہاولپور

آپ ریاست کے جس مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ اس کا ایک افسر شیعہ تھا جو آپ سے امور مذہبی میں جلی کٹی باتیں کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے آپ کو استعفےٰ پیش کرنا پڑا۔ تو وزیر ریاست نے وجہ دریافت کر کے آپ کا مدرسہ شیعہ افسر کی نگرانی سے نکال دیا۔ بس اصل بنیاد یہ تھی کہ جس کی وجہ سے اس نے آپ کے خلاف غلط پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا نتیجہ بایں جا رسید کہ آپ کو ردِ شیعہ میں ایک کتاب ہدایات الرشید لکھنا

---

[۱] تذکرۃ الخلیل ص ۷۹

پڑی جس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اسی اثنا میں رمضان شریف کی تعطیل میں آپ گھر تشریف لائے تو دشمنوں کو موقعہ ملا۔ اس زمانہ میں آپ کے پاس ریاست کی طرف سے مناظرہ کے لئے خط گیا آپ نے حضرت امام ربّانی سے مشورہ کیا۔ تو حضرت امام ربّانی نے فرمایا۔ بہتر۔ جاؤ! دیوبند سے مولوی محمود حسن کو اور مولوی صدیق احمد کو اور مولوی عبدالحق رامپوری اور مولوی مراد صاحب کو ساتھ لیتے جاؤ۔ چنانچہ یہ پانچ آدمیوں کا قافلہ بہاولپور پہونچا اور فاتح و غالب واپس ہوا۔ اسی مناظرہ کے بعد سے آپ کو رئیس المناظرین کہا جانے لگا۔

قیام بریلی بہاولپور کے مناظرہ سے آپ کا شہرہ ملک بھر میں ہوگیا تھا۔ لہٰذا آپ جیسے ہی بہاولپور سے تشریف لائے ہر طرف سے آپ کی طلب شروع ہوگئی۔ چنانچہ بریلی سے جناب حافظ محمد جعفر خاں صاحب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنے مدرسہ مصباح العلوم کے لئے مدرس کی درخواست دی۔ مدرسہ مصباح العلوم کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے ۱۲۹۹ھ میں قائم کیا تھا۔ چنانچہ حضرت امام ربّانی نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو مدرسہ مذکور کا صدر مدرس بنا کر بھیجدیا۔ جہاں آپ ۱۳۰۵ھ تک رہے۔ اور آخیر ۱۳۰۸ھ دارالعلوم دیوبند مدرس ہو کر تشریف لائے۔

سیاسی زندگی مزاج اور طبع کے اعتبار سے آپ بالکل سیاسی نہیں تھے بلکہ ایک گوشہ نشین قسم کے عالم بزرگ تھے۔ جن کی جولان گاہ صرف مدرسہ یا خانقاہ تھی۔ سیاسی نشیب و فراز کے بجائے مطالعہ کتب اور ذکر و مراقبہ آپ کا مشغلہ تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ سے دوستانہ تعلقات تھے جس سال حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی خطوط والی تحریک کے

سلسلہ میں سفر مکہ معظمہ کیا تھا۔ اسی سال آپ بھی ہمراہ تھے۔ اور اتفاق سے ٹرکی وزرار کی مجلس میں آپ بھی شریک رہے جب واپس ہوئے تو پولیس نے آپ کو حراست میں لے لیا اور نینی تال بھیجدیا وہاں آپ کے بیانات لئے گئے۔ وہاں آپ نے بمطابق تحریر نقش حیات' کوئی بات ایسی نہیں کہی۔ جس سے حضرت شیخ الہندؒ یا ان کی تحریک کو کوئی نقصان پہونچے لیکن عقیدت مندوں کا یہ نظریہ" ہمارا پیر آدمی اور تمہارا پیر مٹی کا" نہایت ہی مہلک ثابت ہوا۔ اس نظریہ نے ہندوستان میں ہزار ہا بیش قیمت انسانوں کو پنپنے نہیں دیا۔ اسی عقیدے نے دوسرے بزرگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور یہاں تک پریشان کیا وہ حضرات مجبور ہوگئے۔ کہ یا تو گوشہ گیر ہو.... جائیں یا اسی غنڈہ گردی کا ایک فرد بن جائے۔

اس وقت کی بات کا ہمیں اس وجہ سے یقین آتا ہے کہ عقیدت مندی کا یہ جھوٹا خمار ہم نے ۱۹۶۵-۶۶ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کہ اسی جھوٹی عقیدت نے متعدد مقتدر علمار فضلا اور بزرگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ گوشہ گیر ہوجائیں۔ یہ ان حضرات کے حق میں تو اچھا ہوا لیکن بُرا یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور صالح ترین ہاتھوں سے نکل کر قیادت کے پیاسے چند غنڈوں کے ہاتھ میں آگئی۔

بہر حال اسی طرح بعض رسالوں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ پھر کیا تھا غنڈہ گردی شروع ہوگئی۔ جس سے تنگ آکر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ایک بیان صفائی جاری کیا۔ جو اپریل ۱۹۳۱ء کے اخبار "اصلاح" بجنور میں شائع ہوا تھا۔

مکتوب گرامی

جناب مکرم مولانا محمد ظہور الحق صاحب مالک اخبار" اصلاح "سلمکم اللہ تعالے
آپ کے اخبار" اصلاح " مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۲۱ء میں جو ایک مضمون
بعنوان" شریف مکہ کی بغاوت شرعی نقطۂ نگاہ " شائع ہوا ہے۔ اور اس
میں جناب عزیز احمد صاحب سہارنپوری نے اپنے بھائی کے ذریعہ سے مجھ
سے گفتگو کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور میری نسبت لکھا ہے " کہ میں کہتا ہوں
کہ شریف مکہ ہرگز باغی نہیں ہے۔ بلکہ خطار اجتہادی پیش آگئی تھی۔ اور جبکہ
وہ گورنمنٹ انگریزی کے حلیف ہیں۔ اور ہم لوگ گورنمنٹ کے معاہد اور ذمی
ہیں۔ اور اسی وجہ سے ترک موالات کبھی ناجائز ہے۔ اور اسی وجہ سے میں
اور میرے احباب ایسے جلسوں کی شرکت سے اجتناب کرتے ہیں۔ تو ان کی توہین
کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اِلَّا الَّذِیْنَ عَاھَدْتُّمْ نص صریح ہے۔ اور شریف کی
توہین چونکہ سرکار کے خلاف رضا ہے۔ اس لئے کبھی جائز نہیں وغیرہ وغیرہ امور
کو میری طرف منسوب کیا ہے۔ میں جناب عزیز احمد صاحب سے مطلق واقف نہیں
ہوں۔ اور نہ ان کے بھائی صاحب کو جانتا ہوں نہ یہ صاحب کبھی میرے پاس
آئے نہ ان سے کبھی گفتگو ہوئی۔ بلکہ جہاں تک تفتیش کی گئی۔ سہارنپور میں ان کا
پتہ نہیں چلا کہ کون صاحب ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ علاوہ
ازیں جو کچھ مضمون میرے متعلق شائع کیا ہے۔ سراسر کذب ہے۔ اور بے
سرو پا بہتان ہے۔ میرے احباب نے تقریر و تحریر سے اس کی کافی تردید کی
ہے خصوصاً مولانا الحاج سید حسین احمد صاحب نے خود تحریر فرما دیا ہے کہ
خلیل احمد کی نسبت یہ مقولہ غلط ہے۔ میری خود خلیل سے بارہا گفتگو ہوئی۔ وہ
حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کا بالکل ہم خیال ہے۔ فقط بعض تجاویز

میں جزوی اختلاف ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ اِس مقولہ کی نسبت خلیل احمد موصوف کی طرف شخصی اور نفسانی اغراض کی بنا پر ہے۔ اس میں مولانا سید حسین احمد صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور راست ہے اور عزیز احمد کی تحریر غلط ہے اور افترا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس تحریر سے دھوکہ نہ کھاویں۔ فقط

خلیل احمد

"اصلاح" مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء

جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور

از رجب ۱۲۸۳ھ

دارالعلوم دیوبند کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تحریر کر چکے ہیں۔ یہاں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے متعلق کچھ مختصر عرض کرنا ہے۔ مظاہر علوم کا وجود دارالعلوم کے چھ ماہ بعد یعنی رجب ۱۲۸۳ھ میں ظہور میں آیا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مولانا سعادت علی خاں صاحب سہارنپوری کے دل میں ایک دینی مدرسہ قایم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور یکم رجب کو محلہ قاضی میں اس کی بنیاد رکھی۔ اور مولوی سخاوت علی صاحب انبیٹھوی کو تیرہ روپے ماہوار پر مدرس بنا کر بٹھا دیا۔ اس وقت مدرسہ ایک کرایہ کے مکان میں تھا۔ تین ماہ بعد شوال ۱۲۸۳ھ میں مولانا مظہر صاحب مدرسہ کے صدر مدرس بنائے گئے۔ اور مولانا سخاوت علی صاحب مدرس دوم ہو گئے۔ چند سال بعد حافظ فضل حق صاحب کو (جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے) کو خیال ہوا کہ مدرسہ کو اپنے محلہ میں لے آئیں۔ یہ مکان کہ جس میں اس وقت مدرسہ ہے۔ حافظ صاحب کا ذاتی تھا۔ اس کو انھوں نے توڑ کر مدرسہ کی موجودہ حالت پر تعمیر کرایا۔ اور مدرسے کے نام ہبہ نامہ کر کے مدرسہ اس میں قائم کر دیا۔ اثنا رتعمیر میں مولانا سعادت علیخاں صاحبؒ بانی مدرسہ انتقال فرما گئے اور اسی تعمیری سال پر مدرسہ کا تاریخی نام مظاہر العلوم ۱۲۹۲ھ تجویز ہوا۔ اس وقت مدرسہ کے مبران وسرپرست سب کچھ تین حضرات تھے۔ مولانا محمد مظہر صاحبؒ۔ قاضی فضل الرحمن صاحبؒ۔ حافظ فضل حق صاحبؒ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس جگہ پر مدرسہ مذکور کی بنیاد سے لیکر الی یومنا ھٰذا ایک نقشہ کے ذریعہ مدرسہ کے حالات کو بقید سن درج کردیں۔ وھو الموفق والمستعان۔

نمبر شمار	نام سرپرست	نام مہتمم و منتظم	نام صدر مدرس	سن	کیفیت
۱	مولانا سعادت علی خانصاحب	مولانا سعادت علی خانصاحب	مولانا سخاوت علی خاں صاحب انبیٹھوی	۱۲۸۳ھ	یکم رجب ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ قایم ہوا۔
۲	مولانا محمد مظہر صاحب	مولانا محمد مظہر صاحب	مولانا محمد مظہر صاحب	۱۲۹۲ھ تا ۱۳۰۲ھ ہجری	اس زمانہ میں تین سرپرست تھے۔ مگر روح رواں مولانا محمد مظہر صاحب ہی تھی
۳	" " "	" " "	مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری	۱۲۹۵ھ	مولانا محمد مظہر صاحب حج کو تشریف لے گئے تھے، اس وجہ سے عارضی تقرر ہوا
۴	" " "	" " "	مولانا محمد مظہر صاحب	تا ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ	۱۳۰۲ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب کا وصال ہو گیا
۵	قاضی فضل الرحمن صاحب	قاضی فضل الرحمن صاحب	مولانا عبد العلی صاحب	۱۳۰۲ھ تا ۱۳۰۶ھ	
۶	" " "	" " "	مولانا حبیب الرحمن صاحب سہارنپوری	۱۳۰۶ھ تا ۱۳۱۴ھ	۱۳۰۲ھ تک مولانا احمد علی صاحب میرٹھی بھی رہی

نمبر شمار	نام سرپرست	نام مہتمم و منتظم	نام صدر مدرس	سن	کیفیت
۷	حضرت امام ربانی رح	مولانا عنایت الٰہی صاحب	مولانا خلیل احمد صاحب	سنہ ۱۳۱۴ھ تا سنہ ۱۳۲۰ھ	
۸	حضرت مولانا رائپوری صاحب		مولانا خلیل احمد صاحب	سنہ ۱۳۲۰ھ	
	مولانا ذوالفقار علی صاحب	مولانا خلیل احمد صاحب	" "	سنہ ۱۳۲۵ھ	سنہ ۱۳۲۵ھ میں آپ ناظم بھی ہوگئے
	مولانا اشرف علی صاحب			سنہ ۱۳۴۲ھ	
.	حضرت شیخ الہند				
۹	مولانا خلیل احمد صاحب	مولانا خلیل احمد صاحب	مولانا خلیل احمد صاحب	تا سنہ ۱۳۴۴ھ	سنہ ۱۳۳۷ھ میں حضرت رائپوری کا وصال
۱۰	" "	مولانا عبداللطیف صاحب	مولانا عبدالرحمٰن صاحب	تا سنہ ۱۳۷۲ھ	مولانا محمد یحییٰ صاحب شیخ الحدیث
۱۱	مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری حضرت شیخ الاسلام	" "	مفتی سعید احمد صاحب	سنہ ۱۳۷۶ھ	مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث
۱۲	مولانا عبدالقادر صاحب	مولانا اسعد اللہ صاحب	مولانا امیر احمد صاحب	سنہ ۱۳۰۸ھ	" " " "

کو دیوبند سے مظاہرالعلوم بلالیا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جس میں حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ کا تقرر بحیثیت سرپرست ہوا۔ اور یہ مدرسہ تقریبًا ۵ یا ۶ سال تک خوب ترقی کرتا رہا لیکن ۱۹۰۳ء یا ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ کے جاہ طلب ممبران کی طرف سے ایک ہنگامہ اٹھا اور قتل و غارت اور خون دخرابے سے بال بال محفوظ رہا۔ ان حالات میں حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ نے سرپرستی سے استعفےٰ دیدیا اور آپ کی جگہ تین حضرات سرپرست مقرر ہوئے (۱) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ (۲) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ (۳) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ، پدر بزرگوار حضرت شیخ الہندؒ۔

۱۳۲۵ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ہی ناظم بنا دیئے گئے۔ اور صدر مدرس بھی رہے۔ پھر کیا تھا مدرسہ دن دونی، رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ آمدنی میں بھی توسیع ہوئی اور طلباء کی بھی کثرت اور مدرسین میں بھی اضافہ ہوا۔ کتب خانہ اور خالی چھتوں پر درس گاہوں کی تعمیر ہوئی۔ مفتی اور قاری حضرات کا تقرر ہوا۔ دریں صورت مدرسہ کا مکان ناکافی ثابت ہوا۔ مدرسین اور طلباء کی قیام گاہوں کے لئے تعمیر کی ضرورت ہوئی۔ تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ کے لئے جدید عمارت کی تعمیر شروع کرائی اور کوشش بلیغ کے بعد دس سال کے اندر یعنی ۱۳۳۷ھ تک مدرسہ کی عمارت تقریبًا چالیس ہزار کی لاگت سے بن کر تیار ہوگئی۔ اسی زمانہ میں بھوپال کی ایک نیک دل خاتون کلثوم جہاں بیگم نے اپنے صرفہ سے مدرسہ کے احاطہ میں ایک مسجد تعمیر کرادی۔ جس کو مسجدِ کلثومی کہا جاتا ہے۔ ۱۳۴۳ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ

بقصد ہجرت مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ اور وہاں پورے ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد آپ نے وصال فرمایا۔ اور قبہ عثمانی کے پاس مدفون ہوئے ـــ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ)

مندرجہ ذیل سطور میں مدرسہ مظاہر العلوم کے فارغین طلبار کی تعداد سن وار پیش کی جاتی ہے ـ

نام سن	تعداد	نام سن	تعداد	نام سن	تعداد	کیفیت
سنہ ۱۳۱۴ھ	۴	سنہ ۱۳۲۶ھ	۱۶	سنہ ۱۳۳۹ھ	۲۴	سنہ ۱۳۴۴ھ تک
سنہ ۱۳۱۵ھ	۵	سنہ ۱۳۲۷ھ	۸	سنہ ۱۳۴۰ھ	۱۸	فارغین طلبار
سنہ ۱۳۱۶ھ	۷	سنہ ۱۳۲۸ھ	۱۰	سنہ ۱۳۴۱ھ	۱۴	وہ ہیں جو حضرت
سنہ ۱۳۱۷ھ	۷	سنہ ۱۳۲۹ھ	۱۲	سنہ ۱۳۴۲ھ	۲۵	مولانا خلیل احمد
سنہ ۱۳۱۸ھ	۶	سنہ ۱۳۳۰ھ	۱۳	سنہ ۱۳۴۳ھ	۳۳	صاحبؒ کے
سنہ ۱۳۱۹ھ	۷	سنہ ۱۳۳۱ھ	۱۶	سنہ ۱۳۴۴ھ	۳۰	شاگرد ہیں ـ
سنہ ۱۳۲۰ھ	۱۰	سنہ ۱۳۳۲ھ	۷	سنہ ۱۳۴۵ھ	۲۶	
سنہ ۱۳۲۱ھ	۵	سنہ ۱۳۳۳ھ	۹	سنہ ۱۳۴۶ھ	۲۱	
سنہ ۱۳۲۲ھ	۸	سنہ ۱۳۳۴ھ	۱۴	سنہ ۱۳۴۷ھ	۴۲	
سنہ ۱۳۲۳ھ	۱۰	سنہ ۱۳۳۵ھ	۷	سنہ ۱۳۴۸ھ	۳۰	
سنہ ۱۳۲۴ھ	۹	سنہ ۱۳۳۶ھ	۱۹	سنہ ۱۳۴۹ھ	۲۷	
سنہ ۱۳۲۵ھ	۹	سنہ ۱۳۳۷ھ	۱۰	سنہ ۱۳۵۰ھ	۲۳	
÷	÷	سنہ ۱۳۳۸ھ	۱۱	سنہ ۱۳۵۱ھ	۲۶	

نام سن	تعداد	نام سن	تعداد	نام سن	تعداد	کیفیت
۱۳۵۲ھ	۳۴	۱۳۶۱ھ	۴۴	۱۳۷۰ھ	۳۶	
۱۳۵۳ھ	۳۱	۱۳۶۲ھ	۴۵	۱۳۷۱ھ	۵۹	
۱۳۵۴ھ	۴۴	۱۳۶۳ھ	۵۶	۱۳۷۲ھ	۳۳	
۱۳۵۵ھ	۳۹	۱۳۶۴ھ	۴۴	۱۳۷۳ھ	۴۷	
۱۳۵۶ھ	۵۰	۱۳۶۵ھ	۶۲	۱۳۷۴ھ	۵۹	
۱۳۵۷ھ	۲۰	۱۳۶۶ھ	۴۲	۱۳۷۵ھ	۵۱	
۱۳۵۸ھ	۳۳	۱۳۶۷ھ	۳۹	۱۳۷۶ھ	۴۶	
۱۳۵۹ھ	۴۰	۱۳۶۸ھ	۳۰	۱۳۷۷ھ	۵۳	
۱۳۶۰ھ	۴۵	۱۳۶۹ھ	۳۸	۱۳۷۸ھ	۴۹	

مدرسہ کی خصوصیات

مدرسہ مظاہر العلوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اب تک مدرسہ انھیں لائنوں پر کام کر رہا ہے کہ جو لائنیں اس کے لئے روزِ اوّل مقرر کردی گئی تھیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں یعنی بادشاہوں اور وزیروں کے سامنے دستِ سوال ہرگز دراز نہیں کرتے غریبوں اور عام مسلمانوں کے چندے پر انحصار زندگی ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائش سے مدرسہ کا ہر فرد پرہیز کرتا ہے۔ اور خلوص و توکل کا سہارا لیتے ہوئے خدمتِ دین میں مصروف ہے۔ استاذ اور شاگرد سب ایک ہی خانہ میں ہوتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں سب کے ہاتھوں میں دستی پنکھا ہوتا ہے یا بوقتِ درس پسینہ پسینہ ہوتے ہیں۔ اس طرح طلباء اور اساتذہ میں

محنت اور جفاکشی کی عادت تو پڑتی ہی ہے ۔ ضروریاتِ زندگی بھی محدود ہوگئی ہیں ۔ اور کم اخراجات کی وجہ سے "ھَلْ مِنْ مَّزِیْد" کی ہوس دل میں پیدا نہیں ہوتی ۔ مدرسین کو تنخواہیں نہایت قلیل مقدار میں اتنی دی جاتی ہیں کہ غریبانہ اور درویشانہ شان کے ساتھ زندگی گذار سکیں ۔ اس طرح مدرسین کو متوکل علی اللہ بننا پڑتا ہے ۔ اور ان کے دماغوں میں تنعم اور عیش وعشرت اور رئیسانہ ٹھاٹ کی بو پیدا تو کیا ہوتی پاس بھی نہیں پھٹکتی ۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ کے تمام حضرات میں توکل اور اخلاص اور زیادہ پیدا کرے ۔ اور آخرت میں مراتب اعلیٰ پر فائز فرمائے ۔ (آمین)

بذل المجہود

اگرچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو تمام فنون میں مہارت تامہ حاصل تھی ۔ لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا ۔ اسی شغف کی وجہ سے آپ نے ابوداؤد کی شرح فرمائی ۔ جس وقت شرح کی ابتدا فرمائی اس وقت آپ کی عمر شریف ۶۲ سال کی ہوچکی تھی ۔ یہ شرح آپ نے ۱۳۳۵ھ میں شروع کی اور ۱۳۴۵ھ میں اپنے وصال سے تقریباً دو ماہ پیشتر اس کو مکمل کر دیا ۔ یہ شرح فن حدیث کا عجیب و غریب شاہکار ہے ۔

ہجرت مدینہ اور وصال

۱۳۴۴ھ میں آپ نے ہندوستان کو خیرباد فرمایا ۔ اور مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی ۔ آپ کے دل میں دیارِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مدفون ہونے کی تمنا تھی ۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا ۔

چنانچہ اس تمنا میں آپ نے سات حج کئے ۔ بالآخر ۱۳۴۵ھ میں آپ نے وصال فرمایا ۔ اور قبہ عثمانی کے متصل مدفون ہوئے ۔

خلفاء و مجازین

(۱) حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاندھلوی۔ شیخ الحدیث سہارنپور
(۲) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلوی (بانی تبلیغی جماعت)
(۳) حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہٗ (شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور)
(۴) حافظ قمر الدین صاحب امام جامع مسجد (سہارنپور)
(۵) مولانا عبداللہ صاحب گنگوہیؒ (صاحب اکمال الشیم)
(۶) حاجی محمد حسین صاحب حبشیؒ (مکہ معظمہ)
(۷) حاجی فخر الدین صاحبؒ (غازی آباد)
(۸) مولانا حافظ فیض الحسن صاحب گنگوہیؒ (مقیم کانپور)
(۹) مولانا رشید احمد صاحبؒ (مدرس انجمن ہدایت الرشید قصبہ گروٹے

مقام خلیل

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے کمالات اور مقامات سے تو صحیح طور پر وہی لوگ آگاہ ہوں گے۔ جو آپ کے مرتبہ کے ہوں گے ہم پس ماندگان کے لئے سوائے اندازہ کے اور کوئی ذریعہ آپ کے مقامات دریافت کرنے کا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے اپنے ایک مکتوب میں آپ کو تحریر فرماتے ہوئے لکھا ہے۔

"تم میرے سلسلہ کے فخر ہو مجھے تم سے بہت خوشی اور مسرت ہے"

اللہ اکبر حد سلسلہ کا یہ ارشاد کتنا وزن رکھتا ہے۔ کہ جس کا ادراک ہم جیسوں سے ناممکن ہے۔

پانچویں حج میں آپ طواف قدوم کے لئے حرم شریف میں داخل ہوئے تو

مولانا محب الدین صاحب خلیفہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا: "دیکھو حرم میں کون آیا ہے کہ پورا حرم منور ہو رہا ہے۔ جب آپ طواف سے فارغ ہو کر ان کے پاس گئے تو مولانا محب الدین صاحبؒ نے فرمایا۔

"آہا! آپ ہی تھے کہ جن کی وجہ سے پورا حرم منور تھا"

سہارنپور میں ایک مناظرہ آریہ اور اہل اسلام کا ہوا تھا۔ آریہ اپنے ایک سادھو کو لائے تھے کہ جو توجہ دے رہا تھا۔ اور اپنی باطنی توجہ سے مناظر اسلام کو غالب نہیں آنے دیتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو یہ معلوم ہوا۔ تو آپ بھی اس سادھو کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس کی تمام کرتوت کو سلب کر دیا۔ چنانچہ وہ بھاگ نکلا اور مناظر اسلام غالب آیا۔

(تذکرۃ الخلیل)

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی

از ھ تا ۱۳۴۴ھ

ولادت و نسب آپ کے والد ماجد کا نام شاہ حبیب احمد ہے۔ آپ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے چچیرے بھائی ہوتے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب وہی ہے جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا ہے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے نانا حضرت مولانا مملوک علی صاحب ہوتے ہیں۔ اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کے نانا حضرت شاہ حسن عسکری ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ حسن عسکری صاحب کے ایک صاحبزادی بی بی امۃ اللہ تھیں۔ ان کی شادی شاہ حبیب احمد صاحبؒ سے ہوئی تھی۔ انھیں کے بطن سے حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ پیدا ہوئے۔

شاہ حسن عسکری صاحب سے دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو بہت زیادہ عقیدت تھی۔ اس وجہ سے آپ کا رہنا اکثر دہلی ہی میں رہتا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں جب دہلی برباد ہوئی اور بادشاہ کو گرفتار کرکے رنگون بھیجدیا گیا۔ تو ظالم برطانیہ نے شاہی خواص کو بھی بہ نگاہ عتاب دیکھا چنانچہ حضرت حسن عسکری دہلی سے انبیٹھہ چلے آئے اور روپوش ہوگئے۔ چنانچہ ظالم برطانیہ نے شاہ حبیب احمد اور ان کے دیگر بھائیوں کو گرفتار کرکے سہارنپور جیل میں بند کر دیا۔ اور طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ لیکن ان کی غیرت اور حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ حضرت شاہ حسن عسکری کا پتہ بتادیں۔ بالآخر جب حضرت شاہ حسن عسکری نے یہ دیکھا کہ آپ کی وجہ سے آپ کے عزیز و اقارب مصیبت میں مبتلا ہیں تو خود ہی حاضر ہوئے اور

سہارنپور پہونچ کر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کردیا۔ چنانچہ بے رحم حکومت نے ان کو بلا قصور تختہ دار پر ٹانگ دیا۔ اور تمام املاک وجائداد ضبط کرلی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے تین بھائی اور تھے۔ مولانا انوار احمد صاحبؒ، سلطان احمد صاحب، منیر احمد صاحب۔ مولانا صدیق احمد صاحب ان میں سب سے بڑے تھے۔ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے تقریباً ہم عمر تھے۔

تعلیم وتربیت حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور آپ کی تعلیم وتربیت ساتھ ساتھ ہوئی۔ مولانا خلیل احمد صاحب کو الیار پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے تو آپ بھی گئے۔ وہ دیوبند گئے تو آپ بھی دیوبند گئے۔ انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا تو آپ نے بھی حفظ کیا۔ وہ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے تو آپ بھی بیعت ہوئے۔ ان کو دربار رشیدیہ سے اجازت وخلافت ملی تو آپ کو بھی ملی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ د

"مجھے تو مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی حرص ومنافست نے بڑھایا ہے!"

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

آیت شریفہ میں وصول الی اللہ یعنی نسبت کی دو قسم ظاہر ہوئیں۔ ایک اجتبائی کہ اُدھر سے کشش ہو۔ اور بندہ سالک کو مطلوب بنایا جائے اور دوسری انابتی کہ ادھر سے طلب ہو اور سالک محب و نالہ بنے۔ چنانچہ میری نسبت اجتبائی ہے۔ الخ

(تذکرۃ الخلیل ص۱۴۳ وھکذا فی قصص الاکابر)

مولانا خلیل احمد صاحبؒ تو کچھ دنوں کے بعد مظاہر علوم سہارنپور چلے

گئے تھے۔ لیکن آپ دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے رہے اور یہیں سے فارغ التحصیل ہوئے جس زمانہ میں آپ مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے تو وہاں حکیم عبدالمجید صاحب دہلویؒ بھی کسی کے علاج کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے ان کی توجہ طب یونانی کی طرف مبذول کرائی اور اپنے ساتھ دہلی لے آئے اور طب یونانی کی تکمیل کرائی لیکن آپ نے طب یونانی سے کوئی کام نہ لیا۔

بیعت وسلوک

سلوک وتصوف میں انوار وتجلیات وواردات کی تفصیلی سیر جس قدر آپ کو کرائی گئی وہ شاید دباید ہی دوسروں کو حاصل ہوتی ہے۔ ذیل میں مکاتیب رشیدیہ سے قطب العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کے ان مکتوبات گرامی کے اقتباس پیش کرتا ہوں جو حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ کو ان کے مکاتیب کے جواب میں لکھے ہیں۔

"آپ کا خط آیا حال معلوم ہو کر بہت فرحت ہوئی۔ حق تعالیٰ ترقی فرمائے اوّل یہ سنو ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتداء میں تلقین ہوتا ہے وہ تو مقصد اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔ اس کی کہ بتدریج احاطہ ذات کا مورث ہو جاوے۔ پس بکل شئی محیط کا تصور اصل ہے اور احاطہ نور کا تصور اس کی ہی غرض سے تھا۔ اب ذکر میں یہی تصور کرو کہ "إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" ملاحظہ نور کی ضرورت نہیں کہ وہ مقدمہ ومبداء تھا اور یہ مقصود و اصل اب ذکر ربانی میں یہی احاطۂ ذاتی کا لحاظ کرو۔ اور پاس انفاس میں بھی خروج ودخول نفس ذکری میں احاطہ ذاتی کا تصور کرو الخ (مکتوب ۱۵۲ ص ۱۵۳)

خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تو فقط یہ بات متصور تھی کہ اسم کا نور محیط ہوتا ہے اب لفظ اللہ کے ساتھ یوں تصور کرو کہ اللہ کی ذات محیط ہے۔

" وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط" خود ثابت ہے الخ (مکتوب ۱۵)

ایک خط کل دوشنبہ کو آیا تھا جواب کی دونوں میں حاجت نہیں تمہارے حالات صادق ہیں الخ (مکتوب ۱۶)

سالک کو بجز لحاظ بحث کے اور افنا اپنے کے مجردات ہیں اور تجرید ذات کی عن جمیع الشیونات اجتناب لازم ہے۔ (مکتوب ۲۰)

آپ کے خطوط سے حالات معلوم ہوئے جو کچھ عنایات حق تعالیٰ کی بندۂ احقر پر مبذول ہیں اس کا شکر یہ محال ہے ماحصل مقصود تو احسان ہے۔ سو وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو عطا ہوا صحابہ رضی اللہ عنہم کے قرن میں یہ احسان ہی تھا۔ الخ (مکتوب ۲۱)

غرضکہ اسی طرح ۲۵ مکتوب حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو لکھے جن میں سلوک و تصوف کے معارف وحقائق کے سمندر موجزن ہیں۔ ان ہی مکتوبات سے آپ کے مقامات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ بالآخر حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ کی دستار مبارک جو آپ کے پاس تھی۔ آپ (حضرت مولانا صدیق احمد صاحب) کو عنایت فرمائی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سلسلۂ درس

فارغ التحصیل ہونے کے فوراً ہی بعد آپ کو بارہ روپے ماہوار پر دارالعلوم دیوبند...میں مدرس رکھ لیا گیا۔

آپ سے مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے۔

"مولوی صدیق احمد! تمہاری وجہ سے میری دیرینہ مراد پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ مجھے مدت سے افسوس ہے کہ پنجاب و بنگال دور دور کے طلبہ آتے ہیں

ہیں۔ اور فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اور ہمارا علاقہ علم سے خالی ہوتا چلا جاتا ہے۔ الخ (تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۴۱)

میزان سے لے کر ملاحسن تک کی جماعتیں آپ کے سپرد ہوئیں طرز تعلیم آپ کا اتنا عجیب تھا کہ ایک ہفتہ میں نحو میر مکمل حفظ کرا دیا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر ۵ ، فی صدی طلباء آپ کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے تو دیگر مدرسین کو حسد ہوا۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں شکایت کی۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بہت خصہ ہوئے۔ آپ نے عرض کیا۔

حضرت ! میری جماعت کا امتحان لے لیا جائے۔ تب آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ میں نے پڑھایا ہے یا نہیں، جب امتحان لیا گیا تو آپ کی جماعت کے طلباء کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ (ملاحظہ فرمائیے تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۴۲)

اس کے بعد آپ کو دارالعلوم چھوڑنا پڑا۔ اور کچھ دنوں تک گلاؤٹھی میں پڑھاتے رہے۔ گلاؤٹھی سے آپ کو ریاست مالیر کوٹلہ بعہدہ صدر مفتی بلا لیا گیا۔ اور آخر وقت تک آپ وہاں دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ جب تک حیات رہے۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور کے ابتدائی درجات کے ممتحن کی حیثیت سے برابر تشریف لاتے رہے۔

وصال و دیگر حالات

آپ کی تاریخ وصال ۲۰ صفر ۱۳۴۲ھ شب جمعہ ہے۔ جمعہ کے دن آپ کو مالیر کوٹلہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

مولانا ان خوش نصیب بزرگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین اور دنیا دونوں طرح کی نعمتیں بھرپور عطا ہوئیں۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ حق تعالیٰ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں، عالم دین بنایا۔ اور اولاد عطا فرمائی۔ اور

وہ بھی صالح الطبع اور باعمل عالم۔

سخاوت اور مہمان نوازی آپ کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ ریاست سے پچاس روپے ماہوار ملتے تھے مگر سب خرچ کر دیتے تھے۔ وصال کے بعد آپ کے کمربند میں صرف ایک اکنی دیکھی گئی۔ مولانا کو کشف بہت زیادہ ہوتا۔ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ میں نے تین باتیں دریافت کیں جن میں ایک یہ تھی۔ کہ مجھ پر یہ انعامات کیوں ہوئے؟ تو ارشاد ہوا۔ شفقت علی الخلق اور طلبہ کی وجہ سے۔ ایک بار ارشاد ہوا کیا چاہتے ہو۔ شہرت یا اولاد تو میں نے اولاد کو پسند کیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے شروع میں مجددیت کا دعویٰ کیا تھا۔ میں اسوقت مالیرکوٹلہ تھا اور بھائی مشتاق احمد صاحب کے پاس جو لدھیانہ میں پڑھاتے تھے آتا جاتا تھا۔ مرزا صاحب بھی اکثر لدھیانہ میں آتے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ بھائی مشتاق احمد کی مجلس میں تذکرہ ہوا کہ مولوی صاحب باب العلوم تو کریں آیا واقعی وہ مجدد ہے۔ میں نے کہا۔ جب ایسا اتفاق ہو کہ وہ آیا ہوا اور میں بھی یہاں موجود ہوں اس وقت جائیں گے۔ اتفاق سے ایسا موقعہ پیش آ گیا سا اور ایک مجلس میں میرا اور مرزا صاحب کا اجتماع ہو گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مرزا صاحب! کیا واقعی آپ مجدد ہیں؟ کہا ہاں! ۔ میں نے کہا تو مقامات سلوک آپ کو ضرور طے کرائے ہوں گے؟ بولے جی ہاں۔ میں نے کہا سیر اجمالی ہوئی یا تفصیلی؟ کہا اجمالی ہوئی ہے۔ میں نے کہا۔ اجمالی والا مجدد نہیں ہوتا اس پر مرزا صاحب نے کہا۔ مجھے اجمالی اور تفصیلی دونوں ہوئی ہیں۔ میں نے کہا تفصیلی بیان فرمائیے بولے ایسی تفصیلی تھی جیسے ریل گاڑی تیز چل رہی ہو بظاہر تفصیلی ہوتی ہے مگر معلوم کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا ایسی تفصیلی میں اسٹیشن تو تمام ہی پڑے ہوں گے۔ انھیں کے نام شمار کرا دیجئے۔ تو کچھ جواب نہ بن پڑا۔

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ

از ۱۲۷۵ھ تا ۱۳۴۷ھ

مدتیں گذریں کہ تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تمھیں ایسا بھی نہیں

نام ونسب نام نامی عزیز الرحمٰن تاریخی نام ظفر الدین۔ سن ولادت ۱۲۷۵ھ ہے دیوبند کے عثمانی شیوخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کا سلسلہ چند واسطوں کے بعد سلسلہ چشتیہ کے چشم وچراغ کبیر الاولیا ربانی پتی سے جاملتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے والد محترم کا اسم گرامی مولانا فضل الرحمٰن صاحب ہے۔ جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی قبروں کے بیچ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ مدفون ہیں۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ العزیز ۱۲۹۵ھ میں پڑھ کر فارغ ہوئے اس طرح آپ کو دارالعلوم دیوبند کے صفِ اول کے اساتذہ یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۲۹۵ھ میں فارغ ہوکر آپ بغرض درس وتدریس میرٹھ تشریف لے گئے۔ اور وہاں ۱۳۰۹ھ تک رہے۔ اس کے بعد ۱۳۰۹ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند بلا لیا گیا۔

سلوک اور تصوّف سلوک اور تصوف میں آپ کو مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے

شرف بیعت حاصل ہے اور انھیں کے آپ خلیفہ و مجاز بھی ہیں۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نقشبندی سلسلے کے مشہور شیخ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی سے بیعت تھے اور ان ہی نے آپ کو اجازت بیعت و خلافت حاصل تھی۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے کمالات کے بارے میں اس قدر عرض کر دینا کافی ہے جس قدر ان کے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"مولانا گنگوہیؒ میں سوائے اس کے کچھ فرق نہیں ہے کہ مولانا گنگوہیؒ عالم ہیں اور وہ عالم نہیں ہیں۔ ورنہ نسبت باطنی کے اعتبار سے دونوں ایک درجہ کے ہیں۔" (اشرف السوانح ص۱۳۹ ج ۱)

بہرحال حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے ان ہی سے مراحل سلوک طے کئے۔ مزاج میں یکسوئی اور خلوت گزینی تھی۔ مزید برآں یہ کہ شیخ اکمل کی تربیت اور رنگ لائی اور بیوی بچوں کی طرف بھی زیادہ توجہ نہ رہی۔ یہ حال دیکھ کر آپ کے والد محترم نے حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے عرض کیا۔

"جس راہ پر آپ نے عزیز الرحمٰن سلمہٗ کو ڈالا ہے اس کے اچھے اور مبارک ہونے میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا اور اسے چھڑایا نہیں جا سکتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ عزیز الرحمٰن بیوی بچوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اس پر شیخ نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ نے اور بھی اولاد دی ہے۔ اور آئندہ ہوگی بھی۔ انھیں آپ جس طرح اور جہاں چاہیں لگا دیں۔ اس ایک کو صرف اللہ ہی کے لئے چھوڑ دیں۔"

(مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند)

حضرت شاہ صاحب کا یہ ارشاد بادی النظر میں ممکن ہے۔ رہبانیت پر محمول کیا جائے۔ لیکن نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض انجام دینے کے لئے اسی راہ سے ہوکر گذرے بغیر چارۂ کار نہیں۔ کیونکہ ایک عالمِ ربّانی جب تک اپنے قلب کو جلوہ گاہِ ربّانی نہ بنائے گا۔ اس وقت تک وہ کارِ ربّانی انجام نہیں دے سکتا اور اگر بظاہر کسی کے ذریعہ کچھ امور دینیہ انجام پا جائیں۔ تو یہ اس کے لئے سندِ خلوص اور صداقت نہیں ہوسکتے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ کہ دین کے بعض کام فساق وفجار کے ہاتھوں بھی ہوجاتے ہیں لیکن خلوص جس کیفیت کا نام ہے وہ قلب میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ زبان اور جوارح پر اس لئے ایک صاحب بصیرت کو ایک فاسق وفاجر کی نماز میں ظلمت نظر آجاتی ہے۔ اور ایک باخدا کی خرید وفروخت میں نورانیت محسوس ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا کے بارے میں حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ نے ارشاد فرمادیا ہے۔

"محمد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) در قاب قوسین او ادنیٰ رفت و باز نہ گردید واللہ ما باز نہ گردیم۔

ان ہی کمالات کے حصول کے لئے حضرت مفتی صاحب کو شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے لگائے رکھا تھا۔ اور مذکورہ جواب مرحمت فرمایا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک مقصود پانے کے بعد مستحق اجازت ہوتا تھا۔ اور آج صرف راستہ دیکھنے پر مستحق اجازت ہوجاتے ہیں۔ جس کا انجام یہ ہے کہ آج کل کے افراد زمین پر باعث فساد ہوتے ہیں۔ اور پہلے لوگ زمین پر باعث صلاح ہوتے تھے۔ عزیزانِ گرامی ! اعمال جوارح سے ایک دن کے لئے لاپرواہی اور اعمال قلبی سے ایک ساعت کے لئے غفلت منزل سے ایک سال پیچھے ہٹا دیتا ہے۔

خصوصیات وکمالات | بایں کمالات حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ ،

نہایت متواضع تھے ۔ آپ کا روزانہ کا معمول تھا کہ شام کو عصر کی نماز کے بعد پاس پڑوس کے گھروں کا سودا سلف بازار سے خرید کر لا دیا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ برسات کا موسم تھا ۔ ایک بڑی بی کا مکان ٹپکنے لگا ۔ اس نے حضرتؒ کے پاس خبر بھیجی ۔ آپ نے اسی حالت میں اس کے مکان کی مرمت کی ۔ پانی میں بھیگنے کی وجہ سے کئی دن تک بخار آیا ۔ اور آپ نے اطلاع بھی نہ ہونے دی کہ اس وجہ سے بخار آیا ہے ۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو کبھی کسی نے پیر پھیلائے سوتے نہیں دیکھا ۔ فرمایا کرتے "قبر ہے جہاں آدمی پیر پھیلا کر سوئے گا " اس قسم کی عادت تکلفاً ایک آدھ دن جاری ہو سکتی ہے لیکن یہی عادت زندگی کا جزو بن جائے ۔ یہ بغیر کسی خاص تصور کے نہیں ہو سکتا ۔ یہ میں اس وجہ سے عرض کر رہا ہوں ۔ کہ تکلفاً کسی بھی عادت اور اخلاق کو اختیار کر لینا زیادہ دشوار نہیں ہے ۔ لیکن جب اہلِ نظر کے پاس اس قسم کے حضرات پہونچتے ہیں تو اخلاقی چور ثابت ہوتے ہیں ۔

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو ایک اشکال پیدا ہوا کہ آیت مبارکہ میں ہے ۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ (انسان کے کام اس کی سعی ہی آئے گی) ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کسی کے لئے غیر کی سعی کام نہ آئے گی حالانکہ احادیث میں ایصال ثواب کی ترغیب ہے ۔ جب یہ اشکال از خود نہ حل کر سکے ۔ رات کو پیدل گنگوہ چل دیئے ۔ اور ۲۲ کوس کا راستہ پیدل طے کیا ۔ صبح ہونے سے قبل گنگوہ پہونچ گئے ۔ اس وقت حضرت گنگوہیؒ وضو فرما رہے تھے ۔ دریافت کیا کون؟ عرض کیا عزیز الرحمٰن ہے ۔ اور اس وجہ سے حاضر ہوا ہے حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا سعی سے مراد سعی ایمانی ہے ۔ آخرت میں سعی ایمانی دوسرے کے کام نہ آئیگی ۔

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایمان تو کسی کا ہو اور کام کسی کے آجائے۔ اور حدیث میں سعی عملی مراد ہے جو ایک دوسرے کے کام آسکتی ہے۔ (روایت مہتمم صاحب دفتر نقل)

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے مقام کی رفعت اس سے معلوم ہوگی۔ کہ ایک مرتبہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لبوں کو بوسہ دیا۔ صبح کو بیدار ہوئے تو اس کے اثرات پائے۔ عہد کیا کہ آیندہ لبیں نہ تراشوں گا۔ ساتھ ہی اتباع سنت کا خیال آیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اور یہ دعا ان کی قبول ہوئی۔ چنانچہ آپ کی لبیں اس حد سے آگے نہ بڑھتی تھیں۔ اور نہ آپ کو کسی نے کبھی لبیں ترشواتے دیکھا۔ آپ کے روحانی کمالات اور تصرفات کے متعلق بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

علمی کمالات

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ ۱۲۹۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور اس سال کے جلسۂ دستار بندی میں مندرجہ ذیل حضرات کی دستار بندی ہوئی۔

(۱) مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ (۲) مولانا احمد صاحب سکندر پوری۔ (۳) مولانا محمد اسحاق صاحب فرخ آبادی (۴) مولانا بشیر احمد صاحب بندولہ۔ (۵) مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی (۶) مفتی رحیم بخش صاحب شیر کوٹی (۷) مولانا سراج الحق صاحب دیوبندی۔

۱۲۹۹ھ میں آپ کو اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب ابن حضرت نانوتویؒ کو بلا معاوضہ مدرس رکھ لیا گیا۔ اس کے بعد آپ میرٹھ تشریف لے گئے وہاں آپ ۱۳۰۹ھ تک پڑھاتے رہے۔ اسی سال آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور نائب مہتمم مقرر ہوئے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۳۱۰ھ میں جب دارالعلوم دیوبند کا ایک مستقل شعبہ دارالافتا قائم کیا گیا۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو اس شعبہ کا مفتی مقرر فرمایا۔ اس عہدہ کے لئے حضرت گنگوہیؒ کا انتخاب کرنا ہی آپ

کی صلاحیتوں کا پورا تعارف ہے۔ اس وقت سے لیکر ۱۳۴۴ھ تک آپ نے اس خدمت کو نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔

فتاویٰ نویسی فنون شرعیہ میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کام میں مسائل اور حالات کے بدلنے سے جس قدر نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کو ہر ایک آدمی محسوس نہیں کرسکتا۔ یوں تو فتاویٰ ہر زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ اور ہر زمانہ میں مفتیان کرام رہے ہیں۔ لیکن فتاویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو حاصل تھا یہ کمال جماعت دیوبند میں صرف دو ہی شخصوں کے حصہ میں آیا۔ ایک حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ۔ اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب دیوبندی۔ آپ کے مختصر الفاظ میں فقہ کا خزانہ مستور ہوتا ہے حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے آپ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

"اب سے ایک صدی پہلے تک علماء کی جماعت میں اس شان کا فقیہ النفس نظر نہیں آتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ جماعت دیوبند میں حضرت گنگوہیؒ فقیہ النفس تھے۔ حضرت مفتی صاحب کے بارے میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہٗ العزیز نے ایک مرتبہ درس میں ارشاد فرمایا تھا۔

"جس وقت میں کنزالدقائق کے حاشیہ سے فارغ ہوا تو مسودہ بغرض اصلاح حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تمام حاشیہ کو نشان لگا کر رنگین کردیا۔ اور فرمایا۔ اس جگہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ کی فلاں عبارت درج ہونا چاہئے۔ بلاشبہ حضرت مفتی صاحب کی رگ رگ میں فقہ رچا ہوا تھا۔ اگر وہ قدیم زمانہ میں ہوتے تو صاحب مسلک ہوتے۔"

آج آپ کے علمی کمالات کی ضمانت آپ کے فتاویٰ ہیں جو شائع ہو چکے ہیں ۔
متعنا اللہ بعلومہٖ (آمین)

وفات اور باقیات

۱۳۴۲ھ کے بعد آپ حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے ۔ وہاں چند سال کام کرنے کے بعد واپس تشریف لائے ۔ اور ۱۷/ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو رات کے ۲ بجے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ دس بجے دن کے احاطہ مولسری میں حضرت میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی نے نماز جنازہ پڑھائی ۔ آپ کا مزار دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں حضرت نانوتوی کے مزار مبارک سے جانب مشرق ہے ۔

سلوک و تصوف میں آپ کے جانشین حضرت مولانا قاری محمد اسحٰق صاحب میرٹھی ہوئے ۔ جو اپنے زمانہ میں کامل درجہ کے شیخ اور صاحب تصرف بزرگ تھے ۔ اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا بدرعالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی تھے جن کی علمی قابلیت کا عالم اسلام معترف ہے ۔ فیض الباری اور ترجمان السنۃ ان کی علمی یادگاریں ہیں ۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بہت سے شاگرد ہوئے ان میں سے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ وغیرہم حضرات قابل ذکر ہیں ۔ آج بھی آپ کے بعض شاگرد موجود ہیں ۔ جن میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کے نام یاد رہ گئے ہیں ۔ اولاد میں مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی زید مجدہم ہیں ۔ بہرحال حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی جس قدر بھی نشانیاں ہیں ۔ ہمارے لئے قابل قدر ہیں ۔

حضرت شاہ محمد لیسین صاحب نگینوی ؒ

نگینہ کے ایک گمنام بزرگ

از ۱۲۸۵ھ تا ۱۳۶۰ ہجری

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

بیس سال کی مدت کوئی زیادہ مدت نہیں ہے۔ آزادئ ہند سے ذرا پہلے کی بات ہے کہ ضلع بجنور میں بلکہ اس پاس کے اضلاع میں بھی حضرت شاہ محمد لیسین صاحبؒ کے زہد و تقویٰ، ذکر و فکر، کشف و کرامات کے تذکرے سنے جاتے تھے۔ آج بھی ان کے سینکڑوں مریدین موجود ہیں جن کو دیکھ کر اس مرد با خدا اور درویش کامل کی اکملیت کا دل و دماغ پر نقش قائم ہوتا ہے۔ میں نے ان کے ادنیٰ ترین مرید کو اگرچہ وہ حرف شناس کبھی نہ ہو، پابندی شریعت، اتباع سنت، عقیدے کی پختگی میں راسخ پایا ہے۔ حق یہ ہے کہ مریدین پیر کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں پیر کے کمالات منعکس ہوا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ شرعی کلیہ تو نہیں ہے لیکن مشاہدے اور تجربے کے خلاف بھی نہیں ہے۔

ابتدائی حالات

محمد لیسین نام، شاہ لقب، اپنی حیات میں اس ضلع میں حضرت شاہ صاحب کے نام سے متعارف تھے۔ والد صاحب کا اسم گرامی سید بہادر علی ہے۔ سن پیدائش ۱۲۸۵ھ ہے۔ نگینہ (ضلع بجنور) کے ایک محلہ سید واڑہ میں رہا کرتے تھے۔ والد محترم کاشتکاری کا

کام کرتے تھے۔ اس محلہ میں ایک مسجد، مسجد پہاڑی دروازہ کے نام سے مشہور ہے
وہیں حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ ہے۔ اور اس کے آس پاس کے حجرے
مہمان خانہ اور ایک برآمدہ قرآن پاک پڑھانے اور حفظ کرانے کی درسگاہ ہے۔
آپ نے ارشاد فرمایا۔

"جب میری عمر بیس (۲۰) سال کی تھی۔ تب ہی سے میں نے اس حجرے کو صاف کرکے آباد کیا تھا۔" (روایت صاحبزادہ محترم حافظ محمد احمد صاحب)

گویا آپ نے ۷۴ یا ۷۵ سال تک اس مسجد کو ذکر و فکر اور تلاوت قرآن پاک کے نور سے معمور فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز اگرچہ باقاعدہ عالم نہ تھے۔ البتہ حافظ قرآن تھے۔ فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ دستور کے مطابق حفظ کلام اللہ کے بعد گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ وغیرہ فارسی کی بڑی کتابیں کس سے پڑھیں کہاں پڑھیں۔ اس کا پتہ نہیں ہے۔ لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ کہ آپ نے کسی مدرسہ میں داخل ہوکر پڑھا ہے۔ اور اغلب گمان بھی یہی ہے۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں مسجد کے ائمہ ہی یہ خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ نہ کسی سے اجرت نہ فیس، محض متوکلانہ امامت کراتے۔ اور بچوں کو قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت کی تعلیم میں بڑی نورانیت اور بڑی خیر و برکت تھی۔ حسبۃً للہ تعلیم تھی۔ بچوں کے ورثا سے جو کچھ بھی ہوتا استاد کی خدمت کرتے ان کا احترام کرتے اور ان کے ممنون احسان ہوتے۔ اس وقت آج کل کی طرح امامت اور مدرسی پیشہ نہ تھی۔ بلکہ ایک ذمہ داری تھی جس کو اہل حضرات ادا کرتے تھے۔ اور دیگر مسلمان اس کو اپنے اوپر احسان سمجھتے ہوئے ان کی حسبۃً للہ خدمت کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کو ابتدا ہی سے ذکر و فکر اور عبادت الٰہی کا شوق تھا۔ آپ ایام طفولیت میں بھی عام بچوں کی طرح کھیل کود، لہو و لعب کے دلدادہ نہ تھے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"مجھے آج جو کچھ ذکر و فکر اور عبادت خداوندی کی توفیق حاصل ہے۔ یہ سب میری والدہ اور بزرگ پھوپی کا طفیل ہے۔ میری والدہ کی دلی خواہش تھی وہ مجھے بزرگوں اور پیروں کی طرح دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ اس لئے رات کو اٹھا کر مسجد میں تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے بھیجا کرتی تھیں۔ اور اسی پر اکتفا نہ کرتیں بلکہ میری نگرانی فرمایا کرتیں۔ مسجد میں آکر دیکھتیں کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ ایک مرتبہ میں استنجا کرنے کے لئے مسجد سے باہر گیا۔ تو کوئی میری چادر اٹھا کرلے گیا۔ تب والدہ محترمہ نے فرمایا۔ جاؤ اب مسجد سے باہر نہ جانا وہیں رہنا۔ اس کے بعد والدہ محترمہ دونوں وقت مسجد میں کھانا پہونچاتیں اور شب و روز میں متعدد بار آکر میری نگرانی فرماتیں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس وقت میری عمر بیس سال کی تھی کہ میں نے اس حجرے کو صاف کرکے آباد کیا۔"

(بروایت صاحبزادہ محترم زید مجدہم)

صاحبزادہ محترم جناب حافظ محمد احمد صاحب زید مجدہم نے فرمایا کہ میری دادی بہت نیک خاتون تھیں۔ وہی حضرت والد محترم رح کو اوراد و وظائف تعلیم فرماتیں۔ یعنی ابتدا حضرت شاہ صاحب رح کسی سے بیعت نہ ہوئے تھے۔ بلکہ والدہ محترمہ کی ہدایات اور ان کے تعلیم فرمودہ افکار اور ان کی نگرانی کی وجہ سے سلوک کے بہت سے مراتب حاصل کر چکے تھے۔ بلکہ صاحب نسبت بن چکے تھے۔

نسبت کے بارے میں | اس جگہ شاید نام نہاد حلقہ بگوشان مشائخ

اور کورانہ تقلید کے دلدادوں اور ناواقف مریدین کو شاید یہ خیال ہو کہ بلا بیعت ہوئے کس طرح نسبت حاصل ہو جاتی ہے ؟ یہ دراصل ان کی جہالت اور اس صفت سے متصف نہ ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نسبت اس کیفیت قلبی کا نام ہے جو سالک کے قلب میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت عام طور سے تو کثرت ذکر یا کثرت عبادت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے جس وقت قلب میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو ملکہ یادداشت اور نگہداشت کو کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ اس منزل کی آخری حد قلب و دماغ کے جوڑ سے شروع ہوتی ہے۔ جو استغراق کی انتہا اور فنائیت کی ابتدا ہے۔ اس منزل کو پار کر کے سالک بقائیت کی طرف عود کرتا ہے۔ اور مقام عبدیت پر فائز ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بجز معصیت کے سلب نہیں ہوتی۔ حد یہ ہے کہ کوئی شیخ بھی اس پر قادر نہیں ہوتا۔
(رزقنا اللہ بھا)

جذب شوق ۔۵

اڑاتا خاک سر پر، جھومتا مستانا آتا ہے
نہیں معلوم کس دھن میں ترا دیوانا آتا ہے

حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اپنے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے۔

"ابتداء میں جب ذکر کیا جاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کیفیات پائی جاتی ہیں لیکن بعد میں یہ کیفیات تقریباً ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوری ہانڈی میں جب پانی ڈالا جاتا ہے۔ تو بہت زیادہ سنسناہٹ ہوتی ہے لیکن بعد میں جب ہانڈی پانی خوب جذب کر لیتی ہے۔ تو سنسناہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ (او کما قال۔ مکتوبات رشیدیہ معناً)

یہ کیفیات حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی حاصل ہوئیں۔ والدہ محترمہ نے جیسا

ذکر تلقین فرمایا۔ اس کو پابندی سے کیا۔ اور خوب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چہرہ زرد، راتوں کو رونا، دن میں جنگل کو بھاگ جانا۔ جب زیادہ جوش اٹھتا تو زنجیروں میں باندھ کر کوٹھے کی چھت پر بٹھا دیا جاتا۔ مگر ؎

روک سکتی ہیں بھلا وحشت کو تدبیریں کہیں
فصل گل میں مَیں کہیں تھا اور زنجیریں کہیں

نہ معلوم کس طرح سے وہ زنجیر ٹوٹ جاتی اور آپ اِلّا اللہ کہہ کر جست لگاتے اور کوٹھے سے نیچے ایسے ہی آجاتے، جس طرح کسی نے دونوں کاندھوں کو پکڑ کر نیچے کھڑا کر دیا ہو۔ اور کوئی بھی وقت ہو جنگل کا رُخ اختیار کرتے۔ جناب سید ظفر علی صاحب مرحوم نگینوی نے بیان فرمایا ہے۔ کہ ایک رات آپ کو شیر مل گیا۔ تو آپ نے اس کا کان پکڑ کر فرما دیا "جا بھاگ" وہ جنگل سے فرار ہو گیا۔

پہلی بیعت

جب شوق زیادہ ہوا تو آپ تشنگی کو رفع کرنے کے لئے شیخ کامل کے متلاشی ہوئے اور بقول شخصے کہ پیاسے کو ریت کا میدان پانی کا سمندر موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے ؎

ذکرک للمشتاق خیر شراب
وکل شراب دونہ کسراب

پیاسے کو اس سے کیا غرض کہ یہ دریا ہے یا نالہ ہے، وہ تو مضطرب ہوتا ہے۔ اس کی تو پیاس رفع ہونی چاہیئے۔ وہ ہوش میں کب ہوتا ہے کہ چھان پھٹک میں پڑے۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ جن کی وحشت اور جذب و شوق عروج پر پہونچ چکا تھا۔ ان کو اگر پیر نام کا کوئی پتھر بھی مل جاتا تو اس کے دامن سے لپٹ جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک صاحب گورکھپور کے رہنے

والے جن کا نام "بہادر علی شاہ" تھا۔ بدعت کی طرف مائل، وجد و سماع کے قائل، مزامیر کے دلدادہ تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا۔ یہاں سے آپ کے مجاہدات نے ایک دوسرا رُخ اختیار کیا لیکن آپ اشغال باطنہ سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ اور نہ بدعات سے ہی کوئی دلچسپی رکھی۔ اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ ان چیزوں سے سفر طے نہیں ہوسکتا۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا:-

"میں نے کئی چلّے حضرت شیخ قطب الدین صاحب بختیار کاکیؒ اور حضرت شاہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزارات پر گذارے ہیں۔ چلّے کے زمانے میں باؤلی (وہ حوض جو خانقاہ نظامیہ میں ہے) کا پانی میرا کھانا پانی ہوتا تھا۔ اگر لنگر سے کبھی روٹی مل گئی تو اس پر شکر بجالاتا۔ لنگر کی روٹی جَو کے آٹے کی ہوتی جس میں تنکے دکھائی دیتے۔ پانی کے گھونٹ سے اس کو حلق کے نیچے اتارتا تھا۔" (روایت صاحبزادہ محترم)

بالآخر تمام منزلیں طے کرنے کے بعد سید بہادر علی شاہ صاحب سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں خلافت حاصل ہوئی۔ پیر صاحب نے فرمایا۔ لو میاں محمد یٰسین آج سے تم محمد یٰسین شاہ ہوگئے۔

حضرت گنگوہی سے بیعت

ایک دن کا اتفاق ہے کہ مولانا عالم علی صاحب آپ کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ دریافت کیا۔ بھائی محمد یٰسین صاحب کہاں ہیں؟ کسی نے کہہ دیا حجرے میں ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ کتنی ہی محنت کریں منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا پیر بدعتی ہے۔ یہ آواز آپ کے کان میں بھی پہونچ گئی غصہ میں باہر نکل آئے۔ اور آکر مولانا کا گریبان پکڑ لیا........ مولانا نے فرمایا۔ بھائی میں نہیں کہتا۔ بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کل مبدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار (ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا نتیجہ دوزخ ہے۔)

اور بھائی محمد لٰسین صاحب آپ کا پیر بدعتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ کہ پھر میں کہاں جاؤں؟ فرمایا ہاں یہ بات ہے تو دیکھو! تین حضرات، میں ان میں سے کسی ایک کا دامن پکڑ لو۔ (۱) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ (۲) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۳) اور سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

یہ سن کر میں نے عزم کر لیا کہ پہلے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے ملوں گا۔ کیونکہ وہ قریب ہیں۔ ان کے بعد سائیں توکل شاہ صاحب سے اور ان کے بعد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے۔ چنانچہ میں نے حضرت گنگوہیؒ کو عریضہ لکھا۔ کہ آپ تک کس طرح پہونچوں؟ جواب آیا سہارنپور جامع مسجد میں حافظ قمرالدین کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہاں سے میرے پاس آجاؤ گے۔ چنانچہ میں نے کئی مہینہ میں پیسے جمع کئے۔ جب سہارنپور تک کا کرایہ ہوگیا۔ تو میں سہارنپور پہونچا۔ جامع مسجد میں امام صاحب سے ملاقات کی! انھوں نے فرمایا۔ عشا کی نماز پڑھ کر چلیں گے۔ عشاء کے بعد ہم دونوں چل دیئے اور ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔ صبح کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھی۔ مولانا نماز سے فارغ ہو کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ اشراق کے بعد باہر تشریف لائے۔ میں نے مدعا عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھا! ساتھ ہی حضرت سے عرض کیا۔ میرے پیر زندہ ہیں۔ مولانا نے فرمایا بدعتی کی بیعت فسخ ہے لیکن ان کی شان میں گستاخی نہ کرنا۔ بیعت کرنے

کے بعد مولانا نے چند دن اپنے پاس رکھا۔ اور اجازت بیعت مرحمت فرمائی اور فرمایا چاہے یہاں ٹھہر جاؤ یا واپس چلے جاؤ۔ تمھارا کام پورا ہوگیا۔
(روایت صاحبزادہ محترم حافظ محمد احمد صاحب)

تجدید بیعت کا مسئلہ اس جگہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک پیر کے زندہ ہوتے ہوئے کیا مرید کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے پیر سے بیعت ہوجائے۔ اس کے متعلق شیخ علی متقی صاحب کنز العمال نے اپنی سوانح حیات بیان فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

المرید الصبی اذا جعل مرایل الشیخ فھو بالخیار بعد البلوغ (نابالغ لڑکا جب کسی شیخ سے بیعت ہوجائے تو اس کو بعد بلوغ اختیار ہے۔) (اکمال الشیم)

اس جگہ بلوغ اور عدم بلوغ سے شرعی بلوغ مراد نہیں ہے۔ بلکہ صوفیا کی اصطلاح میں اس کو بالغ کہتے ہیں جس میں ذکر کے اثرات ظاہر ہونے لگیں۔ اس لئے اگر کوئی مرید اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے مقام سلوک طے کرتے لگے۔ اور اس کو اپنے پیر کا غیر اہل حق ہونا ظاہر ہوجائے تو وہ بیعت فسخ کرکے دوسرے شیخ سے بیعت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ بھی حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوگئے۔ جب سید بہادر علی شاہ نگینہ تشریف لائے۔ تو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کے پاس جاکر صاف صاف کہدیا "کہ میں نے آپ کی بیعت فسخ کردی ہے۔ اور میں حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوگیا ہوں" یہ مثال آپ کے حق پسند ہونے کی کتنی واضح دلیل ہے۔ ورنہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ دوسروں کو دھوکے میں رکھا جائے پھر پیری مریدی میں تو یہ حال ہے کہ شیخ خود کتنے ہی قبیح جرم کا مرتکب کیوں نہ ہو۔ اس کو یہ کہنا کہ یہ غلط ہے سلب ایمان کے مترادف ہے

حق گوئی کی مثالیں حضرت سید احمد شہیدؒ کے بعد حضرت مولانا گنگوہیؒ کے یہاں ملتی ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ تو ان کے خلیفہ ہیں۔

خانقاہ حسینی گنگوہ سے واپس آکر آپ نے پھر مسجد پہاڑی دروازہ کو آباد کیا۔ طالبین کی آمد شروع ہوئی۔ قدیمی حجروں کے اوپر دو بڑے حجرے بنوائے گئے۔ مہمانوں اور ذاکرین کی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ لوگوں کی آمد میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا۔ کیونکہ اب پہلی سی بات نہ تھی۔ اب تو رشیدی فیوض و برکات حسینی در دارے سے تقسیم ہونے لگے تھے۔ لہٰذا حضرت گنگوہیؒ کے دربار کی طرح یہاں بھی جو آیا محروم نہ رہا۔ حضرت شاہ صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کی بھٹی ایسی تھی کہ جو ادھر سے ہو کر گذر گیا۔ وہ بھی کامیاب ہو گیا۔ اور جس نے ذرا قیام کیا وہ کندن بن گیا۔"

آج اگرچہ حضرت گنگوہیؒ کے خلفا میں سے تو کوئی نہیں ہے۔ ہاں مریدین میں سے بعض موجود ہیں۔ ایک تو حضرت سید مفتی مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند۔ اور ایک حافظ اللہ دیا صاحب جھنجھانوی۔ یہ دونوں حضرات مستقل پیروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی خانقاہ اور مجلس کی یہ خصوصیت تھی۔ کہ عقلیت کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ ہمیشہ سب کا ذکر بھلائی کے ساتھ ہوتا۔ لوگوں کو دین کی ترغیب دی جاتی۔ مریدوں کو ذکر کے ذریعہ اللہ والا بنایا جاتا۔ غرض کہ ہر وقت خانقاہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذکر سے منور رہتی۔ جو بھی اس راہ سے گذر جاتا محروم نہ آتا اور جو اس ارادہ سے جاتا مالا مال ہو کر لوٹتا۔

ایک مرتبہ ایک صاحب گئے۔صورت دیکھتے ہی عرض کیا مرید کرلیجئے۔ فرمایا۔اس وقت تو آپ اپنے کاروبار کی وجہ سے آئے ہیں۔جب اس ارادہ سے آؤگے تو بیعت کرلیں گے۔

مغرب کے بعد ذکر جہری کا حلقہ ہوا کرتا تھا۔مشائخ دیوبند کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ ذکر بالجہر کا حلقہ کرائیں۔مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ خصوصیت تھی۔کہ حضرت گنگوہیؒ نے ایک مکتوب کے ذریعہ ان کو حلقہ کرانے کی اجازت دیدی تھی۔عصر اور مغرب کے درمیان مجلس میں کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کے مواعظ حسنہ۔حضرت تھانویؒ اور حضرت شیخ الحدیث صاحب زید مجدہم کی تصانیف اس مجلس میں عام طور پر پڑھی جاتیں۔ظہر کی نماز سے قبل پابندی کے ساتھ صلوٰۃ التسبیح کی عادت تھی۔اور اشراق کی نماز کے بعد سے لیکر بچوں کو قرآن پاک حفظ کرایا کرتے تھے جب دورہ میں تشریف لے جاتے تو ان معمولات میں فرق نہ آتا تھا۔

رمضان المبارک میں تو شب بیداری شباب پر ہوتی تھی۔واردین اور مریدین اور اہل مجلس سب ہی حضرات قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔شروع شروع میں آپ تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرتے تھے۔لیکن جب کسی نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا فتویٰ دکھا دیا۔کہ رمضان المبارک میں بھی تہجد کی جماعت جائز نہیں۔اسی دن سے اس کو ترک کردیا۔اور تمام اہل خانقاہ کو سختی سے منع کردیا کہ اب کوئی اس کا ارتکاب نہ کرے۔

بدعت اور اہل بدعت سے بہت زیادہ گریز کرتے تھے۔ایک مرتبہ اوپر کے حجرے میں لیٹے ہوئے تھے۔صاحبزادہ محترم حافظ محمد احمد صاحبؒ کو ارشاد الملوک کا درس دے رہے تھے۔اچانک کتاب چھین کر بند کردی۔

اور کروٹ لے کر اس طرح لیٹ گئے گویا سو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی آئے۔ صاحبزادہ محترم نے کہدیا ابھی سوئے ہیں۔ یہ دونوں یہ کہہ کر چلے گئے۔ اچھا ہمارا اسلام کہدینا۔ جب چلے گئے۔ تو فوراً رُخ بدل دیا۔ اور کتاب دیدی۔ فرمایا یہ بدعتی تھے۔

تعلیمات اور ارشادات

حضرت شاہ صاحبؒ اپنے متوسلین کو ابتداءً دہی تسبیحات پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے جو رشیدی سلسلہ میں صبح و شام کی تسبیحات سے معروف ہیں اس کے بعد اگر کوئی سلوک میں قدم رکھنا چاہتا تو سلوک کے اذکار، پاس انفاس ذکر جہری۔ اسم ذات۔ ذکر قلبی۔ مراقبہ تعلیم فرماتے۔ اور جو کوئی اتنا باہمت نہ ہوتا تو شریعت کی پابندی۔ روزہ، نماز اور فرائض کی پابندی کی ترغیب دیتے۔ آپ کی ترغیب سے سینکڑوں جاہل پڑھے لکھے ہوگئے۔ بچاسیوں نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تعلیمات کے متعلق چند کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں معمولی نوشت دخواند والے کے لئے کافی ذخیرہ آخرت موجود ہے۔

ا۔ **ترغیب ضروریات دین**:۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں جس کو آپ نے املا کرایا ہے۔ سائل نے چند نصائح کے متعلق سوال کیا تھا۔ فرمایا۔

"جتنے احکام شریعت ہیں سب قابل عمل ہیں۔ اور احکام شریعت پر عمل کرنے سے خدا تعالیٰ کا قرب اور رضا حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہاں سب سے پہلے ہر شخص کو اپنے ایمان کو صحیح کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بغیر ایمان کو صحیح کئے کوئی عمل مقبول نہیں ہے۔ اور عمل قبول ہونے کی تین شرطیں ہیں۔ جن کو مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے۔"

ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لھا ۔ (جو آخرت چاہے اور اس کے لئے ویسی ہی
سعیھا وھو مومن فاولٰئک کوشش بھی کرے اور وہ مومن بھی ہو۔ تو یہی
کان سعیھم مشکوراً) لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول بارگاہ ہوتی ہے
اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحت نیت، عمل موافق شرع اور ایمان یعنی صحیح عقیدہ
کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

۲۔ شعبۃ الایمان:۔ یہ تالیف کیمیائے سعادت اور تبلیغ دین از
امام غزالیؒ اور مثنوی مولانا رومؒ سے ماخوذ ہے۔

۳۔ شجرہ الحسینی:۔ یہ چند صفحات کا رسالہ ہے جس میں شجرہ طیبہ چشتیہ
رشیدیہ موجود ہے۔ آخر میں تقریباً چالیس نصیحتیں ہیں۔ جن کے پڑھنے سے
معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کا عطر کشید کیا گیا ہے۔
متعنا اللہ بفیوضہ وبرکاتہ (آمین)

حضرت شاہ صاحبؒ کے بہت سے مکتوبات تھے۔ اور ملفوظات بھی مرتب
کرلئے گئے تھے لیکن افسوس کہ ان میں سے تقریباً سب ضائع ہو گئے بعض مکتوب
اور ملفوظ ادھر ادھر سے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ان میں سے بعض کو اس جگہ
درج کیا جارہا ہے۔

(۱) ارشاد فرمایا۔ غار حرا میں حضورؐ نے جو ذکر و اذکار اور ریاضت و
مجاہدہ کیا ہے ہمیں اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول ہونے کے وقت
سے جو آپ نے اعمال کئے ہیں۔ ان کی تحقیق کی البتہ ضرورت ہے تاکہ آپ کی
اتباع کی جائے۔

(۲) تم اپنا کمال مت سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو تم کو توفیق دے
رکھی ہے۔ جو نیکی بھی مسلمان سے ہو خدا کا شکر ادا کرے۔ اور جو گناہ ہو اپنے نفس

کی طرف سے سمجھ کر توبہ و استغفار کرے ۔ یاد رکھو جو غیب سے ظہور میں آتا ہے وہ بندے کے لئے بہتر ہوتا ہے ۔

۳ ۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا :۔ ایمان ایک درخت کی طرح ہے ۔ اس کی جڑ زہد و تقویٰ سے مضبوط ہوتی ہے اور معصیت سے کمزور ہوتی ہے ۔ منتہی ہونے کے بعد بھی کسی کو اپنا بڑا بنا لینا چاہیئے ۔ کیونکہ نفس و شیطان سے مرتے دم تک مطمئن نہ ہونا چاہیئے ۔

۴ ۔ ذکر اذکار سے فائدہ ضرور ہوتا ہے ۔ مگر مہلکات سے اجتناب بھی ضروری ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے ۔ جیسے کھیت میں بیج ڈال دیا جائے اور اس کے کباڑ کو صاف نہ کیا جائے ۔ بلکہ ہوشیار کاشتکار وہ ہے جو کھیت کی کباڑ سے صفائی کرتا ہے اس کے بعد اس میں بیج ڈالتا ہے ۔

(روایات قاری احمد حسین زید مجدہم)

بندہ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ذکر اذکار میں تزکیہ اور تصفیہ دونوں خاصیت ہیں ۔ تزکیہ یہ ہے کہ اخلاق رذیلہ سے اجتناب ہو اور اخلاق حسنہ پیدا ہوں ۔ اور تصفیہ صفائی قلب کا نام ہے جب تک امراض اور مہلکات ختم نہ ہو جائیں اس وقت تک ذکر کی پوری تاثیرات کے ازالہ پر صرف ہوتی ہے ۔ اور بعد ازالہ اس سے قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے ۔ گویا کہ ذکر میں تغذیہ اور تدفیعہ دونوں تاثیریں موجود ہیں ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کے اس موضوع کو ایک خط اور ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں ۔ حاجی سلیم اللہ صاحب ایک بہت اچھے بزرگ تھے ۔ حضرت حاجی سید عابد حسین صاحبؒ سے بیعت تھے ۔ اور بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھائے ہوئے تھے ان پر قبض کی کیفیت طاری ہوئی ۔ خودکشی کا ارادہ کر لیا ۔ رات کو

خواب میں حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت ہوئی۔ فوراً ہی عازم نگینہ ہوئے حضرت
شاہ صاحبؒ نے آپ سے چند چلّے کرائے۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔
علاقہ نجیب آباد کے بن سے ایک خط حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا تھا
وہ یہ ہے۔

کمترین غلام سلیم اللہ غفر اللہ لہٗ ولوالدیہ

بخدمت اقدس رہنمائے سالکان، پیشوائے عارفان حضرت مرشدی ادامہ
ومولائی دام فیضہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
الحمد للہ والمنۃ میں خیریت سے ہوں اور خیریت مزاج مبارک
مع متعلقین درگاہ رب العالمین سے خواہاں و خواستگار۔ حضور والا
سے رخصت ہو کر میں بن میں پہونچا تو وہ جگہ مجھ کو پسند نہ آئی۔ لہٰذا
وہاں سے نجیب آباد کے بن کی طرف گیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ کل
اپنا ٹھکانا کرلوں گا۔ جو شغل پاس انفاس نفی اثبات آپ نے
تعلیم فرمایا ہے۔ اس کو شروع کردیا ہے۔ چونکہ حضرت مرشدی سید
محمد عابد حسین صاحبؒ نے پاس انفاس "اللہ ھو" کے ساتھ فرمایا
تھا۔ اس لئے نفی اثبات کا خیال کم جمتا ہے۔ آپ ہمت اور توجہ
عالیہ اس ناکارہ کی طرف مبذول فرمائیں گے تو امید ہے کہ انشاء اللہ
نفی اثبات کا خیال بھی جم جائے گا۔ نیز ملتجی ہوں کہ اوقات خاص میں
اپنے اس ناکارہ اور ناچیز غلام کے حق میں دعا فرماتے رہیں۔ کہ
اللہ تعالیٰ میرے قلب کو اپنے شوق، عشق، محبت اور نور معرفت
سے معمور اور منور فرمائے اور اپنا ہی والہ وشیدا اور شیفتہ، فریفتہ
اور اپنے ذکر اور اطاعت اور حضور کے کیف کو میرے جسم ورروح کی

غذا کر دے ۔اور مجھکو ان لوگوں میں کردے کہ جن کی شان میں اپنے کلام پاک میں
اولٓئک ھم المؤمنون حقاً اور لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔
فرمایاہے ۔ والسلام

سگ آستانہ عالیہ لسینیہ ۔ سلیم اللہ

۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

اخلاق وعادات

حضرت شاہ صاحبؒ قطب العالم شیخ المشائخ حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے ۔اس تعارف کے بعد آپ کے روحانی اور اخلاقی کمالات کا بخوبی تعارف ہوجاتا ہے ۔کیونکہ نہایت تحقیق کے بعد یہ چیز درجۂ یقین حاصل کرچکی ہے ۔کہ حضرت گنگوہیؒ کے ادنیٰ سے ادنیٰ مرید بھی اتباع سنت میں راسخ القدم تھے ۔پھر حضرت گنگوہیؒ اور ان کے خلفاء کا تو کیا کہنا اللہ اکبر ۔ان کے کمالات کا ادراک نہایت دشوار ہے ۔حضرت شاہ صاحبؒ کے اخلاقی اور روحانی کمالات پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی یہ شہادت کافی ہے ۔فرماتے ہیں :۔

"حضرت شاہ صاحبؒ کی ولادت ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں اور وصال ۱۳۶۳ھ میں ہوا ۔اس لحاظ سے ۷۸ سال کی عمر ہوئی ۔نہایت بزرگ نہایت متواضع ۔نہایت کم گو ،صاحب کشف اور صاحب تصرفات بزرگ تھے اس ناکارہ پر بہت ہی شفقت فرماتے تھے ۔حضرت ممدوح مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں نہایت اہتمام سے تشریف لایا کرتے تھے ۔اور جلسہ سے فراغ پر کئی دن اس ناکارہ کے پاس قیام فرماتے ۔بڑے اہتمام سے اس ناکارہ کے حدیث کے سبق میں بھی تشریف فرما ہوتے ۔اس نابکار کی عادت اسباق میں ڈبیہ بٹوہ ساتھ لے جانے

کی تھی - ایک مرتبہ حضرت مرحوم نے یوں فرمایا۔ کہ میں پان کھانے کو تو منع نہیں کرتا لیکن حدیث پاک کے سبق میں نہ کھایا کرو اس وقت سے آج تک تقریباً ۵ / ۶ گھنٹہ بھی سبق ہوا لیکن سبق میں کبھی پان کا خیال کبھی نہیں آیا۔ یہ حضرت ہی کا تصرف تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات سننے میں آئے ہیں۔ (فضائل درود شریف ص۵۰)

اس واقعہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق چند چیزیں معلوم ہوئیں۔ علماء اور صلحاء کی مجالس میں شرکت۔ حدیث پاک سے محبت اور محتاط قسم کا طرز زندگی۔

ایک مرتبہ آپ حضرت تھانویؒ کے یہاں حاضر ہوئے۔ حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمایا۔ آپ میرے ساتھ کھانا تناول فرمائیں گے۔ جواباً فرمایا "بہتر! لیکن میرے ساتھ میرا بچہ محمد احمد بھی ہوگا۔ حضرت تھانویؒ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "یہ ہے حضرت گنگوہیؒ کے لوگوں کا کمال"!

بات دراصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ کی دعوت کی تو آپ نے فرمایا "اور عائشہ رضؓ"؟ ان صحابی نے عرض کیا "نہیں" غالباً تین مرتبہ یہی ہوا۔ تیسری یا چوتھی مرتبہ ان صحابیؓ نے عرض کیا "ہاں عائشہ کی بھی" اس کے علاوہ اور دوسری احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ کہ مدعو کو چاہیئے کہ اگر وہ اپنے ساتھ کسی کو لے جائے تو میزبان سے اجازت حاصل کرے۔ آج کل اس کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ بیاہ، شادی کی دعوتوں کے موقعہ پر مدعو کے ساتھ ایک دو بچہ ضرور لگا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ بجنور میں ایک مرید نے آپ کی دعوت کی۔ سالن میں اس قدر

مرچیں تھیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے منہ میں آبلے پڑگئے تھے۔ مگر اس قدر ضبط کیا کہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ حاضرین میں سے ایک مزاج شناس نے میزبان سے کہہ دیا۔ "میاں! سالن میں مرچ زیادہ ہیں، دہی لے آؤ" فوراً ہی آپ کے چہرے کی رنگت بدل گئی بہت برہم ہوئے۔ فرمایا:-

"میزبان کے یہاں جانے سے پہلے ضیافت کے آداب سیکھنا ضروری ہیں۔ کیا میں نے آپ سے سفارش کرائی ہے؟ کیا آپ کو اس غریب کی حالت معلوم ہے۔"

نہٹور کے ایک صاحب اپنی دوکان کے لئے سامان خریدنے نگینہ گئے۔ خیال آیا، چلو حضرت شاہ صاحبؒ سے ملتے آئیں۔ حاضر ہوئے اور دیکھتے ہی بیعت کی درخواست کردی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:-

"بھائی! جب بیعت کے ارادے سے آؤ گے تب دیکھا جائے گا دیکھو! بیعت واجبات یا فرائض میں سے نہیں ہے نہ اس پر نجات موقوف ہے۔ اس سے فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب بیعت ہونے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ مرید کیوں ہوا جاتا ہے۔ خود ہی ارشاد فرمایا بھائی! اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ کوئی روک ٹوک کرنے والا ہو جائے۔"

اس واقعہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کی فراست کے ساتھ بیعت کی غرض و غایت پر بھی روشنی پڑ گئی۔ کیا وہ لوگ غور فرمائیں گے۔ جن کو اندھا دھند بیعت کرنے کا شوق ہے۔ اور جنھوں نے اس منصب شریف کو ایک پیشہ اور نااہلیت کے باوجود شہرت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ۲۹ رشوال ۱۳۶۰ھ میں ہوا شعبان کے مہینہ سے اسہال شروع ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں روزے رکھے اور

معمولات کی پابندی کی۔اسہال اس قدر تھے کہ بار بار لباس تبدیل کرانا پڑتا تھا۔آخر میں اوپر سے نیچے آنا اور کھڑا ہونا دشوار ہوگیا۔تو حکم فرمایا مسجد میں اقامت بلند آواز سے کہی جائے۔تاکہ اس وقت میں اگر جماعت میں شریک نہ ہوسکوں توکم ازکم جماعت سے ادنیٰ درجہ کی مشابہت تو اختیار کرلوں۔چنانچہ جب جماعت کھڑی ہوتی۔اسی وقت اوپر حجرے میں آپ تنہا اپنی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ ؎

خدا رحمت کرے ان عاشقان پاک طینت پر

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "المبطون شہید" (اسہال میں مرنے والا شہید ہے) کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ کو شہادت کا درجہ بھی عطا فرمایا ہوگا۔

حضرت گنگوہی کے غیر مطبوعہ مکتوب

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون۔آنکہ بندہ بخیریت ہے آپ کے لئے دعائے خیر کرتا ہے آپ بارہ تسبیح ذکر جہر کرلیا کریں۔اور جو شامل ہو اور اہل ہو۔اس کو شامل کرلیا کریں اجازت ہے۔فقط والسلام۔ (۱۶ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔خیر وعافیت باعث اطمینان ہوئی۔میں دعاگو ہوں۔دعائے خیر کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔یہ کتاب مولوی محمد رمضان صاحب کی معتبر نہیں ہے۔اس پر کاربند نہ ہوں۔بلکہ بلاقید کسی وقت کے اور سورت کے غیر وقت مکروہ میں جس قدر چاہیں

نوافل ادا کریں۔ اور عورتوں کو تصھا اور بلاق پہننا فقہا نے درست لکھا ہے
مگر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ فرمایا ہے۔ مولود شریف بلا تکلفات
واہیہ بروایات صحیحہ اگر پڑھا جاوے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ مگر عوام
کواس میں مآل کار گمراہی ہوگی کہ لوگ اس فعل کی سند پکڑیں گے۔ اور پھر
وہ اپنی مجلس میں سب کچھ کریں گے۔ فقط والسلام

از بندہ محمد یحییٰ۔ السلام علیکم۔ مبلغ ...... مرسلہ وصول ہوئے جزاکم اللہ خیر
حائل مرسل ہے۔ اصلاح الرسوم کا ایک نسخہ اور مرسل ہو فروخت فرمادیں۔ فقط والسلام

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے حال دریافت
ہوا۔ کثرت سے استغفار اور تلاوت کلام اللہ شریف کا ورد فرمادیں۔
اللہ تعالیٰ شانہٗ کی رضامندی ہے۔ اس سے بہتر اور کیا ہے۔ جو شخص
بدعات مروجہ میں سے تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ میں مبتلا
ہو۔ اس کی امامت درست نہیں ہے۔ اس لئے ان امور کا کرنا بھی نادرست
ہے۔ اور جس کا عقیدہ ان کی حقیقت کا سہا وزدہ ان امور کا مرتکب ہو
اس کی بھی امامت نادرست ہے۔

از بندہ محمد یحییٰ بعد سلام مسنون کے گذارش آنکہ تصوف کے رسائل میرے
پاس ابھی نہیں ہیں۔

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے کیفیت دریافت
ہوئی۔ میں دعا گو جملہ مقاصد کے لئے دست بدعا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے
فضل وکرم سے قبول فرمائے۔ اور مجھ سے سوائے دعائے خیر کے کیا

ہو سکتا ہے۔ نوافل میں مطلق نماز کی نیت کافی ہے۔ یہ تعین کہ چاشت کی نوافل پڑھتا ہوں ضروری نہیں ہے۔ اور نہ یہ کہنا ضروری ہے کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے۔ صرف نیت اور ارادہ نماز کا کر لینا اور نیت باندھ لینا کافی ہے۔ البتہ فرائض میں تعین نماز اور وقت دونوں ضروری ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

از کاتب الحروف بعد سلام مسنون۔ گذارش آنکہ عرصہ ہوا۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ اب تو خط بھی کم ہے جاہے آنے لگا ہے۔ والسلام۔

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے تولد فرزند سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ محمد یاسین[1] نام رکھ لینا مناسب ہے۔ بندہ اس کے اور آپ کے دونوں کے لئے دست بدعا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مبارک فرمادے۔ آمین فقط والسلام۔

از بندہ محمد یحییٰ عفی عنہ۔ سلام مسنون ۳ شعبان شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۴ء

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

السلام علیکم۔ سید کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے۔ بالغ کی ختنہ جائز ہے۔ ضرور کرانی چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ بندہ دعاگو ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے والسلام۔ ۲۲ ذیقعدہ۔

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کی عافیت باعث اطمینان ہوئی۔ کثرت لاحول سے انشاء اللہ تعالیٰ کثرت معاش کو نفع ہوگا۔ اور بعض غلطیاں

---

[1] لیکن صاحبزادہ محترم زید مجدہم "محمد احمد" نام سے مشہور رہیں۔

ایسی ہوتی ہیں جن میں نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور بعض میں فاسد نہیں ہوتی۔ اکثر فقہا کا قول یہی ہے کہ جب تک بین تفاوت ہی سے نہ ہو جاوے اس وقت تک نماز فاسد نہیں ہوتی۔ جس شادی میں خلاف شریعت ہو اس میں شریک ہونا درست ہے۔ اگرچہ خلاف احتیاط ہے۔ مگر جس جگہ معصیت ہو اس جگہ جانا اور اس معصیت میں شریک ہونا یہ ہرگز درست نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم

از بندہ محمد یحییٰ السلام علیکم۔ بندہ نے ایک حمائل شریف نہایت خوشنما اور صحیح منگائی ہے۔ ارشاد ہو تو بھیج دوں۔ ایک رنگین ہے عکسی اور ایک سفید ہے عکسی اور لیبر ستر قرآن شریف بھی آئے ہوئے ہیں سادہ جن کے حاشیہ پر قرأت سبعہ چڑھی ہوئی ہے

(مہر پوسٹ آفس ۷ مئی ۱۹۰۳ء)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ مژدہ عافیت آپ کا باعث طمانیت ہوا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔ رجب شعبان کے پورے روزے رمضان کے ساتھ رکھنے کسی روایت سے ثابت ہیں نہ اس امر میں کچھ قباحت ہے کیونکہ روزہ ثواب عبادت ہے۔ البتہ اگر اس کو ضروری یا مسنون جاننے لگیں یہ برا ہے۔ یا لوگوں میں اس کے سنیت یا التزام شائع ہو جاوے تب بھی گناہ ہے۔ زیارت کے لئے کثرت درود شریف مفید ہے۔ خاص کر اس درود شریف کو شب جمعہ میں مرتبہ پڑھ کر پاک بستر پر اسی حالت میں سو رہنا بھی مفید لکھا ہے۔

اگر ایک جمعہ میں زیارت نصیب نہ ہو تو دو بارہ شب جمعہ کو ایسا

ہی کرنا چاہیئے۔ جب نہ ہو سکے پھر ہی کریں۔ والسلام۔ از بندہ محمد یحییٰ سلام مسنون۔ (مورخہ ۱۵ رمضان المبارک روز شنبہ ۱۳۱۵ھ)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے آپ کیلئے دست بدعا ہے۔ نوافل میں کسی سے ایک سورت کو ایک رکعت میں پڑھنے سے کوئی کراہت نہیں آتی۔ جب بعد نکاح معلوم ہوا کہ عورت حاملہ تھی تو اس کی عدت نہیں گذری۔ اب بعد وضع حمل پھر نکاح کیا جاوے۔ اس سے یا دوسرے شخص سے اور پہلا نکاح لغو ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم از بندہ محمد یحییٰ سلام مسنون۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ روز شنبہ۔

از رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون لطائف فرمائند۔ بندہ بخیریت ہے آپ کے خط سے کیفیت دریافت ہوئی۔ میں دعاگو ہوں حصول مقاصد کے لئے کبھی دست بدعا ہوں۔ امور دنیوی کے لئے بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کامیابی بخشے اور نکاح مبارک فرماوے۔ ادعیہ مسنونہ ضرور پڑھ لیں فقط والسلام از کاتب الحروف خادم القوم محمد یحییٰ سلام مسنون۔ گذارش آنکہ گرامی نامہ کیفیت نکاح باعث مسرت ہوا۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرماوے۔ والسلام مورخہ ۷ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ

نوٹ:۔ اس مکتوب میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے عقد کی مبارکبادی ہے۔ انہیں زوجہ محترمہ سے صاحبزادہ حافظ محمد احمد صاحب ۱۳۲۴ھ تولد ہوئے۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

بعد سلام مسنون۔ لطائف فرمائند بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے لئے دعائے خیر

کرتا ہے۔ حصولِ جملہ مقاصد دینی و دنیوی میں فائز فرماوے۔ مسبوق نے اگر پہلا سلام سہواً امام کے ساتھ پھیرا ہے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے اور اگر دوسرا سلام پھیرا ہے خواہ ساتھ یا پیچھے۔ یا پہلا سلام امام سے ذرا پیچھے پھیرا ہے تو اس پر سجدہ ہے۔ اور نماز فاسد نہیں ہوتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ مورخہ ۱۳ر صفر ۱۳۱۰ھ

نوٹ:۔ اس مکتوب میں ارشاد ہے کہ امام کے ساتھ سہواً سلام پھیرنے کی صورت میں سجدہ سہو نہیں ہے۔ صاحب البحر الرائق نے یہی فرمایا ہے لیکن علامہ ابن عابدین نے رد المختار میں اس پر تنقید کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ امام کے ساتھ معیت ...... ممکن نہیں ہے اس لئے مسبوق پر اس صورت میں بھی سجدہ سہو واجب ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ خط آپ کا وارد ہو کر باعث انکشاف احوال ہوا۔ بندہ بحمداللہ بخیریت ہے۔ مژدہ عافیت آپ کا باعث اطمینان ہوا۔ بندہ دعاگو ہے۔ آپ کے جملہ مقاصد کے لئے دست بدعا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قبول فرماوے۔ اعتکاف کی اجازت ہے۔ اس میں اوراد و وظائف جو کچھ بھی پڑھیں باعث خیر و برکت خصوصاً درود، کلمہ طیبہ کی کوئی خاص ترکیب نہیں ہے۔ نہ اس کی حاجت کہ بھنگی اور چمار وغیرہ کے یہاں لئے گئے تیل وغیرہ سب کچھ خرید نا درست ہے جبکہ ظن غالب اس کی نجاست کا نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

از کاتب الحروف محمد یحییٰ عفی عنہ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ آپ کا کارڈ کئی روز ہوئے آیا تھا۔ کچھ ایسے قصے پیش آئے۔ اس لئے جواب میں دو روز کی دیر ہو گئی۔ جز اکم اللہ اعمال۔ انشاء اللہ اس کے کچھ نسخے

بھیجدو ں گا۔ والسلام ۱۸ر شعبان روز شنبہ ۱۹۰۵ء

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون آنکہ مطالعہ فرمایند۔ آپ کا کارڈ پہونچا۔ آپ کی پریشانی کا حال سن کر ملال ہوا حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ آپ کی پریشانی کو دفع فرماوے۔ آپ گھبراویں نہیں اور بعد عشا کے یا باسط گیارہ سو مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ حق تعالیٰ کوئی شکل کر دے گا۔ فقط والسلام۔ جب تک یہاں صورت گذارے کی ہے جانے کا قصد نہ فرماویں۔

۲۸ر جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون گذارش آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ مژدہ عافیت آپ کا باعث اطمینان ہوا۔ جو شخص مسلمان فسق و فجور میں مبتلا ہوا، اس کو بظاہر فسق و فجور و ترک نماز وغیرہ پر بظاہر عذاب ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع رکھنا بھی ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

از بندہ محمد یحیی عفی عنہ۔ بعد سلام مسنون گذارش ہے کہ بندہ آپ کی عنایات کا شکر گذار ہے اور حق تعالیٰ سے جزائے خیر کا خواستگار۔ فقط والسلام ۱۲ر ذیقعدہ ۱۳۱۹ھ

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائید۔ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے کیفیت دریافت ہوئی۔ میں دعا گو ہوں حصول مقاصد کے لئے دست بدعا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قبول فرماوے۔ مجھ سے دعا خیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اشراق، چاشت اور اوابین وغیرہ

میں نیت مطلق نماز کی کافی ہے۔ احمد کو بھی سلام مسنون فرما دیں۔ مخالفین کی طعن و تشنیع کا خیال نہ فرمائیں۔ کہاں کی بدگوئی ذریعہ کفارۂ سیّات اور ترقی درجات ہے۔ فقط والسلام۔

از بندہ محمد یحییٰ عفی عنہ۔ بعد سلام مسنون گذارش آنکہ تکمیل الیقین تیار ہو گئی ہے۔ اس کی اشاعت و ترغیب خریداری فرما دیں۔ فقط والسلام۔ ۳۰ جنوری یکم ذوالعقدہ ۱۳۳۰ھ

باقیات الصالحات

باقیات الصالحات میں پانچ خلیفہ ہیں:۔

۱۔ مولوی کریم بخش صاحب ایم۔اے پروفیسر عربی کالج لاہور
۲۔ قاری احمد حسین صاحب نگینہ
۳۔ مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم بارہ بنکی۔
۴۔ حافظ اللہ دیا صاحب کھٹور مرحوم
۵۔ جناب عبدالعزیز صاحب واعظ (پاکستان)

ایک صاحبزادہ ہیں۔ نام حافظ محمد احمد سلمہ ہے حضرت شاہ صاحبؒ سے بیعت ہیں۔ اور بالکل اسی طرز پر زندگی گزارتے ہیں۔ جو طرز زندگی حضرت شاہ صاحبؒ کا تھا۔ ان کے علاوہ چند کتابیں ہیں جن کے اسماء اوپر درج ہو چکے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ

از ۱۲۹۲ھ تا ۱۳۵۲ھ

علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ رشوال المکرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو شنبہ کے دن وادیٔ لولاب کے ایک قریہ دودھواں میں پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ اپنی تصنیف لطیف "نفحۃ العنبر" میں جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مبسوط و مستند سوانح عمری ہے۔ لکھتے ہیں کہ آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کر کے برصغیر ہند و پاکستان آیا تھا۔ اور تھوڑے تھوڑے عرصہ ملتان اور لاہور میں قیام کر کے آخر کار کشمیر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ کی ولادت سے کافی عرصہ پہلے سے یہ خاندان کشمیر میں رہ رہا تھا۔ اسی خطۂ دلپذیر کو جو برصغیر کے اور بہت سے مشاہیر کا حدی وطن رہا ہے۔ آپ کے بھی مولد و وطن ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار مولانا سید معظم شاہ صاحب دینی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ لائق صاحبزادے نے ۴½ سال کی عمر میں آپ ہی سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اور نہایت قلیل مدت میں نہ صرف قرآن پاک ختم کیا۔ بلکہ فارسی کے بھی کئی رسائل کی تکمیل کر لی۔ صغر سنی ہی میں آپ کے جوہر ذاتی کھلنے لگے تھے۔ اور آپ کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کو دیکھ کر آپ کے پدر بزرگوار اور دیگر اساتذہ دریائے حیرت میں غرق ہو جاتے تھے۔

تقریباً ۱۳-۱۴ سال کی عمر تک آپ کی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ اس دور کے اساتذہ میں مولانا معظم شاہ کے علاوہ دوسرا نام مولانا غلام محمد صاحب صوفی پورہ کا ہے۔

جب وطن میں علم کی پیاس نہ بجھ سکی تو مجبوراً حضرت ضیاء صاحبؒ نے وطن کی مفارقت گوارہ کی۔ اور ضلع ہزارہ تشریف لے گئے۔ تین سال تک وہاں مختلف علماء و فضلاء سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد بھی تکمیل کے لئے آپ کو کسی اور بڑے مرکز کی تلاش ہوئی۔ ایسا مرکز علم آپ کو دارالعلوم دیوبند نظر آیا۔ اور طلب علم میں آپ اسی طرف چل دیئے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوگئے چونکہ اس وقت تک ابتدائی اور متوسط درجوں کی تمام کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لہٰذا یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بلکہ صرف اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔ اور چار سال کی مدت میں یہاں کا نصاب مکمل کر کے ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب (سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند) نے دارالعلوم کی روداد کو سامنے رکھ کر مختلف کتابوں کے درس کی ترتیب حسب ذیل بتائی ہے۔

(۱) سنہ ۱۳۱۰-۱۱ھ میں حسامی اور ہدایہ اولین۔

(۲) سنہ ۱۳۱۱-۱۲ھ میں حدیث میں صحیح بخاری، سنن ترمذی، تفسیر میں جلالین، فقہ میں ہدایہ آخرین، منطق میں قاضی مبارک۔

(۳) سنہ ۱۳۱۲-۱۳ھ میں حدیث میں سنن ابی داؤد اور صحیح مسلم، تفسیر میں بیضاوی، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح، شرح چغمینی اور صدرا۔ درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔

(۴) سنہ ۱۳۱۳-۱۴ھ میں حدیث میں مؤطا امام مالک، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ، فنون میں شمس بازغہ اور نفیسی۔

جن اساتذہ سے درس لیا۔ ان میں سب سے اہم ذات شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کی تھی۔ ان کے علاوہ دیگر اساتذہ میں

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث انبہٹوی ثم سہارنپوری حضرت مولانا عبدالعلی صاحب محدث۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب۔ حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اکابر تھے۔

شروع میں ریلوے اسٹیشن روڈ پر ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ اور بعد میں محلہ پٹھان پورہ اور جامع مسجد دیوبند کے حجروں میں بھی تھوڑا تھوڑا وقت گذارا۔

غرض زمانۂ طالب علمی کو اس طرح پورا کرکے اور ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم کے نصاب کو تکمیل کو پہنچا کر آپ قطب زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گنگوہ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ سے حدیث کی سند لی۔ اور ان کی خدمت میں بہت دنوں رہے۔ واللہ اعلم

فراغ کے بعد کبھی آپ نے اپنے وطن کی جانب مراجعت نہیں کی۔ بلکہ اپنے رفیق اور ارادت مند مولانا مشیت اللہ صاحب کے ہمراہ بجنور تشریف لے گئے اور وہاں وقت گذارنے لگے۔

جس زمانہ میں آپ بجنور میں مقیم تھے۔ آپ کے دیوبند کے ایک اور ساتھی حضرت مولانا امین الدین صاحب نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے انھوں نے حضرت شاہ صاحب کا تعاون نہایت ضروری سمجھا۔ چنانچہ وہ آپ کو لینے کے لئے بجنور گئے۔ لیکن جب انھوں نے اپنا خیال اور ارادہ ظاہر کیا۔ تو حضرت شاہ صاحب کسی قدر تذبذب میں مبتلا ہوگئے۔ اپنی اس کیفیت قلب کا اظہار آپ نے ایک مرتبہ ان الفاظ میں فرمایا تھا۔

"مجھے خیال ہے کہ موجودہ حالات میں مدرسہ کا چلنا نا ممکن ہے لیکن میں اپنے مخلص ساتھی کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا ان کا ساتھ

دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس وقت میرے پاس ۱۷/۱۷ روپے تھے۔ وہ سب میں نے امین الدین کو دیدیئے۔ اور ہم دونوں دہلی پہونچ کر کام میں لائے۔"

اس قلیل رقم میں سے جو حضرت شاہ صاحب نے ایک ادارے کو چلانے کے لئے دی تھی۔ کچھ کاغذ اور چند رجسٹر خریدے گئے اور کام شروع کر دیا گیا۔ ابتداً مدرسہ سنہری مسجد میں قائم ہوا تھا۔ اسی میں ایثار و قربانی کے یہ دونوں مجسمے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر اور فاقہ کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے رہے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے دونوں کی نیت اور محنت کا ثمرہ عطا فرمایا۔ اہل دہلی کو احساس ہوا۔ داخلے بڑھنے لگے مالی امداد ملنے لگی۔ اور یہ مکتب مدرسہ امینیہ کی شکل میں منصۂ شہود پر آ گیا۔ حضرت شاہ صاحب اس مدرسہ میں مدرس اول کی حیثیت سے کافی عرصہ تک کام کرتے رہے۔ آپ کی ان ہی خدمات اور قربانیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے فرمایا تھا۔

"مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب اس مدرسہ کے اعلیٰ اور اول محسن ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا اور ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ پر فرض ہے۔"

کئی سال تک مدرسہ امینیہ میں مدرس اول کے فرائض انجام دینے کے بعد آپ اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے۔ وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں حج بیت اللہ کے لئے گئے۔ اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہیں کے قیام میں مصر، حجاز، شام، عراق وغیرہ کے علماء نے آپ کی بے انتہا قدر و منزلت کی۔ اور آپ کو حدیث کی سندات مرحمت فرمائیں۔

حج سے واپسی کے بعد آپ کھر کشمیر چلے گئے۔ اور قصبہ بارہ مولا میں بعض رؤسا کے اصرار پر مدرسہ فیض عام قائم کیا۔ تقریباً تین سال اسی مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ۱۳۲۸ھ میں جلسہ دستار بندی کے موقعہ پر دیوبند تشریف لائے تو دارالعلوم کے ارباب حل و عقد نے آپ کو مادر درسگاہ کی خدمت کے لئے یہیں روک لیا۔ اور جس مرکز علم سے آپ نے خود فیض حاصل کیا تھا۔ اب وہاں دوسروں کو فیض پہنچانے لگے۔

منتظمین مدرسہ نے بہت چاہا کہ آپ کم از کم اپنی بنیادی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے ہی کچھ مشاہرہ قبول فرمالیں۔ مگر آپ اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئے اور بلا معاوضہ ہی کام کرنے پر تیار ہو گئے۔ البتہ مہتمم دارالعلوم حضرت حافظ احمد صاحب کے بیحد اصرار پر آپ نے دونوں وقت اُن کے ساتھ طعام میں شریک ہونا قبول کر لیا۔ دارالعلوم کے احاطہ میں ایک مختصر سا حجرہ رہائش کے لئے مل گیا۔ اسی میں یہ شیدائے علم ایک طویل عرصہ تک خود بھی علم کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتا رہا۔ اور صدہا تشنگان علم کی بھی پیاس بجھاتا رہا۔

ایثار و قربانی کے وہ پیکر آج کہاں ہیں جن پر خود انسانیت کو فخر و ناز ہے۔ کیا اس وقت یہ بات تصور میں بھی آسکتی ہے کہ ایک ایسی ہستی جس کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو۔ وطن اور عزیزوں سے دور رہ کر بغیر کوئی معاوضہ لئے ۱۸ سال تک اس قدر محنت و جانکاہی سے کام کرتی رہے۔ اور اس امر کی جانب سے بھی قطعاً بے نیازی اختیار کر لے کہ فروعات نہ سہی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی کا سر و سامان کس طرح میسر ہوگا۔ دنیا داروں کو چھوڑیے، انھیں تو آج حلال روزی اور حرام کی کمائی کے درمیان بھی امتیاز

کرنے کی فرصت نہیں۔ سوال ان لوگوں کا ہے جو خود کو دین کے کاموں کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ ایثار و قربانی کا ایسا نمونہ پیش کرسکتے ہیں۔؟

حقیقت یہ ہے کہ ان ہی مقدس ہستیوں کے ایثار اور بے لوثی نے معاشرہ کو عموماً اور طلبار کو خصوصاً دور غلامی میں بھی متوازن حالت میں قائم رکھا۔ اور آج آزادی کی فضا میں ایثار و قربانی کا یہ جذبہ ہی مفقود ہے جس کے سبب معاشرہ عجیب طرح کے انتشار و بحران میں مبتلا ہے۔ اور اس توازن سے ناآشنا ہے جو نوع انسانی کو سکون و طمانیت قلب سے ہمکنار کرتا ہے۔

بہرحال بغیر کسی لالچ کے حضرت شاہ صاحب نہایت مستعدی سے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کرتے رہے۔ کئی سال تک آپ نے سنن ابوداؤد اور مسلم شریف کا درس دیا۔ ۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو حجاز مقدس کا سفر درپیش ہوا تو وہ صحیح بخاری کا درس آپ کے سپرد کرگئے۔ اس ذمہ داری کو بھی آپ نے بحُسن و خوبی پورا کیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد شاہ صاحب صدر مدرس کے عہدے پر فائز کئے گئے اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے اسباق آپ کے ساتھ مخصوص ہوگئے۔ حضرت موصوف نے اس فریضہ کی ادائیگی جس خوبی و خوش اسلوبی سے کی اس کی وجہ سے طلبار کے قلوب میں حضرت شیخ الہند کی یاد کافی حد تک تازہ رہی۔

یہ تمام مدت حضرت شاہ صاحب نے دینی علوم کی اشاعت اور درس و تدریس میں گذاری۔ لیکن آپ کی افتاد طبیعت آپ کو برابر ترک دُنیا پر اکساتی رہی۔ اور آپ کی یہ خواہش رہی کہ ہجرت کرکے حجاز مقدس چلے جائیں۔ اور حیات مستعار کے باقی ایام ارضِ پاک میں گذار دیں۔

اگرچہ یہ ارادہ اتنا نیک تھا کہ کسی کو بھی اس کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت بہت نہیں ہوسکتی تھی۔ تاہم چونکہ برصغیر میں رہ کر بھی آپ ایک اہم خدمت انجام دے رہے تھے۔ اور علوم دین کی ترویج و اشاعت سے سینکڑوں تشنگانِ علم کو سیراب کر رہے تھے۔ نیز آپ کی تمام سعی و جہد کا مقصد منشائے الٰہی کو پورا کرنا اور منصبِ رسالت کو جاری رکھنا تھا۔ اس لئے دارالعلوم کے اربابِ حل وعقد آپ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ آپ کو روکنے کی مؤثر تدبیر یہ سوچی گئی کہ کسی طرح ان پر ازدواجی زندگی کی پابندیاں عاید کردی جائیں۔ اس معاملہ میں نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے بیحد دلچسپی لی۔ اور تلاش کرکے گنگوہ کے ایک شریف سید خاندان میں، جو بھوپال میں مقیم تھا، شادی طے کرادی۔ مہتمم دارالعلوم حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ نے شادی کے جملہ انتظامات خود کئے۔ بارات لے کر بھوپال گئے۔ اور دولہن کو لاکر اپنے مکان مسکونہ کی بالائی منزل میں رکھا۔ قصبہ کے تمام لوگوں نے اس شادی کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ اور .... حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے گھرانے سے شاہ صاحب کے اتنے گہرے تعلقات پر سب ہی کو تعجب ہوا۔

شادی کے تقریباً دو سال بعد تک حضرت شاہ صاحب اس معزز گھرانے میں رہ کر افرادِ خاندان کی طرح رہتے رہے۔ اس وقت تک بھی آپ نے دارالعلوم سے کوئی معاوضہ نہیں لیا لیکن شادی کے دو سال بعد جب پہلی بچی پیدا ہوئی تو آپ اپنی خواہش سے ایک علیحدہ مکان میں منتقل ہوگئے۔ یہ مکان اس قدر مختصر تھا کہ دو افراد کی بھی گذر اس میں مشکل تھی۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری اس کے آگے پتلی سی سہ دری اور اس کے سامنے مختصر سا صحن، تزئین و زینت کا

توسوال ہی کیا ہوسکتا ہے معمولی آرام بھی اس وحشت کدہ میں ممکن نہیں تھا۔
لیکن ان باتوں کی طرف توجہ ان لوگوں کو ہوتی ہے جو دنیوی لذتوں اور آسائشوں ہی کو زندگی کا مقصد و منتہی سمجھتے ہیں۔ جو ہستیاں اپنے سامنے زندگی کا ایک بلند مقصد رکھتی ہیں جنھوں نے توکل و استغنا کو نصب العین حیات بنالیا ہے۔ اور جن کی نگاہوں میں دنیا کی لذتیں اور آسائشیں قطعاً بے حقیقت ہیں۔ وہ ان امور کی جانب دھیان بھی نہیں دیتیں اور ان چیزوں سے محرومی کو اپنے لئے موجب خسران نہیں سمجھتے۔

علیحدہ ہونے کے بعد محض اہل و عیال کی وجہ سے منتظمین دارالعلوم کے بیحد اصرار پر حضرت اقدس نے ایک قلیل مشاہرہ لینا منظور کرلیا۔ جو آخر وقت تک ساٹھ روپے ماہوار سے زیادہ نہ بڑھا۔

سنہ ۱۳۴۶ھ تک نہایت خاموشی اور مستعدی سے دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ سنہ مذکور میں اہتمام سے کچھ اختلاف پیدا ہوا جس کی وجہ سے آپ نے بطور احتجاج استعفیٰ دیدیا۔ استعفیٰ منظور ہوگیا۔ اور آپ اساتذہ اور طلبا کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سابق احاطہ بمبئی) تشریف لے گئے۔ وہاں دم آخر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ کے رفقا اور جاں نثاروں میں اہم ترین شخصیتیں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمن، مولانا سراج احمد رشیدی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا بدر عالم میرٹھی کی تھیں۔

سنہ ۱۳۵۱ھ تک آپ نے ڈابھیل میں درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ عرصہ سے آپ کی طبیعت علیل رہنے لگی تھی۔ سنہ مذکور میں جب علالت نے شدت اختیار کی تو آپ دیوبند تشریف لے آئے۔ اور کئی مہینے صاحب

فراش رہ کر ۲ر صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۹ رمئی ۱۹۳۳ء کو شب کے آخری حصہ میں رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

یہ دین و دانش کا یہ پیکر عظیم عیدگاہ سے متصل محو استراحت ہے۔ قبر کچی ہے۔ نہ پختہ چبوترہ ہے نہ قبہ، ہمہ وقت انوار و تجلیات الٰہی کی بارش ہوتی رہتی ہے اور ارادت مند برابر فاتحہ کے پھول چڑھاتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مالا مال تھے۔ خطۂ کشمیر سے تعلق کے سبب آپ شکل و شمائل میں نہایت ممتاز تھے۔ سرخ و سفید رنگت، حسین و نازک نقشہ اس پر نور باطن کی جلوہ فرمائی غرض ان باتوں نے مل کر آپ کے وجود کو ایک پیکر نورانی بنا دیا تھا۔ طبیعت میں بیحد نفاست تھی۔ لباس صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اس پر جامہ زیبی غضب کی تھی۔ آپ کی ذات میں ایک ایسی کشش تھی جو ہر شخص کو آپ کی طرف کھینچتی تھی۔

ظاہری حسن کے ساتھ آپ کا اخلاق بھی نہایت عمدہ اور کریمانہ تھا۔ ہر شخص سے اس طرح ملتے کہ وہ لامحالہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

کتب بینی کا مشغلہ تمام زندگی جاری رہا۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس سے تعلق منقطع نہیں ہوا۔ ذہن رسا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حافظہ نہایت غضب کا دیا تھا۔ آپ کا یہ وصف ایسا ہے جس کی سب ہی نے تعریف کی ہے۔ مشہور ہے کہ جو بات ایک مرتبہ ضمناً بھی آپ کی نظر کے سامنے آجاتی تھی وہ پھر زندگی بھر حافظہ کی گرفت سے نکل کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں نہایت محیر العقول واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند ... جو حضرت شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ اپنا ایک واقعہ

بیان کرتے ہیں جس سے آپ کے اس وصف خاص پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔
حضرت مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ میں اپنی کسی تالیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت حضرت شاہ صاحب مرض الوفات میں مبتلا تھے۔ میں آپ کی عیادت کے لئے گیا۔ دوران گفتگو میں نے اپنی ابوالحسن کا بھی ذکر کر دیا۔ پہلے تو آپ نے چند کتابوں کے نام بتادیئے۔ لیکن جب میں نے عرض کیا کہ میں اپنی مصروفیت کے باعث اتنی کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ لہٰذا آپ ہی چند باتیں بتادیں تو حضرت شاہ صاحب نے جزئیات وتفصیلات اس طرح بیان کرنی شروع کر دیں۔ گویا کسی کتاب میں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اور جب میں نے دریافت کیا کہ حضرت کیا آپ نے اس شخص کے بارے میں یہ حالات حال ہی میں پڑھے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا۔ کہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے جب میں مصر میں تھا اس وقت ایک کتاب اس موضوع پر نظر سے گذری تھی۔ اسی میں سے یہ چند باتیں یاد رہ گئیں ۔" یہ محض ایک واقعہ ہے ورنہ اس طرح کے صدہا واقعات ہیں جو آپ کے متعلق مشہور ہیں۔ ہر وہ شخص جس سے آپ کو درس وتدریس کے سلسلہ میں ملنے کا اتفاق ہوا وہ یہی بیان کرتا ہے۔ کہ آپ کو مختلف کتابوں کی عبارتیں حفظ تھیں۔ اور بقید صفحہ اور سطر کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ مختلف علوم آپ کو اس درجہ مستحضر تھے کہ اس زمانہ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اکثر مشاہیر داکابر نے اس عطیۂ الٰہی کو دیکھ کر ہی آپ کو چلتے پھرتے کتب خانہ سے تشبیہہ دی ہے۔

سلوک اور تصوّف

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات اس قدر ہیں کہ جن کے سامنے ان کے دوسرے کمالات دب گئے ہیں۔ اس لئے اگر حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالات میں سے اس عنوان کو

حذف کر دیا جائے تو اُن کے شیخ کامل ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آئے گا۔ لیکن چونکہ ہماری اس تالیف کا موضوع یہی ہے اس لئے اس عنوان پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ زہد و تقویٰ کے اعتبار سے ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ گویا آسمان سے کوئی فرشتہ زمین پر آگیا ہے۔ آپ کی قلبی نسبت اور روحانیت کا اعتراف اس وقت کے بڑے بڑے مشائخ کرتے تھے۔ نفحۃ العنبر کے مؤلف نے بیان فرمایا ہے کہ تقریباً چھ مہینے تک حضرت شاہ صاحب نے کشمیر کے جنگلوں میں چلّہ کشی کی ہے۔ اور ان اوقات کو سلسلہ چشتیہ کے اوراد و وظائف کے مطابق گذارا ہے۔

نفحۃ العنبر کے مؤلف نے بیان کیا ہے کہ کشمیر میں ایک جم غفیر حضرت شاہ صاحبؒ کے دست حق پرست پر بیعت تھا۔ اور آپ طالبین کو چشتیہ اور نقشبندیہ دونوں طریقوں کے اوراد و وظائف تعلیم فرماتے تھے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کن سے بیعت تھے اور کن سے آپ کو اجازت بیعت حاصل تھی؟ انوار الباری کے مصنف کا فرمانا تو یہ ہے کہ آپ اپنے والد محترم سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ اور ان ہی سے آپ کو اجازت بیعت بھی حاصل تھی

لیکن مولانا النوری صاحب نے اپنے ایک طویل مضمون "کمالات انور" میں (جو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں چند قسطوں میں شائع ہوا ہے) تحریر فرمایا ہے۔ کہ "حضرت شاہ صاحب کو حضرت گنگوہیؒ کی طرف سے اجازت بیعت حاصل تھی۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں آپ کا نام ذکر نہیں کیا"

مولانا النوری صاحب کی یہ روایت ہمیں غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو کیا ہوا جو انھوں نے اتنے

زبردستت السان کا نام حذف کردیا۔؟ اس وقت تک تو دیوبند میں گروہی تعصب بھی نہیں تھا نیز جس وقت تذکرۃ الرشید شائع ہوئی ہے۔ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ جیسے اکابر موجود تھے۔ انھوں نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا ازہر شاہ قیصر نے اپنے مضمون میں اس قدر تحریر فرمایا ہے۔

"دیوبند سے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا الحاج رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کئے۔"

اس عبارت میں کہیں بھی اجازت بیعت کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا انوری صاحب کی روایت سے زیادہ قوی روایت مولانا یوسف صاحب بنوری کی ہے جو انھوں نے نفحۃ العنبر میں ص۱۸۱ پر بیان کی ہے۔ میں نے حضرت شاہ سے سنا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے شیخ العالم مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحبؒ سے اجازت ہے اور مجھے یہ بھی روایت پہونچی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ چھ مہینہ تک کشمیر میں خلوت میں رہ کر تزکیہ اور تصفیہ میں مشغول رہے۔ یہ روایت بھی مجروح ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک مولانا انوری کی روایت موضوع ہے۔ مگر ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالات کے لئے سلوک و تصوف کا عنوان ضروری نہیں ہے۔

وفات اور الباقیات

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات دیوبند میں ۱۳۵۲ھ میں ہوئی۔ اور وہیں آپ مدفون ہوئے۔ اولاد میں سے دو فرزند مولانا ازہر شاہ قیصر اور مولانا انظر شاہ کشمیری

اور ایک صاحبزادی اہلیہ محترمہ مولانا احمد رضا شاہ بجنوری چھوڑی۔ اور ایک صاحبزادی کا انتقال آپ کے سامنے ہی ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ ہزاروں قابلِ فخر شاگرد چھوڑے۔

کتابوں میں :- (۱) عقیدۃ الاسلام (۲) تحیۃ السلام (۳) التصریح (۴) اکفار الملحدین (۵) خاتم النبیین (۶) فصل الخطاب (۷) خاتمۃ الکتاب (۸) نیل الفرقدین (۹) بسط الیدین (۱۰) کشف الستر (۱۱) ضرب الخاتم (۱۲) مرقاۃ الطارم (۱۳) ازالۃ الرین (۱۴) سہم الغیب۔ یہ کتابیں آپ نے اپنے قلم سے تحریر فرمائیں۔

ان کے علاوہ دوسری کتابیں آپ کی یادداشتوں سے مرتب ہوئیں۔ مثلاً (۱) مشکلات القرآن (۲) خزینۃ الاسرار (۳) فیض الباری (۴) العرف الشذی (۵) انوار المحمود (۶) صحیح مسلم کی املائی شرح (۷) حاشیہ سنن ابن ماجہ۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

از ۱۲۷۹ھ تا ۱۳۴۷ھ

آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے فرزند اکبر تھے سن ولادت ۱۲۷۹ھ ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا نکاح دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین صاحب عثمانی کی بڑی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ حضرت نانوتویؒ کے ابتداءً دختری اولاد ہوئی حضرت نانوتویؒ کے والدماجد شیخ اسد علی صاحب مرحوم کی دلی تمنا تھی۔ کہ کوئی لڑکا بھی پیدا ہو۔ چنانچہ چھ لڑکیوں کے بعد آپ تولد ہوئے۔ تو دادا مرحوم نے خوشی میں گندم کی کوٹھی کا منہ کھلوا دیا۔ اور دل کھول کر خیرات کی۔

تعلیم وتربیت

حضرت حافظ صاحب کی عمر جب مکتب نشینی کے قابل ہوئی تو قصبہ رام پور (سہارنپور) میں ایک جید حافظ نور محمد صاحب کے پاس آپ کو پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ نویں سال میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔

حضرت نانوتوی کے ماموں زاد بھائی منشی محمد یٰسین صاحب کی صاحبزادی سے نو سال کی عمر میں حافظ صاحب کا نکاح ہو گیا رخصتی نہیں ہوئی کیونکہ صاحبزادہ کی عمر نو سال کی اور دلہن کی عمر سات سال کی تھی۔ نکاح کے بعد ہی تحصیل علم کے لئے بیرونی مدارس کیطرف روانہ فرما دیا۔ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں خود حضرت نانوتویؒ ہی نے مدرسہ قائم فرمایا تھا۔ اور وہاں حضرت کے متوسلین اور خدام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ حضرت کے بڑے داماد مولانا محمد عبداللہ صاحب انبہیٹوی (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات ہوئے)

اسی مدرسہ میں مدرس تھے ۔ ابتدائی تعلیم کے لئے حضرت نے اپنے صاحبزادہ کو اسی مدرسہ میں روانہ فرمادیا ۔ اس کے بعد اونچی تعلیم کے لئے پھر حضرت حافظ صاحب کو مرادآباد کے مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی میں بھیجا یہ مدرسہ بھی حضرت ہی نے قائم فرمایا تھا ۔ اس زمانہ میں اس مدرسہ کے صدر مدرس حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید و خلیفہ خاص حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہیں حضرت نانوتویؒ کے بعد گویا ان کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا ۔ حافظ صاحب نے فنون کی متعدد کتابیں حضرت امروہوی سے اسی مدرسہ شاہی میں رہ کر پڑھیں ۔

اسی دوران میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کو اپنے صاحبزادہ کو خود ہی تعلیم دینے کا خیال پیدا ہوا اور آپ نے مرادآباد سے حافظ صاحب کو دیوبند بلالیا ۔ جب حضرت حافظ صاحب مرادآباد سے رخصت ہو رہے تھے ۔ تو (حسب روایت حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) وہ منظر عجیب و غریب تھا ۔ کہ مرادآباد کے مدرسین اور بالخصوص حضرت امروہوی اسٹیشن تک پہونچانے کے لئے تشریف لائے ۔ اور زار زار روتے ہوئے صاحبزادہ سے فرمایا ۔ کہ ہم لوگ آپ کا کوئی حق ادا نہیں کر سکے ہیں ۔ اگر حضرت ہم خدام کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھیں تو آپ خدا کے لئے کلمۂ خیر فرمادیں ۔ جس پر حضرت حافظ صاحب نے باچشم نم فرمایا ۔ کہ آپ کیا فرما رہے ہیں ۔ مجھے گھر سے زیادہ آپ حضرات نے راحت پہونچائی ۔ اولاد کی طرح میری ہر طرح کی ناز برداری کی ۔ اگر میں حضرتؒ سے آپ حضرات کی نسبت کلمۂ خیر کہوں گا ۔ تو وہ خلاف واقع محض آپ کی دلداری کے لئے نہ ہوگا بلکہ حقیقت واقعہ ظاہر کرنے کے لئے ہوگا ۔ چنانچہ یہی ہوا کہ حضرت اقدس نے صاحبزادہ کو تنہائی میں لے جاکر دریافت کیا کہ مرادآباد میں

میرے لوگوں نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ عرض کیا کہ انتہائی راحت اور انتہائی ناز برداری کے ساتھ مجھے رکھا۔ فرمایا الحمد للہ مجھے ان حضرات سے یہی توقع تھی۔
لیکن حضرت کی وفات کا زمانہ قریب آچکا تھا سفر حج کی تیاریاں تھیں۔ اور اسی سفر میں مرض وفات شروع ہوا۔ اس لئے جس خصوصی تعلیم کے لئے صاحبزادہ کو بلایا تھا وہ نہ ہو سکی۔ اور حضرت حافظ صاحب نے مدرسہ دیوبند میں اپنی بقیہ تعلیم پوری کی متعدد کتابیں اور بالخصوص معقولات و عربیت کی اونچی کتابیں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ اور سب سے آخر میں دورۂ حدیث گنگوہ پہونچ کر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حلقہ درس میں پورا کیا۔ اور وہیں سے سند حدیث حاصل کی۔
۱۲۹۸ھ میں حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی وفات ہوگئی۔ تو حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون کے عربی مدرسہ میں جو حضرت نانوتوی ہی کا قائم فرمودہ تھا تشریف لے گئے اور عرصہ تک وہاں پڑھاتے رہے وہاں سے پھر دیوبند بلائے گئے اور ۱۳۰۳ھ میں دار العلوم دیوبند میں مدرس ششم مقرر کئے گئے۔ عموماً فنون کا درس دیتے تھے لیکن خصوصیت سے مشکوٰۃ شریف، مختصر معانی، جلالین شریف میرزاہد رسالہ وغیرہ کتابوں کا درس زیادہ مشہور تھا جس کی طرف طلبہ جوق در جوق نہایت شوق سے رجوع کرتے تھے۔

عہدۂ اہتمام پر تقرر

مدرسہ دیوبند کا اہتمام حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کے دست حق پرست میں تھا۔ اور حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی حیات میں وہی مہتمم رہے۔ حضرت کے وصال کے بعد بھی عرصہ دراز تک اہتمام کے فرائض

انجام دیتے رہے۔ ان کے تقدس اور اخلاق بزرگانہ کی وجہ سے تمام کارکنان دارالعلوم ان کی ذات پر متفق تھے۔ اور نظم اجماعی اور اجتماعی طور پر چل رہا تھا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ممدوح نے جب مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرمائی تو بعد کے دو اہتماموں کے بعد جو بہت قلیل مدت رہے۔ بالآخر ۱۳۱۳ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ (اس دور میں دارالعلوم کے سرپرست اور پوری جماعت دیوبند کے سیدالطائفہ تھے) دیوبند تشریف لائے دارالعلوم میں قیام فرمایا۔ باہر سے بعض ذی وجاہت افراد جیسے نواب محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری وغیرہ کو بھی دعوت دی اور اہتمام کی باگ ڈور حضرت حافظ صاحب کے سپرد فرمائی۔ جس سے بعض اختلافات جو قصبہ اور مدرسہ کے درمیان پیدا ہو گئے تھے بے اثر ہو گئے۔ اور چند سال کے بعد کلیتاً منعدم ہو گئے۔ اور دارالعلوم کی جانب میں یک جہتی اور قوت پیدا ہو گئی۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ کہ نزاعات کے ختم ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت میرے قلب میں نہیں آئی۔ کہ اہتمام حافظ احمد کے سپرد کر دیا جائے۔ اور میں نے اس معاملہ کو گیارہ مرتبہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا ہر دفعہ مجھے یہی جواب ملا کہ مدرسہ دیوبند کی ترقی حافظ احمد ہی کے ہاتھ پر مقدر ہے۔ اس پر مخالفت کا زور گھٹ گیا۔ اور یہ حضرات بھی آخر کار مایوس یا مطمئن ہو کر مخالفت سے یکسو ہو گئے۔

بالآخر حضرت گنگوہی کے اس الہامی مقولہ کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ حضرت حافظ صاحب نے اپنے طبعی جوہروں کے ساتھ دارالعلوم کا اہتمام پوری قوت وجاہت اور جرأت و استقلال کے ساتھ چلایا جس کے نمایاں ثمرات تاریخ دارالعلوم میں محفوظ ہیں۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دارالعلوم کا ترقیاتی دور حضرت ممدوح ہی کا چالیس سالہ دورِ اہتمام ہے۔ اس دور میں جماعت

دیوبند کے تمام اکابر علماء حتیٰ کہ حافظ صاحب کے اساتذہ بھی ان کی نسبت کی وجہ سے ان کے سامنے جھکتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ حضرت ممدوح کے استاد بھی تھے۔ اور حافظ صاحب کا قلب بھی ان کی استادی کی عظمت سے بھرپور تھا لیکن جب کبھی حضرت حافظ صاحب اپنی صاحبزادگی اور مخدوم زادگی کے رنگ میں ہوتے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آجاتے تو ادھر سے ناز اور ادھر سے نیاز قابل دید ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو غایت نیازمندی سے حافظ صاحب کے سامنے ہاتھ تک جوڑ لیتے اور ان کے پیر تک پکڑ لیتے تھے۔ مولوی عزیز احمد صاحب نگینوی مرحوم نے بیان کیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانہ کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں گے تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا حضرت شیخ حضرت حافظ صاحب کے سامنے استاد ہوتے ہوئے بھی ان کی صاحبزادگی کے سبب اس طرح مؤدب اور نیازمندانہ بیٹھتے تھے کہ آج مشائخ کے سامنے ان کے مرید و متوسل بھی وہ شان نیاز اختیار نہیں کرسکتے۔

عظمت و وقار

غرض حضرت شیخ الہندؒ اس شفقت کے ساتھ جو نیازمندی کے رنگ میں ہوتی تھی، حضرت حافظ صاحب کی پشت و پناہی فرماتے اور وجاہت و برکت ان کی کام کرتی تھی۔ اس کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں کہ احاطہ دارالعلوم میں حضرت حافظ صاحب کا خداداد رعب و داب ضرب المثل تھا۔ احاطہ دارالعلوم میں قدم رکھتے تو اساتذہ و تلامذہ میں ایک قسم کا سناٹا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ اور طلبہ کا تو یہ عالم ہوتا تھا کہ جو جہاں ہوتا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ دور سے انھیں آتا ہوا دیکھ کر

طلبا باہر ہوتے تو حجروں میں گھس جاتے تھے۔ حضرت حافظ صاحب چلتے تو عموماً نیچی نگاہ کر کے چلتے تھے چال میں وقار اور متانت ہوتی تھی ان کے سامنے پہونچ کر ایک ہیبت محسوس ہوتی تھی۔ صاف گوئی اور ظاہر و باطن کی یکسانی معروف و ممتاز تھی۔ ہر ایک سے بات نہایت صاف، بے لاگ اور بے جھجک فرماتے تھے۔ سریع الغضب تھے غصہ آتا تو ایک دم آتا اور ایک دم بات کھری کھری فرماتے تھے۔ اور دوسرے کے صفائی پیش کر دینے پر اسی مجلس میں ایک دم فرد ہو جاتا اور اس مغضوب پر بے حد مہربان ہو جاتے۔ اور غیر معمولی شفقت فرماتے۔

غرض طلبا اور مدرسین سب پر ان کی وجاہت کے اثرات تھے جس کو چار چاند حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نیازمندانہ رنگ کی باطنی توجہات و تصرفات اور معنوی قوت و ہمت نے اور ادھر حضرت گنگوہی قدس سرہ کی سرپرستی اور روحانی اعانت نے لگائے۔ تا آنکہ اسی دور میں "مدرسہ" سے "دارالعلوم" بنا اور اس نے مالی اور علمی حیثیت سے نمایاں ترقیات کیں۔ عمارات کی وسعت، شعبہ جات کا پھیلاؤ، شاندار اجتماعات، ملک میں دارالعلوم کی عمومی روشناسی قوم اور حکومت دونوں کا اس سے تاثر وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں جس سے دارالعلوم ہر جہتی ترقی کرتا ہی چلا گیا۔

کام کے بڑھ جانے پر حضرت حافظ صاحب کی نگاہ انتخاب اپنی نیابت کے لئے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، مولانا حبیب الرحمٰن مانے ہوئے مدبر زیرک عالم ربانی، ادیب اور بافراست بزرگ تھے۔ ان کے تدبر نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب تدبیر و سیاست ان کی تھی۔ وجاہت و جرأت اور قوت حضرت حافظ صاحب کی تھی۔ اور ہمت باطنی اور پشت پناہی حضرت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ ان تین سروں کے جڑنے سے دارالعلوم نے وہ ترقی کی کہ وہ زمین سے اُٹھ کر آسمان تک پہنچ گیا۔

حضرت حافظ صاحب ہی کے دورِ اہتمام میں دارالحدیث جیسی عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور حضرت ممدوح کی طرف سے جونہی اس عمارت کی تجویز کا اعلان شائع کیا گیا۔ ویسے ہی بارش کی طرح چندہ گویا آسمان سے برسنا شروع ہو گیا۔ پھر طلبا کی کثرت ہوئی۔ تو تنگی مکان کی وجہ سے ایک عظیم الشان دارالاقامہ (دارِ جدید) کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور اس کے وسط میں مقدس دارالحدیث کی سر بفلک عمارت کے لئے بنیادیں کھدوائی گئیں۔ جس کے بھرنے میں تمام اساتذہ طلبا اور اکابر دارالعلوم نے مزدوروں کی طرح کام کیا لیکن ان دونوں عمارتوں کی تکمیل حضرت ممدوح کے دور میں نہ ہو سکی جو بعد کے دورِ اہتمام میں مقدر تھی۔

یادگار جلسہ دستار بندی

دارالعلوم کا یادگار عظیم الشان جلسۂ دستار بندی جس میں تقریباً ایک لاکھ آدمیوں نے شرکت کی ، اور اس کی عظمت و شان کے عجیب و غریب واقعات ہیں۔ جو ایک مستقل روداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب ہی کے دورِ اہتمام میں ہوا۔ جس میں تقریباً ایک ہزار فضلاء دارالعلوم کی دستار بندی ہوئی۔ اسی جلسہ میں حضرت حافظ صاحب نے ترقیات دارالعلوم پر مشتمل ایک جامع مانع تحریر پڑھی تھی جس کا عنوان "زرین ماضی و مستقبل" تھا۔ یہ زرین ماضی ان کے ابتدائی دورِ اہتمام اور اس سے پہلے کے دور کی تھی۔ اور زرین مستقبل خود ان کے دورِ اہتمام کا انتہائی حصہ تھا۔ جس کا ظہور اس تحریر کے بعد ہوا اور ان ہی مرقومہ پیش بندیوں کے مطابق ہوا جو اس تحریر میں پیش کی گئی تھیں۔

دارالعلوم کی ترقی کیلئے جدوجہد حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ترقیات دارالعلوم کے سلسلہ میں بڑے بڑے سفر کئے اور دارالعلوم کے لئے دوامی چندے مقرر کرائے۔ قابل تذکرہ اور یادگار سفر بہاولپور، بھوپال، اور حیدرآباد دکن کے تھے بعہد عثمان کے دور صدارت میں بعہد اہتمام حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کی امداد حیدرآباد دکن سے ابتداً صرف سو روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ حضرت مرحوم نے ایک سفر کیا تو سو کے ڈھائی سو ہوئے۔ دوسرا سفر چند سال کے بعد کیا تو ڈھائی سو کے پانچ سو ہوئے اور چند سال کے بعد پھر سفر کیا تو پانچ سو کے ہزار روپے ماہوار ہو گئے۔ جو انقلاب ۱۹۴۷ء تک برابر جاری رہے۔ اور جمہوریہ ہند کے جدید دستور کے تحت ایسی مذہبی امدادوں کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

آج کے دور میں سو، ڈھائی سو، پانچ سو اور ہزار کی مقدار ممکن ہے کہ حقیر دکھلائی دے۔ جب کہ روپیہ ڈھائی آنہ کا رہ گیا لیکن اس زمانہ کے سو اور ہزار ہیں۔ جب کہ روپیہ آج کی نسبت آٹھ گنا تھا۔ اور ہزار کے معنی آج کے الفاظ میں آٹھ ہزار کے تھے۔ اندازہ کیا جائے کہ اس وقت اس کی کیا قدر و قیمت تھی؟ اور اس کے لانے والے کس عظمت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہوں گے۔؟

" یہ اس سے واضح ہے کہ جب بھی حضرت حافظ صاحب سفر دکن سے کامیابی کے ساتھ با مراد واپس آتے تو احاطۂ دارالعلوم میں خیر مقدم اور مبارکباد کے عظیم الشان جلسے منعقد ہوتے نظم اور نثر میں کارکنان دارالعلوم تشکر و امتنان کا ہدیہ پیش کرتے اور انتہائی قدر دانی کے ساتھ امداد کے ان اضافوں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ دکن کی امداد کے ایک ہزار روپے ماہوار تک آجانے پر جب حضرت

حافظ صاحب دکن سے دیوبند واپس ہوئے تو درسگاہ نو درہ میں ایک عظیم الشان جلسہ خیر مقدم منعقد کیا گیا۔ اور اس میں حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے عربی میں اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو میں تہنیت و تبریک کے بلیغ قصیدے پڑھے۔

آپ کے زمانہ اہتمام میں، دو مرتبہ صوبہ یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر دارالعلوم میں آئے۔ پہلی دفعہ سرلاؤ گن لاٹوس اور دوسری مرتبہ سر جیمس میسٹن اور ہر دو دفعہ میں ان ذمہ داران حکومت کو حضرت حافظ صاحب نے پورے حوصلے کے ساتھ بلا کر دارالعلوم کے اہم مرحلے طے کئے۔ پہلی دفعہ گورنر کے آنے سے وہ نزاعات ختم ہو گئے۔ جو مخالفین دارالعلوم نے دارالعلوم کے خلاف کھڑے کر دیئے تھے۔ اور جس سے دارالعلوم کی عافیت تنگ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ مقدمہ بازیوں کی نوبت آ گئی تھی۔ اور دارالعلوم کے ذمہ داروں کو عدالتوں میں کھینچے کھینچے پھرنے کے سامان کر دیئے گئے تھے۔ اور دوسری دفعہ میں دارالحدیث کی مجوزہ اور فی الوقت موجودہ عمارت کے نیچے جو گندہ نالہ سرکاری بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے نہ یہ عظیم عمارت ہی بن سکتی تھی۔ اور نہ دارالعلوم کی آب و ہوا ہی درست رہ سکتی تھی اٹھوا دیا۔ اور دارالعلوم کو اپنی تعمیری اور عمارتی ترقیات کے لئے وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ اب اسی زمین اور اسی کے ملحقہ قطعات میں دارالعلوم کی جدید عمارات بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ واقعات اور ان جیسے بہت سے واقعات جو روداد ہائے دارالعلوم میں محفوظ ہیں۔ اس کے شاہد عدل ہیں۔ کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خداداد وجاہت کا اثر حکام پر بھی پڑتا تھا۔ اور وہ اس سے دارالعلوم کے مشکل سے مشکل مہمات کو بآسانی حل کر لیتے تھے۔ غرض شیخ الہندؒ آپ کے پشت پناہ تھے۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آپ

کے دانشمند مشیر اور وزیر با تدبیر تھے۔ اور اس طرح ظاہری و باطنی تقویت کے ساتھ حضرت حافظ صاحب کی ذاتی وجاہت اور ہمت و جرأت بڑے بڑے مشکل مرحلے انجام کو پہونچا رہی تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں تدبیریں تو ہزاروں کروں۔ مگر حافظ جی کی سی وجاہت کہاں سے لاؤں؟ اس لئے جس موقعہ پر ان کا ترکش تدبیر کے تیر دل سے خالی ہو جاتا تھا۔ اور ضرورت پڑتی تھی کہ اب وجاہت و رعب اور حکم سے کام لیا جائے تو وہاں حضرت حافظ صاحب کو آگے کر دیتے تھے۔ اور ان کی ہیبت وہ مشکل مرحلہ منٹوں میں حل کر دیتی تھی۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کا بیان ہے۔ کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت رمضان شریف میں تراویح مدرسہ میں ادا کرنے کی تھی۔ مالٹہ کی روانگی سے چند سال قبل حضرت نے بعض اعزہ کی فرمائش و اصرار پر دولت خانہ ہی پر تراویح پڑھنے کا ارادہ فرمالیا۔ اور مدرسہ میں کہلا بھیجا۔ اس سطحی اور ظاہری جدائی سے لوگوں میں اہل مدرسہ کی طرف سے غلط رائے قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حضرت حافظ صاحب سے فرمایا کہ اس گتھی کو آپ ہی حل کریں گے۔ اور اس کی تدبیر یہی ہے کہ آپ حضرت سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ حضرت آپ تراویح امسال کہاں پڑھیں گے؟ چنانچہ حافظ صاحب تشریف لے گئے اور حضرت سے پوچھا حضرت نے اپنی عادت کے مطابق لجاجت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بھائی حافظ جی میں اب کمزور ہو گیا ہوں۔ رات کو مدرسہ جانا آنا کچھ دشوار سا ہو گا۔ اس پر حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ تراویح کہاں پڑھیں گے۔ آپ جہاں بھی پڑھیں ہمیں بھی وہیں پڑھنا ہے۔ آپ کو

چھوڑتا نہیں، اس پر پھر ساجت کے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں تم تراویح مدرسہ ہی میں پڑھو مجھے یہیں مکان پر رہنے دو۔ اس پر حافظ صاحب نے ذرا غصہ اور مایوسی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بہت اچھا اور یہ کہہ کر اٹھ کر چلے آئے۔ حافظ صاحب تیس چالیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ حضرت اٹھے کمرہ میں سے اپنی لاٹھی اٹھائی اور حافظ صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ حافظ صاحب گھر میں جا چکے تھے، جا کر آواز دی تو حضرت حافظ صاحب کی والدہ ماجدہ خود دروازہ پر تشریف لائیں جن کا حضرت شیخ انتہائی احترام فرماتے تھے۔ حضرت حافظ صاحب کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ "محمود حسن حضرت قاسم کے کیا کئی بیٹے ہیں کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑنا ہے۔ تمھیں شرم کرنی چاہیئے۔ اس پر حضرت شیخ نے بہت عاجزی سے فرمایا۔ کہ قصور معاف فرما دیجئے بس تراویح ساتھ ہی پڑھوں گا۔

ایک مرتبہ کتب خانہ دار العلوم میں تقسیم اسباق کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صحیح مسلم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کو دینا چاہتے تھے وہ مانتے نہ تھے اور اس طرح یہ سبق کسی ایسے مدرس کے پاس چلا جا رہا تھا جس کے پاس نہ جانا چاہیئے تھا۔ جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تفہیم کوئی اثر نہ دکھلائی تو انھوں نے چپکے سے حضرت حافظ صاحب کے پاس آدمی بھیج دیا کہ وہ بھی کتب خانہ میں تشریف لے آویں۔ اور واقعہ کی صورت حال ان سے کہلا دی۔ حضرت ممدوح اچانک حلقۂ مدرسین میں تشریف لے آئے۔ صحیح مسلم کا ذکر آیا تو فرمایا مولوی شبیر یہ کتاب اپنے نام لکھو۔ انھوں نے کچھ عذر بیان کرنا چاہا۔ فرمایا پہلے سبق لکھو پھر بولو۔ انھوں نے آخر کار لکھا۔ اور یہ سبق شروع کرایا۔

محاسن و اوصاف | حضرت حافظ صاحب کی بعض اور بھی اخلاقی

خصوصیات ممتاز اور معروف تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کے ظاہر و باطن کی یکسانی تھی۔ وہ اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے اس پر قدرت ہی نہیں رکھتے تھے کہ دل میں کچھ رکھیں اور ظاہر کچھ کریں یا مکنونات قلب میں سے بطور تدبیر ہی کچھ کھولیں اور کچھ چھپالیں۔ ان کی ہر قلبی کیفیت رنج ہو یا خوشی فوراً چہرہ پر نمایاں ہو جاتی تھی جس کو وہ فطرتاً چھپا ہی نہیں سکتے تھے کسی سے خوش ہوتے تو ظاہر و باطن خوش، رنجیدہ ہوتے تو ظاہر و باطن رنجیدہ نفاق سے کوسوں دور تھے خلقۃً طبیعت بے لوث تھی۔ اخلاص اور اعتماد علی اللہ کا مادہ نمایاں رہتا تھا۔

ان کے طریق اہتمام میں بھی رسمی تدبیر یا جوڑ توڑ یا مصلحت اندیشیوں اور دفع الوقتیوں کا نشان نہ تھا معاملہ دوٹوک صاف صاف اور کھلا ہوا ہوتا تھا۔ جس سے دوست و دشمن یکساں مطمئن رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ جرأت و حوصلہ ہمہ وقتی تھا۔ نزاعات کے زمانہ میں جبکہ قصبہ دیوبند کے بعض بزرگوں کا دارالعلوم سے اختلاف شدت سے جاری تھا۔ مجلس شوریٰ کا جلسہ منعقد ہوا کسی نے آکر کہا کہ چھتہ کی مسجد کے اس حجرہ پر بھی مخالف حضرات نے قبضہ کر لیا ہے۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جائے رہائش اور مدرسہ کے تصرف میں تھا۔ اور اس پر تالا ڈال دیا گیا ہے۔ ارباب مجلس میں تشویش کے ساتھ بحالی قبضہ کی تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔ مخالفین کی قوت کے پیش نظر اس سے مایوسی تھی کہ بلا قوت کے قبضہ لیا جاسکے۔ اور قوت مفقود تھی۔ بلکہ مادی قوت زیادہ تر فریق مخالف کے ہاتھ میں تھی اسی غور و فکر کے دوران حضرت حافظ صاحب مجلس سے اٹھے اور اہل مجلس سے فرمایا کہ میں ابھی حاضر ہوا۔ اور سیدھے مسجد چھتہ میں پہونچے جب کہ صحن مسجد مخالف جماعت سے بھرا ہوا تھا۔ کافی خطرہ کا

سامان تھا۔ اور اس وقت کی نوعیت یہ تھی کہ جان اور آبرو دونوں ہی خطرات سے گھری ہوئی تھیں۔ حافظ صاحب نے اسی مجمع میں جرأت کے ساتھ باآواز بلند خطاب کرتے ہوئے مجمع کے صدر نشین سے کہا کہ حجرہ کی کنجیاں دلوا یئے۔ مجمع پر سکوت چھا گیا، منٹ بھر کے بعد وہ بزرگ مجلس سے اٹھے اور حجرہ کے تالے میں کنجیاں ڈال کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ حضرت حافظ صاحب نے تالہ لگا کر کنجی جیب میں رکھی اور مجلس شوریٰ میں لاکر پیش کر دی کہ حجرہ پر قبضہ لے آیا ہوں یہ کنجی حاضر ہے۔ ارباب مجلس اس جرأت پر حیران رہ گئے۔ اور کہا کہ اگر آپ اطلاع کر کے جاتے تو ہم کبھی نہ جانے دیتے۔ اسی طرح جرأت مندانہ اقدامات کے سلسلہ میں تنازعات کے مواقع پر طلبہ کی حمایت اور پشت پناہی کرتے ہوئے۔ ایک ایک طالب علم کے لئے سینہ سپر ہو کر پورے پورے مجامع کے سامنے تنہا آجاتے تھے اور کبھی کسی کا خوف یا رعب نہیں مانتے تھے۔ اکثر ایسے مواقع پر یہ جملہ فرماتے۔ کہ کیا تم نے ان کو (طلبہ کو) لاوارث سمجھا ہے جسے ان کے سامنے آنا ہو سر پر تو اباندھ کر آئے۔ طلبہ کو جہاں بسلسلہ تربیت جزئی جزئی امور پر روک ٹوک کرتے اور ڈانتے تھے بلکہ زدوکوب کر دیتے تھے۔ وہیں ان پر بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے۔ اگر کوئی طالب علم کچھ زیادہ بیمار ہو جاتا تو گھنٹوں اس کے بالین پر بیٹھے ہوئے اسے تسلی دیتے۔ اس کے علاج کا اہتمام فرماتے۔ اور بعض دفعہ اس کی تکلیف سے دلگیر ہوتے اور روتے، گھر آکر بے چینی سے فرماتے کہ آج ہمارا فلاں طالب علم بیمار ہے منہ میں کھانا نہیں چلتا۔ اگر کسی طالب علم کا انتقال ہو جاتا تو اس کے حجرہ کے سامنے چارپائی بچھا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اور اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک کہ اس کا جنازہ تیار ہو کر حجرہ سے چل نہ پڑتا۔ اسی .... وجہ دور کے طلبہ ان پر فریفتہ اور ان کے مدح خواں نظر آتے

تھے۔ نظم میں یکسوئی اور قوت ہمہ گیری تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی نسبت، ذاتی وجاہت جرأت و ہمت اور علم واخلاص کی بنا پر دارالعلوم کے کامیاب ترین سربراہ اور اس کی ترقیات کا محور و مرکز تھے۔ اور پوری جماعت دارالعلوم ان نسبتوں کے سبب ان سے وابستہ اور ان کے سامنے جھکتی تھی۔

درس وتدریس

حضرت حافظ صاحب ممدوح علاوہ نسبت قاسمی کے نسبت طریقت میں بھی اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ آپ رئیس الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ (بروایت حضرت قاری محمد طیب صاحب) بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی تھا مگر بہت کم، توجہ زیادہ تر نظم دارالعلوم یا پھر حلقۂ درس کی طرف مائل رہتی تھی۔ وعظ و تقریر نہایت مؤثر اور درس نہایت دل نشین ہوتا تھا۔ پورے زمانہ اہتمام میں حضرت ممدوح نے درس کا مشغلہ کبھی ترک نہیں فرمایا۔ ابتدائی دور میں درس اکثر دارالاہتمام (دارالمشورہ) میں دیتے تھے۔ پھر مسجد میں درس دینے لگے تھے۔

جس سال حضرت حافظ صاحبؒ کے یہاں مشکوٰۃ شریف کے درس میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم بھی شریک تھے۔ اس سال مشکوٰۃ شریف خاص اہتمام سے پڑھائی۔ اور ختم میں بھی خاص انداز اختیار فرمایا۔ ختم کے دن حضرت ممدوح حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جبّہ پہن کر درس کے لئے تشریف لائے۔ جو حضرت نے انھیں بطور سند و تبرک عطا فرمایا تھا۔ مولانا مبارک علی صاحب کا بیان ہے کہ اس دن چہرہ سے غیر معمولی وقار و تمکنت نمایاں تھا۔ اس سال

حضرت ممدوح کا درس دار المشورہ میں ہوا تھا۔ اور غیر معمولی انداز کا تھا نیز ان ہی کا بیان ہے کہ درس میں تقریر نہایت جم کر فرماتے جو علمی وقار و عظمت لئے ہوئے ہوتی حدیث کے معرکتہ الآراء مسائل پر بھرپور کلام فرماتے جو حقائق پر مشتمل ہوتا تھا۔

مولانا مبارک علی صاحب نے فرمایا کہ ایک دن ایک معرکتہ الآراء مسئلہ پر پورے چار گھنٹے تقریر فرمائی جو بے نظیر حقائق و معارف پر مشتمل تھی اور تمام طلبا محو حیرت اور مستغرق تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے والد ماجد حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی کتب پر غیر معمولی نظر تھی۔ اور درس حدیث و تفسیر میں حضرت اقدس کی تقریریں مناسب موقعہ ذکر فرماتے جس سے اس مسئلہ کا تحقیقی پہلو سامنے آ کر مسئلہ اپنی حقیقت سمیت روشن ہو جاتا تھا اور قاسمی حکمت سے خود بخود مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ کے بعد حضرت اقدس کی حکمت پر سب سے زیادہ حاوی تین شخصیتیں تھیں۔ ایک حضرت حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ دوسرے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے بعد تیسرے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اول الذکر کے حفظ کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی مسئلہ کے بارہ میں پوچھا جاتا کہ حضرت کی کتاب میں یہ مسئلہ کہاں ملے گا۔ تو بے تکلف ان سب کتابوں کے نام مع صفحہ و ورق کے بتلا دیتے تھے جہاں یہ مسئلہ مذکور ہوتا تھا۔

بہر حال درس میں یہ عالی مضامین نقل فرماتے جس سے حدیث منقول معقول نظر آنے لگتی تھی۔ اور پورا ذہن عقلی محسوس ہونے لگتا تھا درس میں انداز نہایت متین اور متواضعانہ ہوتا تھا۔ اور وہ طبعی جلال یا تیزی یکسر مبدل بہ شفقت ہو جاتی تھی۔ جو عام حالات میں ایک طبعی انداز تھا۔ بہر حال عملی لائن

میں تفہیم بے نظیر، قول کے دائرہ میں تاثیر ممتاز تحقیق عالی اور نہایت ہی واضح تر تھی جس نے ان کے درس کو مقبول بنا دیا تھا۔ اگر یہ اہتمام کے جھگڑے ان کے سر نہ ہوتے تو اس وقت ان کی یہ علمی خصوصیات زیادہ سے زیادہ نمایاں اور مؤثر ثابت ہوتیں۔ اور اس میدان میں ان کی امتیازی شہرت ہوتی۔ لیکن یہ بھی ان ہی اکابر کا کمال تھا کہ انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ علمی میدان میں بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ جو کمال استعداد کی دلیل ہے۔ ان تمام علمی و عملی مشغولیتوں کے ساتھ ذکر و فکر کے اشغال بھی پابندی کے ساتھ جاری رکھتے تھے۔ اسی کی تاثیر تھی جو کلام میں نمایاں ہوتی تھی۔

حضرت حافظ صاحب کی ایک خاص صفت اعتماد علی اللہ ممتاز تھی کسی بھی موقعہ پر کیسا بھی حادثہ اور اشکال پیش آتا تو کبھی ہراساں نہ ہوتے بلکہ اسی وقت قلب کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیتے اور غیر اللہ سے ایک دم اتنے بے گانہ ہو جاتے کہ گویا اس سے انھیں کبھی کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

مرض وفات

مولانا محمد علی صاحب مرحوم حیدر آبادی نے فرمایا کہ آخر سفر حیدر آباد میں جو سفر آخرت بھی تھا۔ جب حضرت ممدوح بحالت مرض حیدر آباد میں تھے۔ اور ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ حالت غیر ہوتی جا رہی ہے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت اجازت ہو تو میں تار دے کر طیب و طاہر کو دیوبند سے بلالوں؟ چیں بجبیں ہو کر فرمایا استغفر اللہ یہ طیب و طاہر کے بلانے کا وقت ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ہے۔ اب میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز مولانا مرحوم نے فرمایا کہ۔ پھر اسی مرض وفات میں جب بقصد دیوبند روانگی ہوگئی سیکنڈ کلاس میں ہم چار پانچ آدمی حضرت ممدوح کے رفیق سفر تھے تو استنجا سے فارغ ہو کر فرمایا کہ مجھے وضو کرادو۔ لیٹے لیٹے

وضو سے فارغ ہوئے۔ فرمایا کہ میرے کپڑوں پر کوئی دھبہ کسی ناپاکی کا تو نہیں ہے؟ ناپاکی سے ملائکہ علیہم السلام کو سخت نفرت ہے اور انھیں اذیت ہوتی ہے۔ عرض کیا گیا کہ کپڑے سب پاک ہیں۔ آپ اطمینان فرمائیں۔ اس پر فرمایا الحمدللہ، اور پھر فرمایا کہ اچھا اب حضرت تھانوی کو میری طرف سے ایک خط لکھو چنانچہ میں (مولانا محمد علی مرحوم) خط لکھنے بیٹھ گیا اور جو لکھاتے رہے وہ لکھتا رہا۔ اس میں اپنے عجیب و غریب قلبی حالات کا تذکرہ فرمایا۔ آخری جملہ یہ تھا۔ کہ الحمدللہ میرا قلب ذاکر ہے غافل نہیں ہے۔ اور میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر بخوشدلی راضی ہوں

جب بیمار ہوتے تو بعض اوقات تو معمولی سی بیماری اور تکلیف پر بہت زیادہ کراہ اور آواز سے ہائے وائے اور اظہار تکلیف و درد ہوتا تھا۔ اور بعض دفعہ بڑی بڑی شدید بیماریوں کے حملے ہوتے اور ساکت محض رہتے۔ عرصہ کے بعد پتہ چلتا کہ فلاں بیماری شدید آئی تھی جو چلی بھی گئی۔ اور کبھی کبھی دوا کا اہتمام فرماتے ورنہ عام حالات میں دوا بالکل نہیں کرتے تھے۔ ایک دن معمولی سی بیماری میں کو لنے اور کراہنے کا سلسلہ جاری تھا۔ تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ غیر معمولی طور پر یہ کولنا کراہنا کہیں توکل اور رضا بالقضاء کے منافی تو نہیں؟ تو ہنس کر فرمایا کہ نالائق ہمیں نصیحت کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اور فرمایا کہ میں نے اپنے تین بزرگوں کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ برتا ہے۔ میرے پیر و مرشد حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ میرے والد ماجد حضرت نانوتوی قدس سرہٗ اور میرے سرپرست اور مربی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور بیماری کے معاملہ میں ان تینوں کے تین حال تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال تو یہ تھا کہ معمولی سی بیماری بھی آجاتی تو کول کراہ سے مکان سر پر اٹھا لیتے اور بہت زیادہ ہائے وائے کرتے۔ بعض خدام نے عرض

کہاکہ حضرت یہ عبدیت کے منافی تو نہیں ؟ فرمایا تو کیا میں اپنے اللہ کے آگے بہادر بنوں۔ کہ آپ کا ہر ابتلا اور امتحان برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت ہے۔ اور میں ہر آزمائش کو اٹھا سکتا ہوں۔ فرمایا کہ بندگی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ معمولی سے معمولی ابتلا میں بھی اپنا ضعف اور عجز و بے چارگی اللہ پر ظاہر کر دے۔ اور عرض کر دے کہ یا اللہ میں تو بہت کمزور اور ضعیف بندہ ہوں مجھ میں تیری آزمائش اٹھانے کی طاقت کہاں ؟ یہی عبدیت ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کا حال یہ تھا کہ بڑی سے بڑی بیماری آجاتی تو کسی کو پتہ نہ دیتے۔ اس قدر ضبط و تحمل ہوتا تھا کہ کسی کو بیماری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مہینوں میں اتفاقیہ اگر ضمن کلام میں حضرت ہی کی زبان سے کبھی اظہار ہو گیا تو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی شدید مرض کا حملہ ہوا تھا۔

عرض کیا گیا کہ ظاہر ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ تدارک اور دفع مرض کی تدبیر ہو سکتی، فرمایا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی آئے اسے تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کرنا چاہئیے۔ اور گردن جھکا دینی چاہئیے کہ "ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"۔ یہی عبدیت اور رضا ہے کہ کچھ بھی ہو آدمی اف نہ کرے اور معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کر دے جو کچھ کہے ان سے کہے "اِنَّمَا اشکو بثی و حزنی الی اللہ" جب طبیب مطلق وہ ہے اور بیمار اور اس کی بیماری کا خبیر مطلق بھی وہی ہے تو وہی بندہ کی مصلحت سے واقف ہے۔ اس لئے تفویض مطلق پر عمل کرنا اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کرنا ہی مقام عبدیت ہے۔

اور فرمایا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا حال بیماری میں یہ تھا کہ نہ کولتے نہ کراہتے نہ ساکت رہتے بلکہ علاج کی طرف توجہ زیادہ ہوتی۔ اور اہتمام ہوتا کہ طبیب کو بلاؤ اور دوا کا انتظام کرو اور پرہیز یہ ہونا چاہئیے۔ اور غذا

فلاں ہونی چاہیئے۔ اور فرماتے کہ بیماری میں علاج کا اہتمام سنت ہے اور سنت کی پیروی ہی مقام عبدیت ہے کہ آدمی اپنا طبعی جذبہ چھوڑ کر شریعت کے اوامر کی پیروی میں لگ جائے اور مقام طبیعت سے ہجرت کر کے وطن شریعت میں جا بسے کہ یہی بندگی ہے اور یہی مقام عبودیت کا تقاضا ہے۔ غرض بندگی اور عبدیت کے مختلف چولے نکلے۔ یہی بندگی اور عبدیت ایک جگہ اظہار ضعف و بیچارگی کے چولہ میں نمایاں ہوئی، ایک جگہ تفویض اور تسلیم و رضا کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ایک جگہ اتباع سنت اور پیروی شریعت کی صورت میں کھلی۔ اور تینوں رنگ بلاشبہ اپنی اپنی جگہ سے عبدیت ہی کے ہیں۔

آخرکار ۱۳۲۱ھ میں حضرت حافظ صاحب کی وجاہت و شہرت اور مقبولیت کی بنا پر نظام دکن نے آپ کو دکن کی عدالت عالیہ کا مفتی مقرر فرمایا۔ اور ایکہزار روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ جاری کی۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار جو بہت پہلے سے آپ کا وظیفہ سرکار سے جاری تھا اور ملازمت کے بعد جب کہ تنخواہ جاری ہوگئی تھی حسب قانون دکن بند ہو جانا چاہیئے تھا لیکن حضور نظام نے ان قوانین سے آپ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے یہ وظیفہ بھی بدستور جاری رکھا۔ آپ کے لئے دو گھوڑوں کی ایک نہایت ہی شاندار لینڈو سرکاری طور پر مقرر ہوئی جس پر باوردی چوبدار اور سائیس ساتھ دیئے۔ تمام درباروں اور نذر وغیرہ کی پیش کشی سے آپ کو مستثنیٰ قرار دیا۔ حتیٰ کہ عدالت العالیہ کے اجلاس کی حاضری سے بھی مستثنیٰ کرتے ہوئے قیام گاہ ہی پر اجلاس کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت حافظ صاحب کے متعدد مرید و متوسل حیدرآباد میں موجود تھے۔ انھوں نے آپ کی خدمت کو سرمایہ سعادت سمجھتے ہوئے یہ گوارہ نہیں کیا۔ کہ

آپ کسی سرکاری کوٹھی میں حسین سے الگ رہ کر قیام فرماویں۔اس لئے
حضرت حافظ صاحب کے ایک ہونہار مرید جن کو آپ مثل اولاد کے جانتے تھے۔
نواب عبدالباسط خاں مرحوم نے اپنی عظیم الشان حویلی حضرت مرحوم کے لئے
خالی کردی جس میں قیام گاہ، مہمان خانہ، کتب خانہ اور اجلاس کا ہال سب
مہیا تھا۔چار برس کامل آپ نے حیدرآباد میں قیام فرماکر مسند افتار کو رونق بخشی
اور برسوں کے بڑے بڑے الجھے ہوئے مقدمات شرعی طور پر فیصل فرمائے جن
میں آپ کے علمی معین حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس
دارالعلوم دیوبند رہے مفتی عدالت عالیہ ہونے کے ساتھ آپ دارالعلوم دیوبند
کے صدر مہتمم بھی رہے۔اور ضروری امور کی امسلہ رجسٹری کے ذریعہ حیدرآباد بھیجی
جاتی تھیں جن کے فیصلے آپ وہاں سے کرکے بھیجتے تھے۔مجلس شوریٰ نے آپ
کی شخصیت ہی کی وجہ سے صدارت اہتمام کا عہدہ قائم کیا۔اور آپ کو صدر
قرار دے کر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بنایا۔نیز
دیوبند پہونچکر یہاں جتنا قیام ہوتا تو حیدرآباد عدالت عالیہ کی مسلیں رجسٹری سے
یہاں پہونچتی تھیں۔اور فیصلہ لکھ کر حضرت ممدوح حیدرآباد روانہ فرماتے۔اکثر
فیصلوں کی خوش قلم نقلیں مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر الکاتبین شعبۂ کتابت
دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے۔حاصل یہ کہ آپ دارالعلوم اور عدالت عالیہ
دکن کی ذمہ داریاں بیک وقت نباہتے تھے۔اور حکومت دکن اور ذمہ داران
دارالعلوم دونوں آپ کے خواہاں تھے۔حضرت ممدوح نے اس چار سالی میں
اور پھر دیوبند واپس آنے کے بعد دارالعلوم سے تنخواہ نہیں لی، اور ایثار
سے کام کیا۔

اس زمانۂ قیام دکن میں دکنی فضلا دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کی

ذات مرکز بن گئی۔ اور وہ مہانداری کی روایت جو دیوبند میں تھی وہاں بھی بدستور اسی آب وتاب کے ساتھ قائم رہی۔ ہر وقت فضلا رکا اجتماع رہتا۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ مولانا محمد علی صاحب مرحوم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی۔ مولانا عبدالمجید صاحب ناظم صفۃ الاسلام دکن۔ اور دوسرے ملکی اور غیر ملکی فضلاء کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اور یہ سب احباب اسی طرح وہاں جمع رہتے تھے جیسے ایک شفیق باپ کے زیر سایہ اس کے محبوب فرزند جمع ہوں یہ گھڑیاں نہایت مسرت وخوشی اور سکون کے ساتھ کٹ رہی تھیں۔ کہ حضرت حافظ صاحب کو ضعف پیری کے سبب کچھ مزمن امراض لاحق ہوئے اور ضعف واضمحلال بڑھنے لگا۔ اور دکن کی آب وہوا ان امراض میں سازگار نہ رہی۔ تو اہل دیوبند، اکابر دارالعلوم اور اہل خاندان کے اصرار پر آپ نے حضور نظام سے خدمات افتاء سے سبکدوشی کی درخواست کی کئی ماہ تک حضور نظام نے منظوری نہیں دی لیکن جب حضرت مرحوم نے اپنا ضعف ونقاہت مشاہدہ کرایا اور ملاقات کرکے ناتوانی اور کمزوری کی تفصیلات ذکر کیں تو تاسف کے ساتھ درخواست منظور فرمائی۔ اور ایک ہزار کا نصف مبلغ پانچسو روپیہ ماہوار آپ کی پنشن فرمائی جو تاحیات جاری رہی۔

دیوبند پہونچ کر بھی مرض میں کمی نہ آئی۔ طبیعت ناتواں ہو چکی تھی ضعف بڑھتا گیا حتیٰ کہ دارالعلوم میں آمد ورفت بھی گاہ بہ گاہ ہی کی رہ گئی۔ اکثر اوقات بستر علالت پر ہی گزرنے لگے۔ اپنی جگہ حیدرآباد دکن کے عہدۂ افتاء کے لئے آپ نے اپنے حبیب ترین رفیق اور نائب اہتمام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو اس وقت مہتمم تھے نام نامی پیش فرمایا جو حضور نظام نے قبول فرمالیا۔ اور مولانا مرحوم سات سو روپے ماہوار پر حیدرآباد تشریف لے گئے۔

لیکن کل سات ماہ ہی قیام رہا اسی دوران میں دارالعلوم میں کچھ نزاع رونما ہوئے جن کی تفصیل دارالعلوم کی رودادوں میں موجود ہے۔ اور اس کے بعد دارالعلوم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دارالعلوم کے عہدۂ صدارت تدریس پر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے۔ ان نزاعات سے کافی عرصہ قبل حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ نے حضرت حافظ صاحب کو نیازمندانہ دعوت دی۔ حضرت مرحوم رائپور تشریف لے گئے۔ حضرت رائے پوری نے غیر معمولی اور خارق عادت تکریم کی۔ حتیٰ کہ تخلیہ میں حضرت حافظ صاحب کے پیر پکڑ لئے اور آبدیدہ ہوکر فرمایا۔ میں اس کہنے پر مامور کیا گیا ہوں۔ کہ حق تعالیٰ نے آپ کی ترقی درجات کے لئے بدگویوں کی بدگوئی کا راستہ تجویز فرمایا ہے۔ وہ جو پیش آنے والا ہے۔ آپ دل تنگ نہ ہوں۔ حضرت مرحوم نے نہایت بشاشت سے فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی اور شاکر ہوں۔ فرمایا الحمد للہ۔ چنانچہ ایسے فتنے رونما ہوئے جن میں یہ تقدیر پوری ہوگئی۔

وفات

۱۳۴۶ھ ہجری سے ان اکابر کی روانگی دارالبقاء کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے اس سلسلہ میں پہل کی اسی دور رحلت وانتقال میں حضرت حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی بادجاہت زندگی کا دورہ پورا کر دیا۔ اور ۳ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ کو دارالعلوم ہی کی خدمات کے سلسلہ میں دارالعلوم پر نثار ہوگئے۔ وفات کی صورت حال یہ ہوئی کہ حضرت مرحوم نے حضور نظام کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دینے کے لئے حیدرآباد دکن کا سفر کیا۔ اور اکابر دارالعلوم کے مشورہ

سے آپ دیوبند سے دکن روانہ ہوئے۔ نواب عبدالباسط خاں مرحوم کی کوٹھی پر قیام ہوا۔ حضور نظام سے ملاقات فرمائی۔ ابھی مقصد کے بارے میں سلسلۂ گفتگو کا ایک ملاقات سے آغاز ہی ہوا تھا کہ بواسیر کا دورہ شدید ہوا خون بکثرت آیا اور طبیعت اتنی نڈھال ہوگئی۔ کہ لوگ زندگی سے مایوس ہوگئے تمام مقامی احباب و خدام کا مشورہ یہی طے پایا۔ کہ اب جلد سے جلد آپ کو دیوبند پہونچا یا جائے۔ چنانچہ سیکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا۔ یہ چار احباب و خدام ساتھ ہوئے۔ میر احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ حافظ محمود احمد صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ شریف احمد گنگوہی سلمہٗ حال مدرس حفظ قرآن دارالعلوم دیوبند۔ ریل گاڑی روانہ ہوئی۔ جب حیدرآباد سے تقریباً ۸۰ میل پہونچی اور نظام آباد کا اسٹیشن قریب آیا تو رفقاء میں سے مولوی محمد علی صاحب سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کو (جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے) خط لکھوایا اس میں یہ جملہ خصوصیت سے قلم بند کرایا جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ

"الحمد للہ میرا قلب غافل نہیں، بلکہ ذاکر ہے۔ اور میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی ہوں۔"

خط لکھا کر قضاء حاجت سے فراغت پائی۔ اور اپنی سیٹ پر سیدھے لیٹ کر مولانا محمد علی سے فرمایا کہ چادرہ ہر طرف سے درست کردو۔ اور یہ دیکھو کہ میرے کپڑوں پر کسی نجاست وغیرہ کا اثر تو نہیں ہے۔ کیونکہ ملائکہ علیہم السلام کو بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ خادموں نے عرض کیا کہ حضرت کپڑے بالکل پاک اور صاف ہیں اس کے بعد عقد انامل پر تسبیح اور ذکر اللہ شروع کیا۔ ۲۹ کے عدد پر عقد انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کرگئی۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً

قبض روح کے وقت سب خدام نے ایک تیز قسم کی آسمانی رنگ کی چمک محسوس کی۔ جس نے سب کی نگاہوں کو خیرہ کردیا۔ یہ چمک آنی تھی جوں ہی ختم ہوئی تو قبض روح ہوچکا تھا۔

نظام آباد کے اسٹیشن پر لاش اتاری گئی شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ ہزارہا لوگ نام سنکر جمع ہونے شروع ہوگئے مسجد اسٹیشن میں غسل دیا گیا، جنازہ تیار ہوا اور ہزاروں انسانوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ حیدرآباد حضور نظام کو اور متعلقین کو تار کیئے گئے وہاں سے حضور نظام کا تار پہونچا کہ مولانا کا جنازہ حیدرآباد لاؤ۔ اسی وقت تابوت بنوایا گیا۔ کئی من صندل کے برادہ میں تکفین شدہ لاش ڈھانپی گئی اور تابوت بند کردیا گیا۔ ایک لاری پر تابوت رکھ کر اگلے دن حیدرآباد پہونچایا گیا۔ شہر میں خبر دوڑ گئی اور جوق در جوق لوگوں کا ہجوم شروع ہوگیا۔ ہزاروں انسانوں نے نماز جنازہ پڑھی متعدد نمازیں ہوئیں [illegible] حضور نظام نے خود اپنے مصارف پر اپنے مخصوص تیار کردہ قبرستان موسومہ خطۂ صالحین میں ۴ رجمادی الاول ۱۳۴۷ھ کو دفن کرایا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح

از ۱۲۸۰ھ تا ۱۳۶۲ھ

نام و نسب آپ کا تاریخی نام "کرم عظیم" اور دادھیال کا مقرر کردہ نام عبدالغنی۔ اور نانہال کی طرف سے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب کا تجویز کردہ نام "اشرف علی" ہے۔ آپ مجذوب ممدوح کی برکت دعا سے پیدا ہوئے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

یہ جو میں کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں ان ہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں

علاوہ ازیں شرافت نسبی کے اعتبار سے ماں کی طرف سے آپ سیدا اور علوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رح کے نسب سے مل جاتا ہے۔ باپ کی طرف سے آپ فاروقی النسل شیخ ہیں۔ چنانچہ مؤلف سوانح کی تحقیق ہے۔

"شیوخ تھانہ بھون حضرت شیخ مجدد الف ثانی، حضرت شیخ تھانیسری و حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر۔ یہ سب سلطان شہاب ملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد سے ہیں الخ

حضرت والا کیا بلحاظ ظاہر اور کیا بلحاظ باطن شاہی خاندان سے نسبت رکھتے ہیں[1] الخ

---

[1] اشرف السوانح ص۱۳ ج ۱

سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ ایک بہت بڑے رئیس شیخ عبد الحق صاحب تھانوی رح کے گھر میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ ہے چھوٹے بھائی کا نام اکبر علی ہے۔ منشی اکبر علی صاحب عہد حکومت برطانیہ میں بریلی شہر میں بمشاہرہ پانچ صد روپیہ ماہوار ملازم تھے۔

غرض کہ آپ کی پرورش نہایت ہی ناز و نعم میں ہوئی حضرت تھانوی رح ان تمام وجوہات سے بچپن میں ایک مزاج رکھتے تھے جو مشائخ دیوبند میں سے کسی کا نہیں تھا چنانچہ مؤلف سوانح حیات تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت والا بچپن میں کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی بس فوراً قے ہو جاتی تھی یہ حضرت والا نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے۔ چونکہ لڑکوں کو یہ معلوم تھا اس لئے حضرت والا کو تنگ کیا کرتے تھے۔ اور پیٹ کھول کھول کر دکھاتے اور حضرت والا قے کرتے کرتے پریشان ہو جاتے الخ کسی کا جھوٹا کھانا یا پانی استعمال نہیں فرماسکتے گھن آتی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی اپنے بزرگوں کے سامنے کا بچا ہوا کھانا یا پانی بھی تبرکاً استعمال نہیں کر سکے الخ

(اشرف السوانح ص ۲۱-۲۲ ج ۱)

غرضکہ خاندانی اثرات و اسباب اور ماحول کی وجہ سے قدرت نے آپ کو عجیب و غریب مزاج عنایت فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ ایک مخصوص مزاج کے مالک رہے جس کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔

تعلیم و تربیت

یہ بھی قدرتی امر تھا کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کو عربی تعلیم کے لئے اور چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب کو انگریزی تعلیم کے لئے منتخب کیا۔ آپ نے قرآن شریف حافظ حسین علی صاحب

سے حفظ کیا تھا۔ اور چند پارے آخون جی صاحب سے پڑھے۔ فارسی میرٹھ کے مختلف اساتذہ سے پڑھی۔ اور متوسطات مولانا فتح محمد صاحب تھانوی اور انتہائی کتابیں اپنے ماموں امجد علی صاحب اور بعض کتابیں دیوبند میں مولانا منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ زمانۂ طالب علمی میں آپ کو فارسی لکھنے اور بولنے کی کافی مہارت ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں مثنوی زیر و بم آپ نے تصنیف فرمائی جس سے آپ کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا فتح محمد صاحب سے تھانہ بھون رہ کر پڑھیں اور آخری ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں آپ بغرض تحصیل و تکمیل علوم دینیہ دیوبند تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے مربی و شفیق اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ، ملا محمود صاحب اور مولانا سید احمد صاحب وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

قرأت کی مشق آپ نے حضرت قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی کے سامنے مکہ معظمہ رہ کر فرمائی۔ آپ کی دستار بندی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے دستِ مبارک سے ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔

سلسلۂ تدریس

دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ آخیر صفر ۱۳۰۱ھ میں باجازت والد ماجد اور اساتذہ کانپور تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ فیض عام میں پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد آپ میں اور اراکین مدرسہ میں اختلاف ہوا۔ وجہ اختلاف یہ تھی کہ اراکین چاہتے تھے کہ آپ وعظ کر کے چندہ بھی وصول کریں۔ لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور مدرسہ سے استعفیٰ دیدیا۔ کانپور کے دیگر حضرات نے جب دیکھا کہ ایک قابل عالم ہاتھ سے جاتا ہے۔ تو باصرار

آپ کو روکا اور ایک مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ اور آپ کو پچیس[۲۵] روپے مشاہرہ پر مدرسہ میں ملازم رکھ لیا۔ غرضکہ آپ یہاں چودہ[۱۴] سال تک مقیم رہے اور وعظ، درس وتدریس، افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔ کانپور کے چودہ سالہ قیام کی وجہ سے آپ کو کافی شہرت حاصل ہوئی چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

ے۔ میری اتنی جو شہرت ہوئی تو وہ کانپور والوں کی بدولت ہوئی۔ ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہ تھا[۱]

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کانپور میں رہ کر دین کی اس قدر خدمت کی کہ غیر اپنے ہوگئے۔ اور آپ سے محبت کرنے لگے۔ اور اس کے گردو نواح میں بدعت کا قلع قمع اور سنت کا اجراء آپ ہی کے دم قدم سے ہوا۔ غرضکہ ۱۴ سال تک آپ نے کانپور میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی تا آنکہ ۱۳۱۵ھ میں آپ کانپور چھوڑ کر وطن یعنی تھانہ بھون تشریف لائے۔ اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خانقاہ کو آباد کیا۔

بیعت اور سلوک

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس لئے کہ پیدا ہونے سے قبل ہی اس قسم کی چیزوں کا ظہور ہوا کہ جس سے صاف کہا جاسکتا تھا کہ "اشرف علی" کوئی غیر معمولی بزرگ ہوگا۔

ے۔ اسے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ
یہ بچہ طرحدار پیدا ہوا ہے

تولد ہونے کے بعد عربی تعلیم کے لئے آپ کا انتخاب بھی ایک منجانب

۱۔ اشرف السوانح صفحہ ج ا۔

اللہ امر تھا۔ ورنہ عقل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ کو دنیاوی تعلیم دی جاتی۔ اور آپ کے برادر خورد کو عربی تعلیم کیونکہ ماں باپ بہل کی اولاد کو عموماً اسی طرز پر چلانا پسند کرتے ہیں جس پر خود ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی پیشین گوئی "جہاں تم جاؤ گے تم ہی تم نظر آؤ گے" نے اصحاب باطن اور تجربہ کار حضرات کے قلوب میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے متعلق کہ یہ طالب علم ہونہار ہے یقین کا درجہ دیدیا تھا۔

غرضکہ باطنی اشارات کے ماتحت فطرۃً اسی لائحہ عمل کو اختیار کیا۔ اور اسی راستے پر گامزن ہوئے جس کے لئے آپ کو پیدا کیا گیا تھا۔ علوم ظاہر سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں تزکیہ باطن کی تڑپ پیدا ہوئی۔

ابتدا میں آپ کا قلبی میلان قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف تھا۔ چنانچہ مؤلف سوانح فرماتے ہیں:۔

> حضرت والا نے طالب علمی کے زمانہ میں اوّل آپ (حضرت گنگوہیؒ) ہی سے مدرسہ دیوبند میں بیعت ہونے کی درخواست کی تھی لیکن مولانا (حضرت گنگوہیؒ) نے طالب علمی کے زمانہ میں بیعت کرنے کو خلاف مصلحت اور حارج تحصیل علوم دینیہ خیال فرما کر عذر فرما دیا[۵]
>
> ایک بار حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کسی ضرورت سے مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔ حضرت والا (مولانا تھانویؒ) زیارت کرتے ہی غایت اشتیاق میں بغرض مصافحہ دوڑے، تو اینٹوں کی وجہ سے جو اس وقت وہاں نو درہ کی تعمیر کے لئے پڑی ہوئی تھیں۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور

۵۔ اشرف السوانح ص۱۳۲ ج ۱

زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کو حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بیعت کی درخواست کی۔ مولانا (حضرت گنگوہیؒ) نے اس بنا پر کہ بزمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ انکار فرمادیا الخ (اشرف السوانح ص۱۲۶)

ھکذا فی یاد یاراں حضرت والا کے ایک اور ہم سبق نے بھی اسی دوران میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی درخواست کی تو ان سے انکار نہیں فرمایا اور ان کو بیعت کر لیا جس سے حضرت والا کو اور بھی حسرت ہوئی الخ [1]

بہرحال ابتدا میں حضرت تھانویؒ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے۔ اور اس قدر اشتیاق تھا کہ آپ نے حضرت گنگوہیؒ (جبکہ وہ تیسرے حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جارہے تھے) کے بدست حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا کہ آپ مولانا گنگوہیؒ سے سفارش فرمادیں کہ وہ مجھے بیعت کرلیں لیکن اس کے بعد آپ اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے ہمراہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور مکہ معظمہ پہونچکر حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خدام میں داخل ہوگئے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور چونکہ:۔ ے

مرد حق کی گویا پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے آپ کو بیعت فرمالیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت گنگوہیؒ نے کسی اشارۂ باطنی کی وجہ سے اس درنا شفتہ کو

[1] اشرف السوانح ص۱۹۷ ج ۱

رشتۂ بیعت میں منسلک نہیں کیا تھا۔ ؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے ہے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

بہرحال حضرت حکیم الامتؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے میکدہ میں داخل ہو کر مخمور میخانہ نکلے۔

چونکہ آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ تھے اس لئے مستقل اقامت کا کوئی ارادہ نہ تھا حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا بھی کہ کم از کم چھ مہینے قیام کرو لیکن قیام کرنا ممکن نہ ہوا۔ اور آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے اور کانپور پہونچکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سلسلۂ بیعت وخانقاہ

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ کو آپ سے محبت تھی۔ ہر دو حضرات آپ کی بہت زیادہ رعایت فرماتے۔ اور شفقت اور محبت کا برتاؤ بھی کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ تو پیر بھائی ہونے کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہیؒ چارپائی سے نیچے اتر کر برابری میں بیٹھ گئے۔ بعض لوگوں نے عرض بھی کیا۔ حضرت وہ تو اپنے آپ کو حضرت کا ایک مرید سمجھتے ہیں۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا۔ تم تو اندھے ہوگئے ہو۔ میں تو اندھا نہیں ہوں۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی پوچھتا تو فرماتے یہ میرا پوتا ہے۔ غرضکہ ہر دو حضرات سے خصوصی اور گہرے تعلقات تھے۔

سنہ ۱۳۱۰ھ میں آپ پھر دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تقریباً چھ مہینے آپ نے قیام کیا۔ اور ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ اس قیام میں

حضرت حاجی صاحبؒ نے مخصوص توجہات سے نوازا۔ اور غالباً اسی قیام میں آپ کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔ مؤلف سوانح نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تصریح نہیں کی اور نہ ہی کسی تاریخ کی تعیین ہی کی ہے۔ ہم نے ۱۳۱۰ھ صرف قرائن کی وجہ سے لکھدیا ہے۔

بہر حال آپ نے حلقہ توجہ اور سلسلہ بیعت ۱۳۱۰ھ کے بعد کانپور سے شروع کردیا تھا۔ اور تھانہ بھون پہونچنے کے بعد تو مستقل اصلاح خلق کا کام شروع کردیا۔ اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو آباد کیا۔

اصول وضوابط

اس میں شک نہیں کہ حضرت تھانویؒ نہایت لطیف مزاج تھے۔ متقدمین میں سے مزاج کے اعتبار سے آپ کو مرزا مظہر جان جاناں ثانی کہا جاسکتا ہے۔ آپ نہایت مترتب المزاج اور اصول وضابطہ کے پابند تھے۔ اور حقیقت یہ کہ اگر آپ مترتب المزاجی اور اصول وضوابط سے کام نہ لیتے تو تصنیف وتالیف کا کام ہرگز نہ کرپاسکتے تھے۔

ہم اوپر عرض کرآئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کی خدمت کے لئے پیدا کیا کیونکہ ایک خاص نوعیت کی خدمت آپ سے لینی تھی۔ اس وجہ سے شروع سے ایسے اسباب مہیا کردیئے اور مزاج بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا۔ اب ہم آپ کے اصول وضوابط کو مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

شرائط داخلہ خانقاہ

ذیل میں اشرف السوانح سے شرائط داخلہ کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فارم شرائط داخلہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نو واردین کو دیدیا جاتا تھا جس کی خانہ پُری واردین کو اپنے آپ کرنی پڑتی تھی۔ اور اگر کوئی پڑھا ہوا نہ ہوتا تو دوسروں سے بھروا کر داخل کرتا تھا۔

نقشہ شرائط داخلہ خانقاہ

(۱) نام ۔ ؟

(۲) وطن اصلی ۔ ؟

(۳) اس وقت کس مقام سے آنا ہوا اور اس مقام میں کتنا قیام رہا۔

(۴) شغل و وجہ معاش ۔ ؟

(۵) موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں ۔ ؟

(۶) علمی استعداد ۔ اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے ۔ ؟

(۷) اصلی مقصد آنے سے کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں یا تنہائی میں ۔

(۸) کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اور کس سے ۔ ؟

(۹) اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا ۔ اور تعلیم کس کے متعلق ہے ۔ ؟

(۱۰) میرے مواعظ اور رسائل کیا کیا دیکھے ہیں ۔ ؟

(۱۱) اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو پھر دکھلایا جائے ۔ ؟

(۱۲) کتنا قیام ہوگا ۔ ؟

(۱۳) کہاں قیام ہوگا ۔ ؟

(۱۴) خانقاہ میں اول بار آنا ہوا ہے یا پہلے کبھی آئے ہیں ۔ اگر پہلے کبھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا ۔ ؟

(۱۵) یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں[۱] ؟

(۱۶) باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا یا نہیں[۲] ؟ (ماخوذ از اشرف السوانح ص ۲۵)

(حاشیہ ۱ و ۲ ص ۳۳۹ پر ملاحظہ کیجئے)

بڑا اعلان انضباطِ اوقات

(۱) صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی سے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی۔

(۲) البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہوا ور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہے۔ اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً درد زہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضروریات کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگران تینوں شخصوں کو چاہیئے کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

(۳) پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ اور نماز کا وقت ہے۔ اس میں ملاقات سے اور سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

(۴) پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی، تعویذ وغیرہ مانگنے کی۔ البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے۔

حاشیہ صفحہ ۳۳۵ کا ملاحظہ فرمائیے۔

[۱] نو واردین کے لئے طعام کا انتظام یہ تھا کہ ایک سادہ کا ان مقرر کر دی گئی تھی۔ اور کھانوں کا نرخ مقرر کر دیا گیا تھا کہ واردین کو جس کھانے کی ضرورت ہو اس بھاؤ سے ملے گا۔

[۲] یہ نقشہ بھی اسی نقشہ سے ملحق پیش کیا جا رہا ہے۔ (بندہ غفرلہٗ)

(۵) پھر اذان عصر سے نماز سے فارغ ہونے کے لئے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ کے وقت کا ہے جو نمبر۳ میں مذکور ہے۔

(۶) پھر عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشا سے فارغ ہونے تک کے لئے وہ قاعدہ ہے۔ جو صبح سے بارہ بجے تک کے وقت کا ہے جو نمبر۱ میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر۲ میں مذکور ہیں۔

(۷) عشا کے بعد تو معذوری ظاہر ہے الا ماشاء اللہ یا استثنا اضطرار شدید۔

(۸) یہ قواعد تو ان صاحبوں کے لئے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں۔ اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے۔ اس میں لکھ کر ڈالدیں۔ اور جس موقعہ پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتہ لکھدیں۔ مثلاً فلاں نمبر کے حجرے میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نماز فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے تحریری جواب مل جاوے گا۔ اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ تنہائی کا وقت پوچھ لیں۔ میں جو وقت بتلاؤں اس وقت بات کرلیں اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

(۹) بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلا لیتا ہوں۔ دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔ اور اسی طرح کسی کو کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جبتک خاص اجازت حاصل نہ کریں۔ جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ ذلک۔

(۱۰) راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں اور نہ گھر جا کر پکاریں۔

(ماخوذ از اشرف السوانح صہ۲۲۴ تا ۲۲۵ ج ۲)

شرائط بیعت جب کوئی طالب حضرت والا سے رجوع کرتا ہے خواہ تقریراً یا تحریراً، حاضراً یا غائباً تو بجز خاص اطمینانی مواقع کے ایک مطبوعہ پرچہ حوالہ فرما دیا جاتا ہے جس میں بیعت بلا تعلیم اور تعلیم بلا بیعت کی شرائط جدا جدا درج ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) قرآن شریف جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح یاد کرنا ہوگا۔

(۲) بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہر اور اصلاح الرسوم اور قصد السبیل کی تذئیل پڑھ کر یا سنکر پابندی کرنا ہوگی۔

(۳) میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

(۴) ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے (جس کو میں تجویز کردوں۔ یا طالب کی تجویز پر اجازت دے دوں) حاصل کرنا ہوگی۔ اور جب تک ۲۵ بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے براہ راست مجھ سے تعلیم کی استدعا نہ کی جائے۔

(ماخوذ از اشرف السوانح ص۱۶۹ ج ۲)

حضرت تھانویؒ کے اصول و ضوابط اور آداب متفرقات کو اگر مفصل لکھا جائے تو اس کے لئے ایک مستقل رسالہ درکار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسا کہ شاہی دربار کے آداب و قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ ان تمام امور پر پابند ہونا۔ اور پابندی کرانا یہ حضرت تھانویؒ ہی کا کام تھا۔ اگر کسی سے قواعد و ضوابط کے خلاف ہوا، تو پھر خیریت نہیں تھی۔ خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ اور اگر معافی بھی دے دی گئی۔ تب بھی سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً،

تدارک اکثر یہی ہوتا تھا کہ کسی قریب کے مقام پر جا کر وہاں سے پھر حاضری کی اجازت طلب کی جائے۔ اور بعض کے لئے صرف اس پر اکتفا فرمایا گیا

کرلکھ کر خانقاہ میں یہ اعلان آویزاں کر دیا جائے کہ مجھ سے فلاں اذیت و حرکت سرزد ہوئی ہے اور بعض کے لئے یہ تجویز فرمایا گیا کہ سب مقیمین خانقاہ سے فرداً فرداً اپنی غلطی کا اظہار کیا جائے " (اشرف السوانح ص ۲۲۲ ج ۲)

اصول و ضوابط پر حتی الامکان پابند بنایا جاتا تھا۔ مثلاً کوئی ملاقات کی اجازت چاہتا تو مجال نہیں تھی کہ کوئی حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ خاموش بیٹھا رہنا لازم تھا۔ (ملاحظہ فرمایئے ص ۲۲۲ ج ۲)

مصافحہ کرنے والے نووارد کے لئے لازم تھا کہ مصافحہ کرتے ہی۔ بتلائے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ (ملاحظہ فرمایئے ص ۲۹۲ ج ۱)

خط و کتابت کے لئے لازم تھا۔ کہ ایک پرچے میں ایک ہی قسم کا سوال ہو، جواب کے لئے خط ہونا، یا پھر لفافہ ہونا۔ اور لفافہ پر پتہ لکھا ہونا لازمی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ حضرت تھانوی نے بہت سے اصول و ضوابط وضع کئے جن پر خود بھی پابند رہے۔ اور دوسروں کو بھی پابند بنایا۔ اور یہ سب کچھ تربیت طالبین کے لئے ہوتا تھا۔

مواعظ

اللہ تعالیٰ کو جس آدمی سے جو کام لینا ہوتا ہے۔ شروع سے ہی اس کی طبیعت کو اس کام کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی سے وعظ کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح کرنی مقصود تھی۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کی طبیعت کو اس کام کی طرف مائل کر دیا تھا۔ لہٰذا آپ اگر کوئی کھیل بھی کھیلتے تو اس میں بھی یہی پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ مؤلف سوانح لکھتے ہیں:۔

" وعظ کا بھی بچپن ہی سے شوق تھا۔ اور اس کی نقل بھی اتارا کرتے تھے

چنانچہ جب کبھی بازار کی طرف چھوٹے موٹے سودے کے لئے بھیجے جاتے تو جو مسجد راستے میں پڑتی اس میں چلے جاتے اور سیدھے منبر پر چڑھ جاتے اور کھڑے ہو کر کچھ خطبہ کی طرح پڑھ پڑھا کر چلے آتے الخ
زمانہ طالب علمی میں بھی آپ نے اس شغل کو جاری رکھا۔
طالب علمی کے زمانے میں حضرت والا نے اپنے ہم سبق کی ایک جماعت قائم کرکے ہر شب جمعہ کو نوبت بنوبت وعظ گوئی کی مشق کا انتظام فرمایا تھا الخ
آپ کے مواعظ نہایت پُرمغز نصیحت آمیز حکیمانہ ہوتے تھے۔ قرآن و حدیث اور دین کے مہمات مسائل کو چٹکی بجاتے ہی حل کر دیتے تھے۔ آپ نے وعظ پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اگر کوئی بطور ہدیہ کچھ پیش کرتا تب بھی بہت احتیاط کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا کانپور میں وعظ ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی صاحبزادی نے وعظ کہلایا تھا بعد اختتام وعظ صاحبزادی نے کچھ بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے منع کر دیا عرض کیا گیا۔ کہ حضرت! یہ تو ہدیہ ہے۔ ارشاد فرمایا صورت معاوضہ کی پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھنے والوں کو یہی شبہ ہوگا
آپ کے مواعظ میں تمثیلات، حکایات اور اشعار بھی موقع بموقع ہوتے ہیں کہ جن سے آپ حکیمانہ فوائد و نصائح بھی اخذ کرتے چلتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ قبیح سے قبیح حکایات سے عجیب و غریب فوائد اخذ کرتے ہیں۔
وعظ میں تصنع و بناوٹ نام کو نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک سننے والے نے کہا وعظ تو بہت اچھا تھا مگر آواز اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

"میں ڈوم نہیں، ڈوم کی اولاد نہیں، ڈوم کا شاگرد نہیں"

غرضکہ آپ کے حکیمانہ مواعظ حسنہ سے مخلوق خدا کو بہت فائدہ پہنچا۔

قوم کی بہت زیادہ اصلاح ہوئی آج بھی آپ کے سینکڑوں مواعظ مطبوعہ موجود ہیں کہ جس سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔ اگرچہ اب امرور ایام کی وجہ سے بہت سے مواعظ تلف ہو چکے ہیں۔ کاش کہ کوئی ان مطبوعہ مواعظ کی تہذیب و اصلاح کر کے چند مجلدات کی صورت میں طبع کر دے۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہوگا کہ حضرت تھانویؒ کے مواعظ ضائع نہ ہوسکیں گے۔ وہاں یہ بھی فائدہ ہوگا کہ خریداروں اور پڑھنے والوں کے لئے سہولت ہوگی۔ اور اگر کبھی ریسرچ کا کام شروع ہوا تو تلاش و جستجو زیادہ نہ کرنی پڑے گی۔

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف میں علامہ جلال الدین سیوطی کا نام مشہور ہے۔ موصوف کی اس قدر تصنیف و تالیف ہیں کہ دوسرے کی ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن حضرت تھانویؒ اس سلسلہ میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے تمام چھوٹے بڑے رسائل کی تعداد ۸۰۴ ہے اور مواعظ مطبوعہ کی تعداد ۳۱۲ ہے۔ اس طرح کل مجموعہ کی تعداد ۱۱۲۲ ہے۔

ان میں حضرت تھانویؒ نے دین کے ہر گوشہ پر لکھا اور اتنا لکھا کہ اب ضرورت لکھنے کی باقی نہ رہی۔ آپ کی معرکۃ الآرا تالیفات میں بہشتی زیور اور بیان القرآن ہیں۔ بہشتی زیور کے متعلق تو میں نے اپنے ایک ہم سبق سے سنا ہے جو افریقہ کا رہنے والا تھا۔ کہتا تھا کہ ہمارے یہاں بہشتی زیور کا وہی مرتبہ ہے جو ہندوستان میں صحیح بخاری کا ہے۔

بہشتی زیور اگرچہ شروع میں عورتوں کے لئے تالیف کی گئی تھی۔ مگر اس کی افادیت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر گھر میں موجود ہے۔ اور علماء و غیر علماء سب کو برابر فائدہ پہونچ رہا ہے۔ بہشتی زیور محشی ہو جانے کی وجہ سے

علمار کے لئے بھی علمی تحفہ ہوگیا ہے۔ مگر ابھی کافی نظر وتصحیح وتہذیب وترتیب کی محتاج ہے۔ کاش کہ کوئی اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرے۔

ہمارا مشورہ حضرت تھانویؒ کی تالیفات کے بارے میں بھی یہی ہے کہ تمام رسالوں کو مختلف عنوان کے ماتحت ایک کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مواعظ وتالیفات کے ذریعہ جتنی دین کی خدمت کی ہے اور قوم کا سُدھار کیا ہے کسی دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں ہے

پس ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ حضرت تھانویؒ کے مزاج میں بہت زیادہ سختی تھی' غلط ہے اور لوگ جھک مارتے ہیں جو ایسا کہتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ تعلیم وتربیت اور تصنیف وتالیف کے اس اہم کام کو انجام نہ دیتے تو آج عام مسلمان دین کے صحیح رُخ سے واقف نہ ہوتے، رسومات وبدعات وخرافات کو ختم کرکے احیار سنت واجرائے سنت حضرت تھانویؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت تھانویؒ نے دین کے ان مسائل واحکامات پر عمل کرکے اور ان کا اجرا رفرماکر کہ جن کو آج مذہبی مالیخولیا کا نام دیا جاتا ہے۔ دکھلا دیا اور بتلا دیا کہ انسانوں کے رہنے کے یہ طریقے ہوتے ہیں ان کے علاوہ جو طریقے اختیار کئے جائیں گے وہ طریقے انسانوں کے نہیں بلکہ چوپاؤں کے ہوں گے۔ بلاشبہ حضرت تھانویؒ حکیم الامت تھے۔

وصال

۸۲ سال ۳ ماہ گیارہ دن دنیا کو اپنے وجود مسعود سے متبرک اور منور فرمانے کے بعد آپ کا وصال ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ ہجری شب سہ شنبہ یعنی ۱۹ / ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب بعد نماز عشا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ تھانہ بھون میں قبرستان عشق بازاں میں

مدفون ہوئے۔ "وذد والوصفین" تاریخ وصال ہے۔
۱۳۶۲ھ

تحریک دیوبند اور اصلاح اُمت جس تحریک کو اپنے وقت میں کتاب وسنت کے مطابق دین اسلام کی بگڑی ہوئی صورت کو نکھارنے کے لئے رسوم و بدعات کو مٹانے کے لئے دنیا دار صوفیہ اور اغلاط جہلاء سے تصوف کو پاک کرنے کے لئے مُردہ سنت کو زندہ کرنے کے لئے اکابر دیوبند نے بفحوائے حدیث "لا یزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم" اٹھایا تھا۔ اس کی اشاعت کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی۔ اس کو ہندوستان اور بیرون ہند میں صحیفوں اور مواعظ کے ذریعے آپ کے قلم و زبان نے پھیلایا اور کس طرح پھیلایا اس کو مورخ اسلام حضرت مولانا الشاہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی زبان سے سنیئے۔ "اصلاح اُمت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، فاسقوں سے لے کر صوفیوں، درویشوں، زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں استادوں اور مدرسوں تک۔ غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی پیدائش، شادی، بیاہ غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی۔ اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا۔ اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے جانتے پورا سامان مہیا کر دیا۔ اور خصوصیت

کے ساتھ اس فن احسان وسلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے تجدید کی۔ آگے چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دوربین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق وباطل، نیک اور بد، صحیح وغلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا اس کے سامنے دین صحیح تمثال تھی۔ اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں۔ وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہو"

(جامع المجددین ص۲۷ وص۲)

حسن قبول باوجود عزلت پسندی کے آپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں سفر کیا۔ اور ہزاروں مواعظ کے ذریعہ کتاب وسنت کی اشاعت کی جن میں سے تقریباً چار سو پانچ سو مواعظ اسی مجلس میں قلمبند ہوکر طبع ہوگئے اور بار بار طبع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی آپ کے ملفوظات دس پندرہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ اور آج ایک مخلوق کے لئے درس ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خدام کی ایسی قدردان جماعت عطا فرمائی تھی کہ جنھوں نے آپ کی زبان وقلم سے نکلے ہوئے سبق آموز اور پرازہدایت ملفوظات کو قلم بند کرکے شائع کرتے رہنے کا اہتمام رکھا۔ آپ کی ساڑھے چار سو سے زائد تصانیف عربی، فارسی، اردو زبان میں مختلف علوم وفنون میں شائع ہوئیں۔ اور حیات ہی میں درجنوں اڈیشن شائع ہوگئے۔ جن میں اردو زبان میں بہشتی زیور گیارہ حصوں میں ایسا مقبول ہوا کہ آبادی اور علاقہ تو کیا معنی شاید

ہی کسی مسلمان کا کوئی گھران سے خالی رہا ہو۔

آپ کے مرشد نے آپ کو بشارت دی تھی کہ تم کو تفسیر و تصوف سے خاص مناسبت ہوگی۔ چنانچہ آپ کی تفسیر بیان القرآن ضخیم بارہ جلدوں میں نہایت مشہور ہے جس سے آج اساتذہ تفسیر استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کا امداد الفتاویٰ ضخیم جلدوں میں تقریباً سولہ سو (۱۶۰۰) صفحات میں شائع ہو چکا ہے جو آج کل مفتیان عظام کے لئے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے۔ اور اس میں حوادث الفتاویٰ کا باب آپ کی شان تجدد کا مظہر بنا ہوا ہے۔ اور ترجیح الراجح اخلاص وتدین کا نایاب مرقع ہے جس میں آپ نے اپنے فتاویٰ و تصانیف کی غلطیوں کو خود ذاتی رائے سے محسوس فرما کر یا کسی اہل علم کی اطلاع کے بعد رجوع کیا ہے۔ اور اس رجوع اور آخری محقق رائے کو بلا خوف لومۃ لائم شائع کر کے اسوۂ متقدمین کو زندہ کیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لئے غلطی پر جمود اور ہٹ دھرمی کی مذمت اور رجوع الی الحق کا حق و صحیح طریقہ ظاہر کر دیا۔

تصوف و سلوک میں آپ نے بہت سے مضامین و رسائل شائع کئے۔ جن میں قصد السبیل، تعلیم الدین، آداب المعاشرت التشرف والتکشف، امتیازی شان رکھتے ہیں۔

مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت میں احتساب ومواخذہ فرماتے تھے اور حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ تو بارہا نقل فرماتے "کہ مربی وہ ہے جس کا دین انبیاء کا سا ہو۔ تدبیر اطبا کی سی اور سیاست بادشاہوں کی سی"۔ خوب کہا ہے کہنے والے نے کہ:۔

ے اے قبائے رہنمائی راست بر بالائے تو
علم وحکمت راشرف از گوہر بالائے تو

نیز بذریعہ خطوکتابت عرض حال اور حصول ہدایت کے طریقے سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر مسترشدین کو فیض پہونچاتے رہے۔ ان خطوط سے ہزاروں صفحات کی کتاب جو "تربیت السالک" کے نام سے مشہور ہے ضخیم مجلدات میں تیار ہوگئی۔ اور اس طرح قیامت تک اُمت کے لئے ہدایت کا سامان ہوگیا۔

تھانہ بھون کے مستقل قیام کے چند روز بعد ہی مرشد کی اُجڑی ہوئی خانقاہ (خانقاہ امدادیہ) ذاکرین و شاغلین کا مرکز بن گئی۔ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے آپ نے دین کے بعض ابواب کا رجوع کی طرف خود دیندار طبقہ کو بھی احساس نہیں رہا تھا (یا کماحقہٗ نہیں تھا) خاص اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حقوق العباد کی ادائیگی۔ اخلاق اور حسن معاشرت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ ان ابواب پر خاص تصانیف بھی فرمائیں۔ اور مجلس میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔ عتاب اور مواخذہ کے ذریعہ غافل قلوب کو متوجہ فرمانے کی سعی فرماتے۔ اگر کوئی صاحب اس طریقِ اصلاح کی ندرت کو ظاہر کرتے کہ اور جگہ یہ دارو گیر اور مواخذہ کا طریقہ نہیں ہے۔ تو فرماتے۔ "کہ اوروں کے یہاں برکت ہے اور میرے یہاں حرکت ہے جس کو یہ طریقہ پسند نہ ہو۔ میں بلانے تھوڑا ہی جاتا ہوں۔

ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

رسوم بدعات اور تمام منکرات کو محض علمی طریقہ پر سمجھا دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ عملاً پہلے اپنے گھر سے اور اپنی ذات سے ان کو مٹانے کی سعی فرماتے۔ رسوم و منکرات کی مجلس میں شرکت نہیں فرماتے تھے۔ اگر لاعلمی میں عین وقت پر کسی مجلس میں منکرات کا علم ہوا تو بہ لطائف الحیل فوراً علیحدگی اختیار فرما لیتے۔ اور اپنی علیحدگی کی وجہ بھی مناسب عنوان سے ظاہر فرما دیتے۔ تاکہ اور اہل حس بھی ہدایت پاسکیں۔ اس طریقہ پر رسوم موت و شادی کی ناجائز اور

غیر ضروری پابندیوں میں فضول خرچی سے برباد ہو جانے والے ہزاروں خاندانوں اور افراد کو تباہی سے بچا لیا۔

آپ کا تصوف

دربار اشرفیہ میں نہ تو روایتی صوفیوں کی طرح دعوے کئے جاتے تھے نہ مجذوبوں کے سے احکام جاری ہوتے تھے۔ نہ کشف و کرامات کے چرچے سننے میں آتے تھے نہ خوابوں اور کیفیتوں کے تذکرے ہوتے تھے نہ فرائض کی طرح ذکر اور شغل کا اہتمام نظر آتا تھا کیونکہ وہاں ہر وقت اور ہر حال میں کتاب سنت کی تعلیم دی جاتی تھی جو دراصل روح تصوف اور جان طریقت ہے۔ اسی لئے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا۔

"یہاں تو ملاپن ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ درویشی کیا چیز ہے۔ طالب علم ہیں، صاحب علم بھی نہیں۔ بس قرآن و حدیث پر عمل کرنا بتاتے ہیں۔ پھر اس میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے۔ مل جاتا ہے اور الحمد للہ ایسا ملتا ہے کہ مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علیٰ قلب بشر۔ مگر ظاہر میں کچھ نہیں نہ ہو حق ہے نہ وجد و حال ہے اور نہ کشف و کرامات!"

"میرے یہاں ضربیں لگوانے کا دستور نہیں کہ تھوڑی دیر محنت کرلی۔ پھر آزاد پھرتے رہے۔ میرے یہاں تو وہ آوے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلاتے ہوں۔ اور قدم قدم پر فکر ہو کہ کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز۔"

یہاں تک کہ بعض صوفیائے کرام کی طرح آپ کے یہاں توجہ دینے کا بھی قطعاً کوئی التزام نہ تھا۔ بلکہ آپ نے ایک دفعہ اس کی بڑے زور سے تردید فرمائی۔ کہ

"مجھے اپنی ہی فکر سے فرصت نہیں، دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کی مجھے کہاں توفیق، میں تو اس توجہ متعارف کو تکلف ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اپنی

توجہ ہر طرف سے ہٹا کر ایک خاص شخص کی جانب جو مخلوق ہے ہمہ تن متوجہ ہو جانے میں غیرت آتی ہے۔ کیونکہ یہ حق تو خاص اللہ ہی کا ہے کہ سب طرف سے توجہ ہٹا کر بس اس ایک ذات واحد کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ البتہ دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تعلیم کرنا۔ اور دل سے یہ چاہنا کہ طالبین کو نفع پہونچے۔ اور ان کی دینی حالت درست ہو جائے۔ یہ توجہ کا ماثور طریق ہے۔ اور یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اور یہ نفع اور برکت میں بھی توجہ متعارف سے کہیں بڑھ کر ہے۔

باایں ہمہ اکثر لوگوں کا گمان بلکہ یقین تھا کہ جو لوگ حضرت سے طریقہ کے ساتھ اپنی اصلاح کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب انھیں کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے اور اپنے قلوب میں بھی حاضرانہ بلکہ غائبانہ بلکہ کسی ظاہری سبب کے کیفیات خاصہ محسوس کرتے رہتے ہیں یہ سب حضرت کی نظر و توجہ کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں کے شبہات کے ازالہ کے لئے آپ نے فرمایا کہ! یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بغیر قصد توجہ کئے ہوئے اثر کیسے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے محض قلوب ہی کے اندر تعدیہ کی صفت رکھی ہے۔ جیسے کہ گو آفتاب کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اس کا نور دوسروں کو پہونچے۔ لیکن پھر بھی اس کا نور دوسروں کو پہونچتا ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کے اندر یہ صفت رکھ دی ہے کہ جو شے اس کے مقابل میں آجاتی ہے وہ منور ہو جاتی ہے۔"

مخالفین کے ساتھ معاملہ

مخالفین سے ایسے نرم و مہذب اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش نہ کر سکے۔ مخالفین سے ایسا نرم سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ

۔ آپ ان لوگوں کے جذبات کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک اور موقع پر آپ نے ایک ایسی شکایت کے جواب میں لکھا ہے کہ:۔

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں (ایذا دینے والوں) کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں۔ اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ کافر، خبیث، ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں۔ ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا۔ اس میں مجھ کو گدھا تک لکھا ہوا ہے۔ مگر میں ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔ اپنی زبان قلم یا قلب کو ملوث کیا۔ میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔ ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو۔ مثلاً امر بالمعروف نہی عن المنکر اس لئے وہ معذور ہو۔ گو ہم بھی اس لئے معذور رہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں، یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہمارے نزدیک اس سے سہل اور اسلم ہو۔ اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا۔ تو اپنی عاقبت خراب کی۔ ہم کو صبر کا ثواب ملا نیز ایسے واقعات سے کبھی بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا یا ہو سکتا تھا اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔"

اعتراف مخالفین

حضرت کا چونکہ ہر قول و فعل مطابق کتاب و سنت ہوتا تھا۔ اس لئے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی اس بات

کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانویؒ بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔
ایک مرتبہ ایک غیر مقلد صاحب کسی کام کے سلسلہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے واپس جاکر انھوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر اپنے ایک ملنے والے سے کہا:۔

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباع سنت تو ہم نے وہاں دیکھا۔ ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو خود اٹھ کر کتبخانہ سے لائے۔ کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ سبحان اللہ کیا اتباع سنت ہے۔ اور کتنی تواضع ہے کہ بلاتکلف خود اٹھ کر لے آئے۔

آپ کی خدمات کا اعتراف

اس سلسلہ میں آپ کی وفات پر ایک علمی مجلہ کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"یوں تو موت اس عالم آب و گِل کی ہر اس چیز کے لئے مقدر ہے۔ جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں۔ جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں کی عمارت حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پُرسکون آبادیاں ایک مستقل غمکدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتشکدے سرد ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ اس حادثہ جانکاہ نے کائنات عالم کی ہر ہر چیز کو داس اور غمگین بنا دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا :

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

(قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہوگئی ۔)

گذشتہ ماہ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ ۱۹ اور ۲۰ کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو سانحۂ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے، طریقت وسلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے۔ اُن کی ذات علوم ظاہری، وباطنی کا مخزن تھی علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ اُن کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم وفضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے تھے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انھیں کسی لومۃ لائم کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا "آستانہ" بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحاب علم وفضل کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا اخلاص و دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیاوی وجاہت اور شہرت مالی حرص آرزو کا شاید دل کے آس پاس بھی گزر نہ ہوا۔ اپنے اصول اور عقیدہ وخیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کرسکتی تھی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت وروحانیت کا ایک ایسا چشمۂ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔ وہ جن کی

زندگیاں معصیت کوشی اور عصیان آلودگی میں بسر ہوتی تھیں۔ یہاں سے پاک وصاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامنِ آرزو کو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں علمار ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا لیکن تقویٰ وطہارت، تفقہ فی الدین، علوم شرعی میں مہارت و بصیرت، راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین، بے غرضانہ تلقین رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلّم رہے۔ بعض عوارض واسقام کی بنا ر پر گوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطال رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے۔ قوم نے اُن کو "حکیم الامت" کا خطاب دیا تھا۔ اور بالکل بجا و بالکل بجا تھا حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خزف ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے۔ اور جو صرف پیتل تھے وہ زر خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں۔ ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں سے کثیر تصانیف ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں اڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ کہ مولانا کی تصانیف جو اب تک طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ

روپے سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوجود آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت وطبع اپنے لئے محفوظ نہیں رکھا ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذن عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے۔ جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لئے سرمایۂ عبرت اور دورس عبرت وعظمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء، ارباب شریعت اور اصحاب ظاہر و باطن، مرد و عورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اُردو خواں، ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اور اپنے لئے اصلاح ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار ونکات کے علاوہ ایسا عجیب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق وتائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگو غیر معمولی ذکاوت ومتانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا۔ اور ہر معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لئے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی مولانا رومؒ اور عورتوں کے لئے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع تصانیف ہیں۔ کہ جو اپنی مخصوص نوعیت سے اُردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی ہے۔ کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اُردو خواندہ ہو گا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

استغناء اور توکل | اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور کمالات باطنی

کے ساتھ استغنا اور توکل کی نہایت ممتاز اور یگانۂ روزگار دولت عطا فرمائی تھی۔ آپ کا استغنا صرف آپ کی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ مستغنی کر تھے کہ تمام اہل علم اور دیندار وں کو مستغنی دیکھنا چاہتے ہیں مستغنی بنانا چاہتے تھے۔ آپ کی خانقاہ اصلاح اعمال و اخلاق اور تربیت باطن کی درسگاہ تھی۔ وہاں طالبان حق اپنے امراض باطنی، کبر و نخوت، غرور، غصہ، وساوس وغیرہ لے کر آتے تھے۔ اور علاج کے لئے پیش ہوتے تھے۔ اور یہاں سے مناسب نسخے تجویز کئے جاتے تھے۔ اور شفایاب ہوتے تھے حکیم الامت رح نے ضرورت سمجھ کر اپنی خانقاہ میں مسئلہ مسائل اور ابتدائی معلومات کے لئے "امداد العلوم" کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں نہایت مختصر نصاب" ضمان التکمیل فی زمان القلیل " کے نام سے جاری کیا۔ تاکہ ذاکرین ظاہری علم سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

اس مدرسہ کا مدار بھی توکل پر رکھا۔ جو بحمد للہ اب تک حسب وصیت اسی اصول کے ماتحت جاری ہے۔ اس کے مدرسین اور ملازمین کی تنخواہ مقرر تو کر دی جاتی ہے۔ لیکن تنخواہ کی ادائیگی کی ذمہ داری نہیں لی جاتی۔ تقرر کے وقت ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ گنجائش ہوگی تو دی جائے گی۔ گنجائش نہ ہوگی عذر کر دیا جائے گا۔ اسی لئے قبض الوصول ہی نہیں ہے۔ چندہ کی تحریک کی ہمیشہ کے لئے ممانعت ہے۔ البتہ بلا تحریک جائز رقم یہاں کے اصول کے مطابق آجائے تو قبول کی اجازت ہے لیکن رسید نہیں دی جاتی۔ جس کو اعتماد ہو چندہ دے، اعتماد نہ ہو نہ دے۔ خرچ کو آمدنی کے اندر رکھنے کی وصیت ہے۔ آمدنی کم ہو جائے تو خرچ بھی کم کر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے کبھی اس کی نوبت نہیں آئی، کہ تنخواہ صحیح وقت پر یکم تاریخ کو ادا نہ ہوئی ہو۔

اس استغنار اور توکل ہی کی برکت تھی۔ کہ بڑے بڑے اہل جاہ وثروت مدبّر اور فلسفی، نو تعلیم یافتہ سائنسدانی کے دعویٰ داروں کو جب آپ سے گفتگو یا مکاتبت کا واسطہ پڑتا تو چند ہی منٹ کی گفتگو یا دو ایک ہی مکاتبت میں ان کو اپنا پندار اپنا علم اپنی جاہ وثروت، اپنی سائنس دانی محض غرور اور دھوکہ کی پوٹ محسوس ہونے لگتا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں اللہ والوں اور رسولؐ کے نائب کا صحیح مقام پیش نظر ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ آپ کو ذیل کے دو واقعات سے معلوم ہوگا۔

حضرت تھانویؒ یہ برداشت نہ کرتے تھے کہ کوئی علمائے حق کو گری ہوئی نظر سے دیکھے۔ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو جاتی تو ایسا سبق پڑھاتے کہ وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ایک کانفرنس کے سلسلہ میں آپ کو ڈھاکہ مدعو کیا گیا۔ آپ نے شرح صدر نہ ہونے کی وجہ سے عذر فرما دیا لیکن نواب صاحب ڈھاکہ اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ نے کچھ شرطوں کے ساتھ منظور فرما لیا۔ ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی نواب صاحب کی دعوت پر آپ تشریف لے جا چکے تھے۔

اصرار پر آپ نے سفر کا ارادہ تو کر لیا۔ لیکن فراست سے آپ محسوس فرما رہے تھے کہ سفر کا پورا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ سے کیا۔ کلکتہ پہونچے تو نواب صاحب نے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ وہاں طعام وقیام کا شایان شان انتظام کیا۔ اور حضرت والا سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں نواب صاحب کے عزیز جو خود بھی بہت بڑے رئیس تھے حضرت سے کہنے لگے۔ کہ آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی

سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی شرط کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے۔
حضرت نے فرمایا۔ نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہو سکتا ہے۔ نہ دینا کیا مشکل ہے۔

رئیس نے عرض کیا۔ صاحب! جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کو تو ہدیہ دینے کے لئے جی چاہتا ہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کیجائے۔

حضرت نے جواب دیا "یہ ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جا کر یا بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جا سکتا ہے۔

رئیس ہونا اور بات ہے اور سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنا نہ آئی۔ اور نخوت سے کہا۔ جناب معاف فرمایئے۔ پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔

نخوت کا علاج

حضرت تھانویؒ کو یہ کلمات سنکر بہت رنج ہوا۔ مگر آپ نے ناگواری کو ظاہر نہیں کیا۔ اور نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب کیا کہ:۔

"آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے۔ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے، اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے۔ اس لئے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں۔ دین اور دنیا۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے (یعنی دنیا) اور آپ کی حاجت کی ایک چیز ہمارے پاس ہے (یعنی دین) فرق اتنا ہے کہ ہماری حاجت کی جو چیز آپ کے پاس ہے یعنی دنیا وہ اللہ تعالیٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ آپ ہمارے محتاج ہوئے یا ہم آپ کے آپ پیاسے اور ہم کنواں ہوئے

یاہم پیاسے اور آپ کنواں ہوئے۔ وہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے حضرت والا نے وہیں سے قطع سفر کا ارادہ کر لیا.... اور واپس تشریف لے آئے۔

(۲) آپ حیدر آباد اپنے ایک اہل علم دوست کی فرمائش پر تشریف لے گئے۔ سات ہی روز گذرے تھے کہ ایک نواب فلاں نواز جنگ کا پرچہ آیا۔ جو نواب صاحب حیدر آباد کی ناک کا بال اور ارکان سلطنت میں سے تھے لکھا تھا کہ "عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہیں ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

آپ نے جواب لکھا "بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی محبت و عظمت ہے۔ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا۔ اور خود آزاد رہے۔ یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواب صاحب نے اپنی کج فہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمائیں۔ اس پر حضرت نے ان کو ایک اور سبق دیا۔ کہ اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کر لیں۔

اس پر انھوں نے لکھا بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں اب نہ اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں جس وقت فرصت ہوگی، حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ

آؤں گا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ اصلاح پذیر ہوگئے ہیں تو دوبارہ کے طور پر لکھا اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیے۔ ورنہ مجھ کو اجازت فرمائیے خود حاضر ہو جاؤں۔ غرضیکہ وہ خود آئے

آپ نے فرمایا کہ میرا یہ طرز عمل اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں اہل دین کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہل علم کی یہ شان ہے۔ کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محفوظ رکھا۔ ملاقات کے دوران میں وہ نواب صاحب حیدر آباد کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا۔ کہ اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے۔

آپ نے پوچھا یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا کہ میری خواہش ہے۔ آپ نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے مناسب یا غیر مناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کہا نواب صاحب کا، میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ مطلوب کو طالب اور طالب کو مطلوب بنایا جا رہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں خود عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں۔ مضرت ہی مضرت ہے نفع کچھ نہیں۔ اگر میں ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ اس صورت میں ان کو مجھ سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس جو چیز ہے وہ مجھے ملے گی یعنی دنیا، وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے۔ اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین،

اوراگرمیں گیا بھی اور جو اُن کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب۔ وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گیا تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف، اگر قبول نہیں کرتا تو آدابِ شاہی کے خلاف، کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سُبکی اور اہانت ہوگی۔ اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں۔ اس کی پاداش میں اخراج وغیرہ جو چاہیں میرے لئے تجویز کرسکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا۔

حضرت مولانا الشاہ محمد الیاس صاحبؒ کاندھلویؒ

از ۱۳۰۳ھ تا ۱۳۶۳ھ

نام و ولادت آپ کا تاریخی نام اختر الیاس اور سن ولادت ۱۳۰۳ھ ہے آپ مولانا محمد یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے تین صاحبزادے۔ مولانا محمد صاحبؒ، مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ، مولانا محمد الیاس صاحبؒ تھے۔ جن میں آپ سب سے چھوٹے ہیں۔

آپ کا بچپن اسی مقدس گھرانے میں گزرا ہے جس کا ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔ امی بی[1] حضرتؒ کی نانی کو آپ سے بہت محبت تھی۔ فرمایا کرتی تھیں "اختر مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے" کبھی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر فرماتیں "کیا بات ہے؟ تیرے ساتھ مجھے صحابہؓ کی سی صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے "میں جب مولوی محمد الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہ یاد آتے ہیں۔

---

[1] امی بی مولانا کی نانی بی امۃ الرحمٰن جو مولانا مظفر حسین صاحب کی صاحبزادی تھیں اور جن کو خاندان میں عام طور پر امی بی کے نام سے یاد کرتے تھے ایک رابعہ سیرت بی بی تھیں ان کے بارے میں ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا کہ ان کی نماز کا نمونہ میں نے حضرت گنگوہیؒ کی نماز میں دیکھا۔ (اور مولانا گنگوہیؒ کی نماز اپنے طبقہ میں ممتاز تھی) آخیر زمانہ میں ان کا یہ حال تھا کہ خود کھانا کبھی نہیں طلب فرماتی تھیں کسی نے لاکر رکھ دیا تو کھالیا۔ گھر بڑا تھا اگر کام کی کثرت اور زیادتی مشغولیت کی وجہ سے خیال نہ آیا تو یوں ہی بیٹھی رہتیں۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آپ ایسے ضعف کی حالت میں کیسے بے کھائے رہتی ہیں۔ فرمایا الحمد للہ میں تسبیحات سے غذا حاصل کرلیتی ہوں۔ (مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت ص۲۰۴)

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم تو کاندھلہ ہی میں ہوئی لیکن والد صاحب بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ اور بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب شوال ۱۳۱۱ھ سے گنگوہ آستانہ عالیہ رشیدیہ پر حاضر رہتے تھے اس لئے گھر کوئی معقول انتظام نہ ہوسکا تھا جس کی وجہ سے حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب ۱۳۱۴ھ یا ۱۳۱۵ھ میں آپ کو اپنے ہمراہ گنگوہ لے گئے اور پڑھانا شروع کر دیا اس وقت گنگوہ اولیاء اللہ و صلحاء امت اور علماء کرام کا مرکز تھا۔ ان متبرک اور مقدس مجالس میں رہ کر آپ نے تعلیم بھی پائی اور تربیت روحانی بھی حاصل کی۔ کیونکہ ؎ صحبت صالح ترا صالح کند

کچھ دنوں کے بعد آپ بیمار پڑ گئے اور سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ کامل سات برس تک علاج ہوا۔ معالج حکیم مسعود احمد صاحب صاحبزادہ حضرت گنگوہیؒ تھے۔ وہ اکثر اپنے معالجہ میں پانی بند کر دیتے تھے۔ بہرحال سات سال بعد صحتیاب ہوئے اور ۱۳۲۶ھ میں آپ نے حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث پڑھا اس کے بعد اپنے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب سے بھی دورہ حدیث پڑھا۔

سلوک و تصوف آپ کے سلوک و تصوف کی ابتداء زمانہ طفولیت ہی سے ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کے ہم عمر اور ہم مکتب ریاض الاسلام صاحب کاندھلویؒ فرماتے ہیں:۔ کہ

"جب ہم مکتب میں پڑھتے تھے ایک دن آپ لکڑی لے کر آئے اور کہا آؤ میاں ریاض الاسلام چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں۔ الخ"

(سوانح مذکور ص۱۲)

اسی طرح جب آپ گنگوہ تشریف لے گئے تو رات کو اٹھ اٹھ کر حضرت گنگوہیؒ کی صورت دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اتنا شدید تعلق آپ کو ہو گیا تھا۔ کہ فرماتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ میں نے بھائی سے کہا کہ اگر حضرت اجازت دے دیں تو میں
حضرت کے قریب بیٹھ کر مطالعہ کیا کروں، مولانا محمد یحییٰ صاحب نے
حضرت مولانا سے ذکر کیا۔ فرمایا مضائقہ نہیں، الیاس کی وجہ سے
میری خلوت میں فرق اور طبیعت میں انتشار پیدا نہیں ہوگا۔"
(سوانح مذکور ص۲۲)

اس قلبی تعلق کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ بالعموم بچوں کو بیعت نہیں کرتے تھے۔ مگر آپ کو بیعت کر لیا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد آپ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت ہوگئے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت جہاد بھی کی تھی۔

ذکر و شغل، نوافل و عبادات سے آپ کو ابتدا ہی سے شغف تھا۔ مزید برآں یہ کہ حضرت گنگوہیؒ کی صحبت کیمیا تاثیر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ قیام گنگوہ کے زمانہ میں حضرت شاہ عبدالقدوس صاحبؒ کے مزار پر گھنٹوں مراقب رہتے۔ اور جب نظام الدین تشریف لائے تو علاوہ اوقات درس کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی قیام گاہ عرب سرائے کے پھاٹک میں گھنٹوں خلوت میں رہتے۔ بہرحال آپ کو طریقت میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی جانب سے اجازتِ بیعت حاصل ہے۔ اور آپ مولانا قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔

تدریس: جن دنوں آپ کا قیام گنگوہ شریف میں تھا۔ ان ہی ایام سے آپ نے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت امام ربانی کا وصال ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ظلہٗ نے ابتدائی فارسی آپ ہی سے پڑھی ہے۔

شوال ۱۳۲۸ھ میں جب مظاہر علوم سہارنپور کے بڑے بڑے اساتذہ حج

کے لئے تشریف لے گئے تو ان کی عدم موجودگی میں جدید اساتذہ کی تقرری میں آپ کا تقرر بھی ہوا۔ حضرات حجاج کی واپسی پر ادراساتذہ تو سبکدوش کر دیئے گئے۔ مگر آپ بدستور درس دیتے رہے۔ ۱۳۳۶ھ میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد صاحبؒ کے انتقال کے بعد آپ نظام الدین تشریف لے گئے۔ اور اسی قدیم بنگلہ والی مسجد میں کہ جس میں والد صاحب اور بھائی صاحب قیام فرما چکے تھے، قیام فرمایا۔ اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اصلاحِ امت یا فریضۂ تبلیغ

انبیاء ورسل کی بعثت اور آسمانی کتابوں وصحیفوں کے نزول کا سبب صرف اصلاح الناس اور انسانوں کا خالق سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ آسمانی کتابوں کا بیشتر حصہ اسی دعوت پر مشتمل ہے۔ اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی جدوجہد میں صرف ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کے تیسوں پارے اور احادیث نبوی کے ذخائر اس پر شاہد عدل ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ قیامت تک کے لئے سلسلۂ نبوت ورسالت ختم ہو چکا تھا اس وجہ سے آپ کے صحابہؓ اور علماء امت نے دعوت اصلاح وتبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ اسی خصوصیت وصفت کی قرآن پاک نے بھی توصیف کی ہے۔

کنتم خیرا امۃ اخرجت	تم اے مسلمانوں بہترین امت ہو جو لوگوں
للناس تامرون بالمعروف	کیلئے ظاہر کی گئی ہو کر اچھے کاموں کا حکم
وتنھون عن المنکر۔	کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو

لہٰذا ابتداء سے الی یومنا ہٰذا علماء وصلحاء امت کی ایک بڑی جماعت خالص اسی کام کے لئے وقف رہی ہے۔

ولتكن منكم امة يدعون	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی
الى الخير ويامرون	چاہیئے۔ جو اچھے کاموں کی تعلیم
بالمعروف وينهون عن	دے اور برائیوں سے باز رکھے
المنكر واولئك هم	اور یہ وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے
المفلحون۔	والے ہیں۔

لہٰذا ہندوستان میں بھی مفلحین کی جماعت میں دو قسم کے افراد تھے اور ہیں ایک وہ لوگ جو مدرسوں اور مسجدوں میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اور دوسرے وہ لوگ جو چل پھر کر لوگوں کو اصلاح و تقویٰ کی دعوت دیتے اور خود بھی عمل کرتے اور دوسروں سے بھی عمل کراتے۔ اس میں صوفیاء اور فقراء داخل ہیں۔ الحاصل مدرسین و مبلغین دونوں مفلحین میں داخل ہیں۔

مولانا کا تبلیغی ذوق تبلیغی و اصلاحی ذوق آپ کا موروثی اور خاندانی اور فطرتی ہے۔ چنانچہ آپ کے والد ماجد قدس سرہٗ کے متعلق مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی فرماتے ہیں۔

"ذکر و عبادت آئے گئے مسافروں کی خدمت اور قرآن مجید و دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا۔ خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ادھر آنکلے ان کا بوجھ اُتار کر رکھتے اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کران کو پانی پلاتے۔ پھر دو رکعت نماز شکرانہ بھی ادا کرتے۔ کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی۔ میں اس کا قابل نہ تھا۔ عام اجتماع و ہجوم کے زمانہ میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے الخ ص۳۵"

ایک مرتبہ آپ تلاش و فکر میں نکلے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا نظر پڑے

تو اس کو مسجد میں لے آئیں اور اس کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لیں۔
چند مسلمان مسافر نظر آئے اُن سے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ انھوں نے
کہا کہ مزدوری کے لئے، کہا کیا مزدوری ملے گی انھوں نے بتایا۔ فرمایا اگر
اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی
کیا ضرورت ہے۔؟ انھوں نے منظور کرلیا۔
آپ ان کو مسجد میں لے آئے اور نماز سکھانے اور قرآن شریف پڑھانے
لگے۔ اور یومیہ مزدوری ان کو دیدیتے اور ان کو پڑھنے لکھنے میں مشغول
رکھتے۔ کچھ دنوں کے بعد نماز کی عادت پڑگئی۔ اور مزدوری چھوٹ گئی۔
یہ بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ کی بنیاد تھی۔ اور یہ پہلے طالب علم تھے۔ اس
کے بعد دس، بیس میواتی طالب علم برابر مدرسہ میں رہتے۔ اور ان کا
کھانا مرزا الٰہی بخش مرحوم کے یہاں سے آتا۔

(مولانا الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت ص۳۳)

والد بزرگوار کی یہ امتیازی خصوصیت تمام بھائیوں میں نمایاں رہی۔ چنانچہ حضرت
مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی بچپن کی حکایت بروایت ریاض الاسلام صاحب
گذشتہ سطور میں مرقوم ہوچکی ہے۔

میوات سے تعلق

میوات سے تبلیغی و اصلاحی تعلق جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے
والد بزرگوار کے زمانہ سے ہی قائم ہوچکا تھا یہی تعلق برے
بھائی مولانا محمد صاحبؒ کے زمانہ میں باقی رہا۔ اور آپ نے تو اس تعلق کو اتنا وسیع
کیا کہ میوات سے نکل کر یہ سلسلہ پورے ہندوستان اور بیرون ہندوستان پھیل گیا۔
اور آپ نے جاہل اور مذہب سے ناآشنا میواتیوں میں ایمان و اسلام کی روح
پھونک کر وہ کام لیا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلان عرب سے لیا تھا۔

میواتی جو اَب حضرت مولانا قدس سرہٗ کی کوششوں کے باعث پکے مومن اور جانباز مسلمان بن گئے ہیں ۔ اور جن کی نورانی پیشانیوں سے نورِ ایمان کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں دراصل ایسے نہ تھے ، اس حقیقت کو ہم مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی تالیف "حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت" سے بیان کرتے ہیں ۔"

میجر پاؤلٹ جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندولبست رہا ہے ۔ الور کے گزیٹیر شائع شدہ ۱۸۷۸ء میں لکھتا ہے ۔

" میو اب تمام تر مسلمان ہیں لیکن برائے نام ' ان کے گاؤں کے دیوتا وہی ہیں جو ہندو زمینداروں کے ہیں ۔ وہ ہندوؤں کے کئی ایک تیوہار مناتے ہیں ۔ ہولی میواتیوں میں مذاق اور کھل کھیلنے کا زمانہ ہے ۔ اور اتنا ہی اہم اور ضروری تیوہار سمجھا جاتا ہے ۔ جتنا محرم ، عید اور شب برات ۔ اسی طرح وہ جنم اشٹمی ، دسہرہ اور دیوالی بھی مناتے ہیں ۔ ان کے یہاں پیلی چٹھی لکھنے کے لئے یا شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے برہمن پنڈت بھی ہوتے ہیں ۔ ایک رام کے لفظ کو چھوڑ کر وہ ہندوانہ نام بھی رکھتے ہیں ۔ اگرچہ خان ان کے ناموں کے اخیر میں ہوتا ہے ۔ لیکن پھر بھی سنگھ بکثرت ان کے ناموں کے آخیر کا جزو ہوتا ہے ۔"

اماوس میں میو بھی ہندو اہیروں اور گوجروں کی طرح چھٹی مناتے اور کام کاج بند کر دیتے ہیں ۔ جب وہ نیا کنواں تعمیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے بیرجی اور ہنومان کے نام کا چبوترہ بناتے ہیں ۔ البتہ جب ان کو مالِ غنیمت حاصل کرنا ہوتا ہے تو وہ ہندو استھانوں اور مندروں کی زیادہ تعظیم و تقدیس نہیں کرتے اور جب اس موقعہ پر ان استھانوں اور مندروں کا تقدس

ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ ہم "دیو ہم میو" میو اپنے مذہب اسلام سے بہت ناواقف ہیں۔ خال خال کوئی کلمہ جانتا ہے۔ اور پابندی سے نماز پڑھنے والے اس سے بھی کم ہیں۔ اور ان کے اوقات و مسائل سے تو وہ بالکل ہی ناواقف ہیں۔

یہ سب الور کے میواتیوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ انگریزی علاقہ ضلع گوڑگانوہ میں مدرسوں کی وجہ سے مذہبی فرائض کی پابندی کی حالت کچھ بہتر ہے۔ الور کے بعض مقامات میں بھی جہاں مسجدیں ہیں۔ مذہبی فرائض کی پابندی کچھ زیادہ ہے اور کچھ لوگ کلمہ بھی جانتے ہیں بعض نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اور مدرسہ کا بھی کچھ شوق پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ شادی کی ابتدائی رسوم میں برہمن حصہ لیتے ہیں لیکن اصل رسم قاضی انجام دیتے ہیں۔ مرد دھوتی اور کمری پہنتے ہیں۔ پاجامہ کا رواج نہیں ان کا لباس حقیقتاً ہندوانہ ہے۔ مرد سونے کے زیورات بھی استعمال کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں۔ ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجدیں ہوتی ہیں تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون ۵۲ گاؤں میں سے صرف آٹھ مسجدیں ہیں۔ البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی جگہیں ویسی ہی بنی ہوئی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانچ پیرا، بھیسا، چاہنڈیا کھیڑا دیو۔ مہادیوی کا نام ہوتا ہے جس پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ شب برات میں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا بھی ہر میو گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔ میو ابھی بہت ڈھیلے اور لاپرواہ قسم کے مسلمان رہے ہیں وہ اپنی ہمسایہ قوم کے اکثر رسم و رواج میں شریک ہیں

ان کا اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جشن اور تیوہار تو دونوں قوموں کے مناؤ،
اور فرائض اور مذہبی پابندیاں کسی ایک کی بھی پوری نہ کرو۔
یہ حالت تھی میوؤں کی کہ جن کی طرف حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اور ان کے خاندان والوں نے توجہ فرمائی اور اپنی تبلیغی و اصلاحی مساعی سے اس قابل کر دیا کہ اب ان کے یہاں بکثرت مساجد، مدرسے ہیں۔ تمام مرد و عورت بچے نماز پنجگانہ کے کیا، تہجد کے پابند، روزہ، نماز، ذکر و شغل و نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اپنے طرزِ معاشرت اور موت و حیات کی تمام رسوم کو شریعت کی روشنی میں ادا کرتے ہیں۔ ان میں اب بکثرت عالم حافظ اور حاجی بھی پائے جاتے ہیں۔ دین کی خدمت کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں۔ اور تبلیغ کے لئے ہندوستان بھر میں نہیں، بلکہ عرب شام، عراق، مصر اور دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں غرضکہ اعلیٰ درجہ کے پختہ کار مومن اور مسلمان ہیں اور اگر یہ کہدیا جائے کہ ہندوستان کے تمام اضلاع میں سب سے زیادہ پکے مسلمان ہیں۔ عاملِ شریعت ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بلکہ میوؤں کی اکثری تعداد اس آیت کا مصداق ہے۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ	ان کی علامت ان کے چہروں پر
أَثَرِ السُّجُودِ	سجدوں کے نشان ہیں۔

طریق کار سب سے پہلے حضرت مولانا قدس سرہٗ نے میوات کی جہالت اور بے دینی کو ختم کرنے کے لئے یہ اقدام کیا کہ وہاں بکثرت مکاتب کھولے۔ ابتداءً اس سے زیادہ دشوار کام کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ میوات میں مکتب کھولنا اتنا ہی دشوار تھا۔ جتنا مشکل پہاڑ سے جوئے شیر نکالنا۔ لیکن مولانا قدس سرہٗ عزم و ہمت کا مجسمہ تھے۔ ہمت نہ ہاری اور فرمایا "تم لوگوں سے پڑھنے کے لئے صرف بچے مانگتا ہوں معلمین کی تنخواہ کا انتظام میں کروں گا" یہ کام بھی میواتیوں کے لئے

نہایت دشوار گزار تھا۔ بہرحال سعی پیہم سے میوات میں مکاتب کا اجرا ہوا۔ اور سینکڑوں مکاتب کھلے جن میں قرآن شریف اور دین کی تعلیم ہوتی تھی لیکن اس کام سے بھی مولانا مطمئن نہ ہوئے کیونکہ وہ جیسا انقلاب چاہتے تھے۔ ایسا انقلاب ان مدارس کے ذریعہ لانا دشوار اور تقریباً ناممکن تھا کیونکہ مدارس سے صرف انفرادی اصلاح کسی درجہ میں ہوجاتی تھی لیکن وہ بھی ظلماتی ماحول ہونے کی وجہ سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوتی۔

اس کے بعد مولانا قدس سرہٗ نے تنخواہ دار مبلغین کو رکھا اور ان سے میوات کے دورے کرائے لیکن یہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ اب مولانا اس نتیجے پر پہونچے کہ جب تک اصلاح کا کام قرن اولیٰ کی نشان دہی اور نقش راہ پر نہ کیا جائے گا اس وقت تک گاڑی چلتی نظر نہیں آتی جس طرح قرن اولیٰ میں بے تنخواہ کے مجاہد اپنے پلے سے ہتھیار اور خوراک لے کر میدان جہاد میں جاتے تھے۔ اور جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ تا وقتیکہ ایسے ہی رضاکار اور مجاہد نہ پیدا ہوں اس وقت تک عوام میں دین کی طلب پیدا ہونا مشکل ہے۔

لہٰذا اس کے لئے آپ نے ایک طرف تو میواتیوں کو طلب دین پر آمادہ کیا۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طلب اور نصرت کے لئے گھر چھوڑنا سکھایا۔ اور دوسری طرف عوام کے قریب علماء کو لائے اور بتلایا کہ یہ کام اُن ہی کا ہے، ان ہی کو کرنا ہے۔ اگر وہ عوام کے قریب نہ ہوئے تو وہ تھوڑے دنوں میں مسلمانوں کی مردم شماری میں ایک قلیل اقلیت ہوکر رہ جائیں گے۔ بہرحال مولاناؒ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اور عوام دونوں اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور کام تیزی کے ساتھ ہونا شروع ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میوات کے علاقہ قصبہ نوح (ضلع گوڑگانواں) وغیرہ مقامات پر عظیم الشان اجتماعات ہوئے اور بڑی کثرت

سے جماعتیں نکلنا شروع ہوئیں ۔ اور کام غیر منقسم ہندوستان کے مختلف صوبوں میں شروع ہوگیا ۔

میوات کی آنے والی جماعتوں کے لئے آپ نے یہ طے کیا کہ وہ ہندوستان کے دینی مراکز (دوآبہ) میں جائیں اور وہاں کے علمار کی صحبتوں سے فیضیاب ہوں ۔ ادھر دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور کے علمار کو تبادلہ خیال کرکے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ میوات جائیں اور کام کی رفتار دیکھیں اور اپنے فیوض و برکات سے ان علاقوں کو منور کریں ۔ چنانچہ ان دینی مراکز میں جماعتیں گئیں ۔ اور علماء کی صحبتیں حاصل کیں ۔ اور علماء میوات گئے اور اپنے فیوض و برکات سے میوات کو منور کیا ۔ اور جو چیز مولاناؒ چاہتے تھے ۔ وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک کر سامنے آئی اور بے دینی کی چادر ظلمات کو چاک کرکے پھینکدیا ۔

عرب میں دعوت

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی خواہش تھی کہ اگر یہ کام ہندوستان میں جم جائے تو پھر عرب میں اس کام کو شروع کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ یہ وہاں ہی کی سوغات ہے ۔ اور وہاں کے آدمی ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں ۔ اگر وہاں یہ کام رواج پاگیا تو وہاں سے دنیائے اسلام میں پھیلنا آسان ہوجائے گا ۔ چنانچہ ۱۹۵۶ھ میں آپ اسی داعیہ کے ماتحت حج کے لئے تشریف لے گئے ۔ اور مکہ معظمہ پہونچکر ہندی تجار ..... اور عرب کے اہل الرائے حضرات سے ملاقاتیں کیں ۔ اس سلسلے میں بادشاہِ عرب سے بھی ملاقات ہوئی ۔ غرضکہ اس سفر میں آپ نے عرب میں اس کام کی داغ بیل ڈالدی تھی ۔

وصال

مولانا قدس سرہٗ ضعیف ولاغر اور کمزور بہت زیادہ تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ دائم المرض بھی تھے ۔ لیکن اس پر بھی ہمت مردانہ رکھتے تھے ۔ علم و عمل کے پیکر تھے ۔ آخر عمر تک انتھک کوششوں کے

ذریعہ جس دعوت کو لے کر اُٹھے تھے۔ اس میں کامیاب ہوئے اور سینکڑوں ہزاروں
ایسے افراد پیدا کردیئے کہ جو آپ کے بعد آپ کی دعوت کو آپ کے نشانِ راہ پر چلائیں
تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیام ملا۔ اور ملاقات نصیب ہوئی۔ ۱۲،۱۳ رجولائی
۱۹۴۴ء کی درمیانی شب میں پچھلے پہر آپ اپنے محبوب حقیقی سے ملاقی ہوئے۔
(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔)
آپ کے بعد آپ کے سچے جانشین وخلیفہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ
امیر جماعت اور سالار قافلہ منتخب ہوئے۔

حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب دیوبندی

از ۱۲۹۴ھ تا ۱۳۶۴ھ

نام ونسب آپ کا تاریخی نام مختار احمد (۱۲۹۴ھ) عرفی نام میاں شاہ اصل نام اصغر حسین اور نانا صاحب جناب عبداللہ شاہ عرف متا شاہ کا تجویز کردہ نام فرخ سیر ہے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد حسن صاحب ہے۔ خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

سید اصغر حسین بن سید محمد حسن بن سید عالم علی عرف علی میر صاحب بن سید غلام علی صاحب بن سیّد غلام رسول صاحب۔ جناب سید غلام رسول صاحب بغدادی الاصل تھے۔ ۱۲۰۵ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور دیوبند میں سکونت پذیر ہوئے اور دیوبند کے خاندان میں عقد کیا جس سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ سید غلام علی اور سید غلام نبی ان دونوں صاحبزادوں کا نکاح شاہ امیراللہ صاحب کی دختران سے ہوا۔ سید غلام علی کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ جن میں سے بڑے لڑکے کا نام سید عالم علی تھا۔ جو حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ کے دادا ہوتے ہیں۔

تعلیم وتربیت آپ کی بسم اللہ آپ کے نانا میاں جی شاہ متا صاحب نے کرائی۔ اور فارسی کی تعلیم آپ نے اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ اور دارالعلوم میں داخل ہوکر مولانا محمد یٰسین صاحب اور مولانا منظور احمد صاحب سے فارسی کی تکمیل کی۔

۱۳۱۰ھ میں فارسی سے فارغ ہوکر دارالعلوم کے شعبہ عربی میں داخل ہوئے

اور تکمیل درسِ نظامی کی۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہم ہیں۔

۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ کو آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور ایسے امکانات پیدا ہو گئے کہ آپ کی تعلیم کا سلسلہ رک جائے لیکن مذکورہ بالا تمام حضرات اساتذہ کرام نے تسلی دی اور فرمایا۔

"صاحبزادے والد صاحب کے انتقال سے پڑھنا نہ چھوڑنا تحصیل علم میں مشغول رہنا۔ بھائی ہم بھی تمہارے والد اور مربی ہیں۔ تم کسی قسم کا فکر اور اندیشہ مت کرنا اور اپنی تعلیم میں لگے رہنا" (حیات اصغر ص۳)

غرضکہ آپ ۱۳۲۰ھ میں علوم عربیہ کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔

سلسلہ تدریس

والد صاحب کے انتقال کے بعد کچھ دنوں اپنے والد صاحب کے مدرسہ میں کبھی پڑھایا ہے لیکن یہ پڑھانا عارضی تھا اس وجہ سے کہ اس کے بعد آپ اس سلسلے کو ترک کر کے علوم عربیہ کی تحصیل میں لگ گئے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ دارالعلوم میں ایک سال چند ماہ تک دفتری کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۳۲۱ھ تک برابر دینی خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کا مکتوب گرامی برائے اڈیٹری رسالہ "القاسم" گیا جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

برادرم مکرم بارک اللہ فیکم وسلم۔ بندہ محمود تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس ہے۔ گرامی نامہ پہونچا بندہ کو مادہ سوداوی نے ستا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں بندہ اپنی رائے پر رہا سہا اعتماد بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ

سے مخلص مکرم سے اپنا خیال عرض کرنے میں تکلف بھی بیجا ہے۔ خط جو آپ
کے پاس گیا تھا اس میں یہ ضعیف بھی واقعی شریک تھا۔ آپ کا خیال واقعی
درست ہے۔ اول اپنا پریشان خیال آپ پر ظاہر کرتا ہوں، پھر استفسار کا
جواب عرض کرتا ہوں آپ کو معلوم ہو کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں، عالم شہود سے
دور، برزخ کے قریب ہو رہا ہوں۔ اتنا فکر ضرور ہے کہ استاد رحمۃ اللہ علیہ
سے بفضل اللہ اگر مشافہہ کی نوبت آگئی اور پوچھا کہ کہو مدرسہ کس پر چھوڑا؟
اور کس حالت میں ہے؟ تو اس کا جواب ایسا دے سکوں کہ پسند خاطر حضرت
ہو اس کی تدبیر کوئی نہیں، مگر یہ کہ اپنے مخلصین صلحاء لائق کے نام گنوا دوں
سو آپ کی طرف بھی بچند وجوہ میرا خیال ضرور رجاتا ہے اور چاہتا ہوں۔ کہ
آپ جیسے چند اصغر گر حقیقت میں مفید اور اکبر کسی بہانہ سے احاطہ مدرسہ
میں آنکھوں سے دیکھ لوں، آپ نے جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں باللہ العظیم
ہرگز اس کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ آپ مشغلہ تدریس سے یکسو ہوں ۔ بلکہ
چاہتا ہوں کہ تدریس حالت موجودہ سے زائد نصیب ہو ہاں میں تو آپ کے
جلد بلانے کے لئے تدبیر موجودہ کو دراصل پسند کرتا ہوں یہ ہرگز مطلب
نہیں کہ سید صاحب مشغلہ علمی سے یکسو ہو کر رسالہ بازی میں عمر صرف
کریں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سر دست رسالہ کی گاڑی سنبھالنے کو کوئی معتمد علیہ
شخص ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد رسالہ کے لئے انشاء اللہ بہت پیدا ہو جائینگے
اس وقت رسالہ کی ابتدا ہے اگر ہماری طرز و وضع اور خیال کے خلاف پڑ گئی
تو اندیشہ کی بات ہے۔ اس وجہ سے بیشک یہ مستحسن نظر آیا کہ مکرم سید کو
رسالدار بالفعل بنا دیا جائے اس لئے اپنا خیال عرض کرتا ہوں حکم ہرگز
نہیں۔ آپ کو پسند اور بے تکلف گوارا ہو تو سبحان اللہ ورنہ جو آپ کو منظور

ہو ہم کو منظور ہوگا اور آپ سے بخدا کوئی خلجان یا ملال کا واہمہ بھی انشاء اللہ نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ آپ بالکل اپنے مدرسہ کے احاطہ کے اندر اللہ کا نام لے کر آجائیں اور آہستہ آہستہ کام کئے جائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے شغل و تدریس کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی تصور نہ آوے اور یہ شیخ چلی کا خیال اگر اعتماد کے قابل نہ ہو تو دو ماہ سے لے کر چھ ماہ تک کی رخصت لے کر تشریف لا کر رسالہ کو ہمارے کہنے کے مطابق جاری فرمائیں۔ اس کے بعد جو صورت آپ پسند فرمائیں اس کے کرنے میں ہم آپ کی موافقت بلکہ متابعت خوشی کے ساتھ کرنے کو موجود ہیں۔ ان چند روزوں کو جو آپ کو رسالہ کے متعلق تحریرات کی نوبت آئے گی اس کا حساب کیا جائیگا کہ اتنی مدت کی تالیفات جونپور سے زائد ہوں گی یا کم، سو یہ میرا خبط ہر جو خیال کے قابل نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میاں آپ کسی عنوان سے آئیں مگر غالباً وہ آزادی اور استقلال جو جونپور میں ہے آپ کو بوجوہ مختلف میسر نہ ہوگا۔ مگر کیا کروں اپنے خیال خام کی وجہ سے جیسا خود مقید ہوں اپنے لائق مخلصین کو بھی مقید کرنے کا شوق ہوتا ہے آپ بالکل مدرسہ اور خدام مدرسہ کے خیر اندیش اور بہی خواہ ہیں اور ہم خدام مدرسہ بالکل آپ کے خیر طلب اور دعاگو ہیں۔ خط آپ ہی ختم ہوگیا۔ کاغذ ہی نہیں رہا۔

والسلام مع الاکرام فقط (حیات اصغر ص۱۸۱ تا ۱۹۱)

اسباق میں پابندی اوقات آپ کی بلند پایہ خصوصیات میں سے ہے چنانچہ ۱۳۵۷ھ میں آپ کی جوان العمر صاحبزادی کا انتقال ہوا۔ اور آپ نے نہایت صبر و شکر کے ساتھ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا۔ اور نماز فجر

پڑھ کر تجہیز و تکفین کا کام اپنے صاحبزادوں کے سپرد کر کے مدرسہ سبق پڑھانے کے لئے تشریف لائے اور حسب دستور وقت مقررہ تک سبق پڑھایا اور سبق کے بعد طلباء سے مرحومہ کے لئے دعاء مغفرت کرائی اور جنازہ تیار ہونے پر شریک جنازہ ہوگئے اور جنازے کی نماز حضرت شیخ الاسلامؒ سے پڑھوائی۔

سلوک و تصوّف

آپ بیعت شاہ عبداللہ صاحب عرف میاں جی شاہ منے صاحب سے ہیں۔ منا شاہ صاحب آپ کے والد جناب سید محمد حسن صاحب کے حقیقی ماموں ہیں۔ اپنے زمانہ کے کاملین میں سے تھے چنانچہ مولانا محمد طیب صاحب مدیر دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت دار العلوم دیوبند کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھنے کا مسئلہ آیا تو حضرت قاسم العلوم والخیرات نے ارشاد فرمایا کہ پہلی اینٹ وہ رکھے گا۔ کہ جس کے دل میں کبھی گناہ کا ارادہ بھی نہ ہوا ہو اور فوراً ہی حضرت شاہ منا صاحب کا نام پیش کر دیا جس کو سب نے پسند کیا۔

حضرت میاں صاحبؒ نے سلوک کے منازل ان ہی بزرگ کی صحبت میں رہ کر طے کئے ہیں۔ اجازتِ بیعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی جانب سے بھی ہے جس کو حضرت شاہ منے صاحبؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ سے کہہ کر حاصل کیا تھا۔ اجازت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

بپاس خاطر مخلص مکرم معرفت آگاہ سید محمد عبداللہ شاہ صاحب بیعت مع الاجازت برائے عزیزان شاہ محمد حسن و سید قاسم علی و خورشید حسن و فرخ سیر مقبول و منظور کردہ دعائے خیر ادا کردہ شد۔

(حیات اصغر ص۱۲)

سن ۱۳۱۸ھ میں حضرت سید شاہ منا صاحب نے بھی اپنے وصال سے

ایک ماہ قبل آپ کو اجازت بیعت اور خلافت عنایت فرمائی ۔

حج اور وصال

آپ نے اپنی حیات میں تین حج ادا فرمائے ۔ پہلا حج ۱۳۴۰ھ میں، دوسرا حج ۱۳۴۵ھ میں، تیسرا حج ۱۳۵۰ھ میں ادا فرمایا لیکن اس شان سے کہ حتی الامکان اپنی آمد و روانگی کو صیغہ راز میں رکھتے تھے

۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ مطابق ۸ جنوری ۱۹۴۵ء یوم دوشنبہ بوقت اذان ظہر آپ کا وصال ہوا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ اور راندیر کے قبرستان میں مدفون ہوئے آپ کی عمر ۶۹ سال ۳ ماہ ۱۴ یوم کی ہوئی ۔

شیخ الاسلام حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

از ۱۲۹۶ھ تا ۱۳۷۷ھ

پلٹے کو یاں کوئی جنگل میں نیا ہے مجنوں
آئی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

ولادت ونسب تاریخ ولادت باسعادت ۱۹ ر شوال ۱۲۹۶ھ ہے۔ آبائی وطن موضع الہداد پور (جو اب اتصال آبادی کے سبب ٹانڈہ کا ایک محلہ شمار کیا جاتا ہے) قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے۔ آپ بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے (اس زمانہ میں آپ کے والد ماجد بانگرمئو میں مدرس تھے) تاریخی نام چراغ محمد ہے۔

آپ حسینی سید ہیں والد ماجد سید حبیب اللہ خلیفۂ خاص حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ہیں۔ آپ کے جد اعلیٰ شاہ نور الحق صاحب (اٹھارویں پشت میں) تقریباً ۸۰۰ھ میں ہندوستان آئے اور قصبہ ٹانڈہ میں آباد ہوئے۔ ان ایام میں رجبھر قوم کا دور دورہ تھا۔ آپ نے اس قوم اور اس کے راجہ کو بزور کرامت زک دی۔ اور ان کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور نام الہداد پور رکھا۔

شاہ نور الحق صاحب کے متعلق حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔

> مدرس (حضرت قدس سرہٗ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب) تو سید زادے اور پیرزادے ہیں ان کے مورث اعلیٰ شاہ نور الحق صاحبؒ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے

بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو بھئی یہ تو بڑے پیرزادے ہیں [1]

تعلیم و تربیت آپ کی ابتدائی تعلیم والد ماجد قبلہ کی زیرِ نگرانی ہوئی آپ نے اپنی والدہ ماجدہ سے پانچ پارے قرآن شریف کے پڑھے اور بقیہ قرآن شریف والد صاحب مرحوم سے پڑھا۔

جب آپ کی عمر شریف ۱۳ سال ہوئی تو آپ ۱۳۰۹ھ میں دیوبند تشریف لائے اور اپنے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحبؒ اور شفیق استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ نگرانی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پاتے رہے۔ باوجودیکہ حضرت شیخ الہندؒ دورہ حدیث کی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے۔ لیکن آپ کو ہونہار پاکر ابتدائی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں [2]۔ اور توجہاتِ خصوصیہ سے نوازا۔

آثارِ سعادت اور جذبۂ خدمت آپ میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس پر حضرت شیخ الہندؒ کی توجہات نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا لہٰذا، افنون پر مشتمل درسِ نظامی کی، ۶۷ کتابیں آپ نے ساڑھے چھ سال کی مدت میں ختم کر ڈالیں۔ اور علمِ نبوت کے نیرِ اعظم بن کر دارالعلوم کے در و دیوار کو منور کرنے لگے ہر ایک استاذ کی نظرِ شفقت آپ پر پڑنے لگی ساساتذہ غایتِ شفقت اور محبت کی وجہ سے و نیز کم عمر ہونے کے باعث آپ کو "مستوراتی منشی" کہہ کر پکارا کرتے تھے [3] اساتذہ کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی خدمت کرنے میں آپ نے کبھی عار محسوس نہیں کیا۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں سے کسی نے بھنگی کی فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرادو بھنگی نہیں ملا۔ مگر نالی صاف ہو کر دھل بھی گئی معلوم ہوا کہ اس نالی کا کیچڑ حسین احمد نے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا تھا [4]

[1] نقش حیات ص۹ ج ۱ [2] نقش حیات ص۴۵ حیات شیخ الاسلام ص۳۱ [3] نقش حیات ص۴۴

اس سے بھی حیرت انگیز ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت استاذی مولانا محمد جلیل صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ اپنا چشم دید واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں ایک دفعہ بہت زیادہ مہمان آگئے تھے۔ بیت الخلاء صرف ایک ہی تھا۔ لہٰذا دن بھر کی گندگی سے پُر ہو جاتا تھا۔ لیکن مجھے تعجب تھا کہ روزانہ صبح صادق سے پہلے ہی صاف ہو جاتا تھا۔ اور پانی سے دھلا ہوا پایا جاتا۔ چنانچہ ایک دن تمام رات اس راز کو معلوم کرنے کے لئے بیدار رہا اور دور سے جھانکتا رہا۔ چنانچہ جب رات کے دو بجے تو یہی حضرت شیخ الاسلام ٹوکرا لے کر پاخانہ میں داخل ہوئے اور پاخانہ ٹوکرے میں بھر کر جنگل کا رُخ کیا۔ فوراً ہی میں نے جاکر راستہ روک لیا تو ارشاد فرمایا۔ دیکھئے! کسی سے تذکرہ نہ کیجئے گا۔

بہرحال جب آپ ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو آپ کی چند خارج از درس (طب، ادب، ہیئت میں) کتابیں باقی رہ گئی تھیں کہ آپ کے والد ماجد نے عزم ہجرت کیا تو آپ بھی معہ والدین و برادران وغیرہ مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے اور ادبیات میں باقی کتابیں مدینہ منورہ کے معمر اور مشہور ادیب مولانا الشیخ آفندی عبد الجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں

آپ کو حدیث میں علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری حضرت مولانا عبد العلی صاحبؒ و مولانا شیخ حسب اللہ الشافعی المکیؒ و مولانا شیخ عبد الجلیل صاحب برادہ المدنیؒ مولانا عثمانی عبد السلام داغستانی مفتی الاحناف بالمدینۃ و مولانا سید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ بالمدینۃ سے بھی حاصل ہے۔

(تذکرہ

سلسلہ تدریس | جس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کو آپ کے مربی و شفیق استاذ حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ کے لئے رخصت کر رہے تھے تو راستے میں ارشاد فرمایا ۔
"پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہیئے ایک دو ہی طالب علم ہوں" چنانچہ آپ نے اپنے شیخ کی اس نصیحت کو ایسا گرہ میں باندھا کہ آخر دم تک پڑھاتے رہے۔ مدینہ منورہ کی فاقہ کشی کی زندگی، ہندوستان کی قید و بند کی زندگی میں برابر اس نصیحت پر عمل پیرا رہے اور اشتغال بالعلم رکھا اور علم کے دریا بہا دیئے اور مرکز علم (مدینہ منورہ) میں وہ خصوصیت حاصل کی کہ عرب کی حدود سے نکل کر آپ ممالک غیر میں شیخ حرم نبوی مشہور ہوگئے اور بڑے کہنہ مشق اساتذہ قدیم کے حلقہ ہائے درس ٹوٹ گئے ۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ اکابرین و مشائخ دیوبند کا یہ اکلوتا جانشین وہ سب کمالات اپنے اندر رکھتا تھا۔ جو اسلاف میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکابر کی اس نشانی کو امدادی، قاسمی، رشیدی، محمودی آئینہ سے کوئی دیکھے تو بیک وقت ان تمام ذوات مقدسہ کو چراغ محمدؐ کی صورت میں جلوہ گر پائے گا ۔
چراغ محمدؐ پر یہ تمام فانوس لگے ہوئے تھے، اور ہر فانوس کی چمک بیک وقت ظاہر ہو رہی تھی اور عالم اس سے منور ہو رہا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ سرکار مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینۃ العلوم بذات خود آپ کو عنایت کر دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

> "مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جبکہ قضیمہ سے رابغ کو قافلہ جا رہا تھا۔ رات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا۔ کہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، میں قدموں پر

گڑگیا۔ آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا کہ کیا مانگتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کے سمجھنے کی قوت ہو جائے۔ تو فرمایا۔ تجھ کو دیا۔ (نقش حیات)

یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا عاشق الٰہی صاحب فرماتے ہیں:۔

مولانا سید حسین احمد صاحب کا درس بحمد للہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت وجاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علماء کو تو کیا یمنی اور شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں الخ

(تذکرۃ الرشید)

الحاصل عرصہ دراز تک حرم نبوی میں پڑھاتے رہے اور بقول حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی آپ نے ۱۸ سال حرم نبوی میں درس دیا ہے۔ ۱۳۲۶ھ میں آپ ہندوستان تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس میں شرکت فرمائی۔ تو ارباب اہتمام و شوریٰ نے آپ کو معقول تنخواہ پر دارالعلوم میں مدرس رکھ لیا۔ ۱۳۲۹ھ میں آپ پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور اسارت مالٹا کے زمانے تک برابر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ مالٹا سے واپسی کے بعد آپ نے کچھ دنوں امروہہ کے مدرسہ جامع مسجد میں بھی تعلیم دی ہے پھر وہاں سے حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو اپنی خدمت میں بلا لیا۔ کچھ دنوں کے بعد کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا تو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے بہت سے خدام سے کہا۔ مگر سب نے ٹکا سا جواب دیدیا تب حضرت قدس سرہٗ کو مخاطب ہو کر فرمایا: "اپنے ہی کی طرف جھکنا پڑتا ہے، تم چلے جاؤ۔" چنانچہ آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۹ھ میں جب حضرت

شیخ الہندؒ کا وصال ہوا تو چند دنوں کے لئے دیوبند تشریف لے گئے اور پھر کلکتہ جاکر پڑھانے لگے۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور مقدمہ تک آپ کلکتہ میں رہے۔ بعد میں آپ اس کی مدرسی سے بوجہ گرفتاری جیل علیحدہ ہوگئے۔

۱۳۳۸ھ سے ۱۳۴۶ھ تک تقریباً ۶ سال بنگال اور پھر سلہٹ (آسام) کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے پڑھاتے رہے اس کے بعد ۱۳۴۶ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر نشین و شیخ الحدیث کی حیثیت سے آخر دم ۱۳۷۷ھ تک پڑھاتے رہے۔ اس ۳۱ سالہ زمانہ تدریس میں آپ کے تلامذہ کی تعداد ۳۸۵۶ ہے۔ جبکہ ابتدائے قیام دارالعلوم سے لیکر ۱۳۴۶ھ تک دیگر اساتذہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبار کی مجموعی تعداد ۲۷۷۴ ہے۔ اگر آپ کے تمام تلامذہ از مدینہ منورہ تا ہندوستان کو شمار کیا جائے تو تعداد بیس ہزار سے زیادہ تجاوز کر جائے گی۔ اور یہ سب تلامذہ بلا واسطہ ہیں۔ اور اگر بالواسطہ شمار کیا جائے۔ تو دنیا کے علمار کی بیشتر تعداد آپ کے تلامذہ کی ہوگی۔

درسِ حدیث

مدینہ منورہ اور ہندوستان میں آپ کا حلقۂ درسِ حدیث مشہور و بے مثل رہا ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ درسِ حدیث میں حضرت شیخ الہندؒ کے بعد آپ کا درس ان تمام خصوصیات کا حامل تھا۔ جو جو حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت امام ربّانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے حلقۂ درس کو حاصل تھیں۔

حلقۂ درس میں ہمہ وقت سکون و اطمینان اور وقار قائم رہتا تھا۔ لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہوجاتا کہ طلبار میں اضمحلال پیدا ہونے لگا ہے۔ تو درمیان میں کوئی ایسا علمی لطیفہ بیان فرماتے کہ سب فرحت و انبساط سے کھل جاتے اور تازہ دم ہوجاتے۔ مثلاً:-

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے سوال کیا کہ مکہ معظمہ کی کھجوریں عنایت فرما دیجئے۔ تو ارشاد فرمایا کہ مکہ معظمہ میں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔؟ اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ربِّ انی اسکنت من ذریتی	اے میرے رب میں اپنی اولاد کو
بواد غیر ذی زرع عند	بنجر وادی میں تیرے محترم گھر
بیتک المحرم (الآیۃ)	کے پاس آباد کرتا ہوں۔

درس میں تمام ائمہ کا نام احترام سے لیتے تھے۔ حتیٰ کہ شراح حدیث، ائمہ مصنفین وغیرہ کے اسماء کے ساتھ رحمہم اللہ ضرور فرماتے تھے۔ اور اگر کوئی طالب علم سہواً بھول جاتا تو فوراً متنبہ فرماتے۔ یہی ادب و احترام تھا کہ عالم بالا میں اکابرین کی روحیں آپ کے لئے دعائیں کرتی تھیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

(خواب میں) دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے ائمہ مذاہب اربعہ یا کہا کہ ائمہ طرق اربعہ تیرے لئے دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ تو اثنائے درس میں جب کسی کا ذکر آتا ہے تو اُن کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے یا کہا کہ دعا کرتا ہے اور میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ کچھ لوگ مختلف مقامات پر گروہ بیٹھے ہوئے ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے ہیں۔

نقش حیات صفحہ ج

سلوک و تصوف

۱۳۱۶ھ میں آپ آستانہ عالیہ رشیدیہ گنگوہ شریف حاضر ہوئے اور حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہوگئے۔ چونکہ ارادہ مکہ معظمہ جانے کا تھا اس وجہ سے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا۔

میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ موجود ہیں اُن سے عرض کرنا،

وہ ذکر تلقین فرمادیں گے۔ الخ

مکہ معظمہ پہونچ کر بارگاہ امدادیہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

حضرت گنگوہی (قدس اللہ سرہٗ العزیز) نے ہم کو بیعت تو کر لیا تھا۔
مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقین ذکر حضرت سے حاصل کر لینا تو آپ نے پاس
انفاس کی تلقین فرمائی۔ اور فرمایا کہ صبح آکر یہاں بیٹھا کرو۔ اور
اس ذکر کو کرتے رہو۔ الخ

۱۳۰۵ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا دالانامہ برائے طلبی مدینہ منورہ پہونچا اور آپ حسب الارشاد آستانہ عالیہ پر حاضر ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد بارگاہِ رشیدی سے آپ کو اجازتِ بیعت حاصل ہوئی اور قطب العالم حضرت گنگوہیؒ نے دستار خلافت اپنے دست مبارک سے آپ کے سرِ اقدس پر باندھی۔ اس طرح آپ کمالات امدادیہ ورشیدیہ کے مجمع البحرین ہوگئے۔ چونکہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند قدس سرہٗ سے پہلے ہی سے قلبی تعلق تھا۔ مزید برآں کہ حضرت قدس سرہٗ کی اسارت مالٹا میں معیت اور دیگر خدمات جلیلہ وعدیلہ اس قدر کیں کہ حضرت قدس سرہٗ کے محبوب نظر ومنظور نظر بن گئے چنانچہ جب آپ کو حضرت شیخ الہندؒ نے کلکتہ کی مدرسی کیلئے رخصت کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نقاہت کے باعث اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے آپ
نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کا ہاتھ پکڑا، اپنے
سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، سینے سے چمٹایا اور تمام بدن پر
اس کو پھیرا۔ الخ

یعنی امدادی، قاسمی، رشیدی اور محمودی اور دوسرے تمام کمالات وانوار و برکات کو چراغ محمد کی طرف منتقل کر کے مجمع البحرین سے مجمع الابحر بنادیا۔

۵ ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ بذریعہ بشارت و رویا رصالحہ اس کی تصدیق بھی فرمادی گئی۔ نقشِ حیات میں ارشاد فرماتے ہیں۔

احمدآباد جیل میں خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اوپر سے کہہ رہا ہے کہ جو رحمتِ خداوندی حضرت شیخ الہندؒ کی طرف دنیا میں متوجہ کی گئی تھی وہ اب تیری طرف پھیر دی گئی الخ (نقشِ حیات صلا۱۱ ج ۱)

غرضکہ آپ کمالاتِ علمیہ اور روحانیہ میں اپنا نظیر اور مثیل نہیں رکھتے تھے۔

بعض واقعات

(۱) ایک مرتبہ آپ نوافل مغرب میں مصروف تھے۔ قاری اصغر علی صاحب سامع کی حیثیت سے آپ کے ساتھ شریک تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ابھی پہلی رکعت بھی نہیں ہوئی تھی کہ سامنے سے ایک بچھو آتا ہوا دکھائی دیا۔ اور بالکل مصلّے کے قریب آکر رک گیا۔ اور پھر سجدے کی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ قاری اصغر علی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے خیال کیا کہ تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا تو رکوع کے بعد نیت توڑ کر مار دوں گا لیکن کیا ہوا؟ رکوع میں جاتے ہی بچھو اپنی جگہ سے ہٹا اور دور جا بیٹھا۔ جب حضرتؒ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تو پھر سجدے کی جگہ آبیٹھا۔ بالآخر سلام پھیرنے کے بعد قاری اصغر علی صاحب نے اس کو مار دیا۔ تب حضرت نے ارشاد فرمایا۔ دیکھئے! اس نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔؟ اور آپ نے اس کو کیا بدلہ دیا۔

(۲) ایک مرتبہ نوافل میں آپ کے پاجامے میں چھپکلی گھس گئی اور آپ بدستور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے لنگی پہن کر پاجامہ اتار دیا۔ تب چھپکلی نکل کر بھاگی۔

(۳) ایک مرتبہ صبح کے وقت آپ مطالعہ گاہ میں مطالعہ میں مشغول تھے کہ کرتے کے اندر آپ نے کچھ محسوس کیا وقتی طور پر کرتے کو ہلکی سی جنبش دے کر چھوڑ دیا۔ پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے اور نو بجے بخاری شریف کے درس کے لئے تشریف لے گئے۔ اثنائے درس میں جب کبھی آپ کرتے کے اندر کچھ محسوس کرتے ہلکا سا جھٹکا دیکر پھر مصروف درس ہو جاتے۔ تاآنکہ بارہ بجے جبکہ آپ درس سے فارغ ہو کر زینہ سے نیچے آ رہے تھے تو طلباء (جو پیچھے تھے) نے آپ کے کرتے میں کوئی چیز چلتی ہوئی محسوس کی۔ چنانچہ حضرت کو روکا اور کرتا اٹھا کر دیکھا تو ایک بہت بڑا سیاہ بچھو کمر پر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ چنانچہ طلباء نے کپڑے سے بچھو کو نیچے گرایا اور مار دیا۔ اس طرح یہ بچھو تقریباً چار گھنٹہ تک آپ کی کمر پر موذی بن کر نہیں بلکہ زائر بن کر رہا اور آخری وقت تک اپنے اس عہد پر قائم رہا۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مولانا احمد علی صاحب لاہوری سچ فرماتے ہیں۔
"مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح اس زمانے کے اولیاء اللہ کے امام ہیں"
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری کی شہادت کہ "بھائی حضرت شیخ مدنی کا ذکر کیا پوچھتے ہو، پہلے تو ہم یوں ہی سمجھتے رہے۔ مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ آرائیوں میں جب ہم نے ان کو آنکھ اٹھا کر

دیکھا تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے، وہاں اپنا سر پڑا دیکھا اجی! ۔
حضرت اس وقت سہروردی منصب پر فائز ہیں۔ انہی کا دوسرا ارشاد ہے۔
جو بھی حضرت مدنیؒ کے متعلق بُرا خیال رکھتا ہو یار کھا ہو اس کو چاہیئے کہ ان سے معافی مانگ لے ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی اس کا خاتمہ ایمان پر نہ ہو۔ ......

بہرحال متعدد مشاہدات سے پتہ چلا ہے کہ آپ مقام محبوبیت پر فائز تھے۔ اگر آپ کے معمولات، حرکات، سکنات، نشست و برخاست کو دیکھا جائے تو مقام عبدیت کا غلبہ معلوم ہوتا ہے (اور یہ مقام سب سے عالی مقام ہے)

شادیاں

حضرت شیخ الاسلامؒ کی چار شادیاں ہوئیں، سب سے پہلی شادی موضع قتال پور ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی جن سے دو لڑکیاں ہوئیں، جن میں سے ایک کا انتقال شام میں ہوا، دوسری کا انتقال صغر سنی میں ہو گیا تھا۔

دوسری شادی قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد میں قاری حکیم غلام احمد صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے، اخلاق احمد اور اشفاق احمد ہوئے۔ اخلاق احمد صاحب کا انتقال بعمر آٹھ سال اور اشفاق احمد کا بعمر ڈیڑھ سال مدینہ منورہ میں ہو گیا اور اہلیہ محترمہ کا انتقال بھی مدینہ منورہ میں ہوا۔ (ان تینوں افراد کا انتقال اسارت مالٹا کے زمانہ میں ہوا ہے)

تیسری شادی جناب قاری غلام احمد صاحب کی چھوٹی صاحبزادی یعنی دوسری اہلیہ محترمہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی۔ اور ان سے دو بچے ایک مولانا اسعد صاحب سلمہٗ اور صاحبزادی ماجدہ خاتونؒ تولد ہوئے ماجدہ خاتون کا انتقال صغر سنی میں سلہٹ میں ہو گیا تھا۔

(تذکر

چوتھی شادی آپ کے چچازاد بھائی سید بشیرالدین صاحب کی منجھلی صاحبزادی (دام ظلہا) سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے عزیزم حافظ ارشد صاحب سلمہٗ و عزیزم اسجد صاحب سلمہٗ اور پانچ صاحبزادیاں عزیزہ ریحانہ سلمہا، عزیزہ صفوانہ سلمہا، عزیزہ رخسانہ مرحومہ، عزیزہ عمرانہ سلمہا، عزیزہ فرحانہ سلمہا .... اس طرح اب حضرت شیخ الاسلامؒ کے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں حیات ہیں۔

آپ کی مجاہدانہ حیات

آزادی کی چوتھی کوشش اور اس کے مختلف موڑ یعنی اور مکمل آزادی:

ہم نے حضرت شیخ الہندؒ کے تذکرے میں زیرعنوان "چوتھی کوشش" کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ زمانہ حضرت شیخ الہندؒ کے مرض الوفات کا تھا لیکن بایں ہمہ آپ نے آئندہ تحریک کے لئے ایک راستہ متعین کر دیا تھا۔ کہ جس پر چل کر وطن عزیز کو آزاد کرایا گیا۔ لہٰذا سب سے پہلے اس کا تذکرہ لازمی معلوم ہوتا ہے۔

فتویٰ ترکِ موالات یہ وہ فتویٰ ہے جو طلبار علی گڈھ یونیورسٹی نے حضرت شیخ الہندؒ سے حاصل کیا جس کی وجہ سے جامعہ ملیہ کا وجود عمل میں آیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قال اللہ تعالیٰ:۔ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصبرین (الآیہ) وتعاونوا علی

البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (الایۃ)
ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم
الظالمین۔ ط

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے اور تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی اعانت کرنی چاہئیے۔ اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو۔ (کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا) اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا ؎

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد:۔ آج جبکہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ جبکہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز منڈلاتے ہوئے طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر (خدا نہ کرے) پاش پاش ہو جائے۔ جبکہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادثات سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔ تو

اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور پھر مالٹا سے ہندوستان پہونچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو یا دشمنانِ اسلام کے جواب میں حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی بسط و کشادہ نے آخری طریق کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کو قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوۂ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہونچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ اعدائے اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابلِ انکار ہے۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے۔ کہ

(۱) وہ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے۔

(۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔

(۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

(۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔

اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ:-

(۱) اتباعِ شریعت کیا جائے اور عمل در آمد خلافِ حکمِ شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

(۲) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچکر اعتدال مدنظر رہے۔

(۳) ارشاد عثمان - اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساءوا فاجتنب اساء تھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو، اور جبکہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموافق والمعین۔

(العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳ ذیقعد ۱۳۳۸ھ)

ابتداً اگرچہ آپ کو سیاست سے دلچسپی نہ تھی بلکہ اپنے ساتھیوں (مولانا عزیر گل وغیرہ) سے فرمایا کرتے تھے "آپ لوگوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو کس جھگڑے میں پھانس رکھا ہے" جیسا کہ خود نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔

میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع کیا۔

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں۔

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا ممبر باقاعدہ بن گیا اور ہمیشہ جد و جہد آزادی میں شریک رہا۔ اور قید و بند کے مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ جھیلتا رہا بفضلہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ سیاست میں شرکت محض اتباع استاذ کی وجہ سے تھی۔

مقدمہ کراچی ترکِ موالات کے سلسلہ میں آپ نے انتھک کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیر دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۵۰۵ آپ کو اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم مولانا شوکت علی مرحوم ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری اور جگت گرو سوامی کرشن تیرتھ (شنکر اچاریہ) پیر غلام مجدد صاحب سندھی کو گرفتار کیا گیا۔

آپ کی گرفتاری ۱۸ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو عمل میں آئی جس کی قدرے تفصیل مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالہ "حیات شیخ الاسلام" میں بیان فرمائی ہے۔

۲۶ ستمبر کو اس تاریخی مقدمہ کی ابتداء ہوئی اور کراچی میں خالق دینا ہال میں سماعت ہوئی۔ اس موقع پر حکومت نے اپنی شان و شوکت اور جبروت کا مظاہرہ کیا کہ ننگی سنگینوں کے پہرے لگا دیئے۔ جدھر دیکھئے پولیس اور فوج ہتھیاروں سے لیس نظر آتی تھی۔ مگر یہ مجاہدین سرفروش ان مادی طاقتوں سے کب مرعوب ہونے والے تھے۔ بیانات ہوئے اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے تو یہاں تک فرما دیا "میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا" اس پر مولانا محمد علی صاحب مرحوم نے آپ کے قدم چوم لئے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس مقدمہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ دو دو سال قید بامشقت کردی گئی اور آپ کو سابرمتی جیل میں بھیج دیا گیا۔

رہائی کے بعد جیل سے رہا ہونے کے وقت آپ اور آپ کے ہمراہیوں کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ایک طرف انگریزوں سے جہادِ حریت اور دوسری طرف ارتداد اور شدھی کے فتنہ کا مقابلہ، باوجود اس دوطرفہ مقابلہ کے آپ نے ہمت نہ ہاری اور انگریزوں کی بھڑکائی ہوئی آگ (شدھی) کو بجھا دیا اور تحریک آزادی بھی نہایت پامردی کے ساتھ جاری رکھی

الحاصل جب ۱۹۳۲ء میں جمعیت اور کانگریس نے ستیہ گرہ کی تحریک پاس کی تو آپ اس تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ چنانچہ جب آپ دہلی تقریر کرنے کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا، اور کچھ دنوں کے لئے آپ کو مظفر نگر جیل میں رہنا پڑا۔ غرض کہ سیاسی اور ملکی تمام تحریکات میں آپ ہمیشہ آگے آگے رہے۔ کافی عرصہ تک تو آپ کو مرادآباد اور نینی جیل (الٰہ آباد) میں بھی رہنا پڑا۔ آپ نے ملکی خدمات میں کس جوانمردی سے حصہ لیا۔

سیتا رام سکل نے آپ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔

"اور کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ میری قبر جیل میں بن جائے گی۔"

(قومی آواز و مدینہ بجنور)

چنانچہ سید پور، بھاگلپور کے ہمت شکن اور صبر آزما واقعات اور مسٹر جناح کے غلط فیصلہ کے باوجود آپ نے تمام ملک کا دورہ کیا اور ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل آزادی حاصل کی۔

اس سلسلے میں بس ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں جتنی خدمات آپ کی ہیں کسی دوسرے لیڈر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اگر ان تمام خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے تو اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد

آزادی ہند کے بعد جتنی تباہی اور بربادی مسلمانوں کے جان و مال پر آئی وہ تاریخ ہند کا ایک سیاہ اور بھیانک دور ہے۔ جان و مال، عزت و آبرو، ان بیچاروں کے برباد کئے گئے۔ ہزاروں بچوں کو ظالمانہ بیدریغ ذبح کیا گیا، ہزاروں ماؤں کی گود خالی ہوگئیں اور ہزاروں سہاگنوں کا سہاگ اجاڑ دیا گیا اور ہزاروں عورتوں کو اغوا کر کے

تبدیل مذہب پر مجبور کیا گیا۔ غرضکہ یہ ایسا وقت تھا کہ سفر کرنا بلصراط پر چلنے کے مترادف تھا۔ لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے ہی خوف و ہراس کا شکار تھے۔ اس نازک دور میں حضرت شیخ الاسلامؒ اور آپ کے رفقار کار خصوصاً حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور جمعیت کے دیگر افراد نے اپنے اوپر رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر لیا تھا۔ آپ ہر گاؤں، ہر قصبہ، ہر شہر میں جاتے، لوگوں کو پاکستان جانے سے روکتے، ادھر دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ فرقہ پرستوں اور ظالموں کے نرغے سے جان پر کھیل کر مسلمانوں کو نکال کر لاتے۔

اس درندگی اور بربریت کے خوفناک دور کی وہ تقریریں جو آپ نے ہر شہر اور گاؤں میں جا کر فرمائی ہیں مسلمانوں کے لئے درسِ حیات اور آبِ حیات ثابت ہوئیں (یہ تقریریں طبع ہو چکی ہیں) بہرحال خدا خدا کر کے امن و امان ہوا اور مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جب تک مساجد اور مدرسے رہیں گے اور ان میں نمازیں پڑھی جائیں گی، اور مدرسوں سے علمِ دین کی نشر و اشاعت ہوگی، ان کا ثواب قیامت تک آپ کے اعمال نامے میں درج ہوتا رہے گا۔ —

آپ جب تک حیات رہے جمعیت علمارِ ہند کے نظام کو ترقی دیتے رہے۔ اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتے رہے۔ غرضکہ قولاً و فعلاً ہر طرح آپ نے جمعیۃ علمار کو مضبوط بنانے کی انتھک کوششیں جاری رکھیں۔

سلسلۂ بیعت

اگرچہ اجازتِ بیعت اور خلافت، دربارِ رشیدی سے بہت پہلے حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن جب تک حضرت شیخ الہندؒ حیات رہے۔ آپ نے سلسلہ بیعت شروع نہیں کیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد بھی آپ بیعت کرنے سے احتراز ہی کرتے تھے۔

اورطالبین کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے لیکن صاحبزادہ عالی جناب حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی کے اصرار "آخراب حضرت گنگوہی کا سلسلہ کس کے ذریعے سے جاری رہنا چاہیئے" سے آپ نے بیعت کرنا شروع کیا اور گنگوہ کے ایک صاحب (جو حیات ہیں) کو سلسلہ بیعت میں داخل کیا۔

اس کے بعد بھی آپ بیعت بہت کم کرتے تھے اور طالبین کو ٹالتے ہی رہتے تھے کبھی استخارہ کراتے، کبھی دوسری جگہ کے لئے فرمادیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ آپ سے سلسلہ شروع ہوا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں۔

کافی عرصہ ہوا میں نے حضرت سے عرض کیا تھا کہ آج میرا آپ سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ حضرت نے فرمایا شوق سے لڑیئے! میں نے عرض کیا کہ حضور! حضرت گنگوہی اور حضرت حاجی صاحب نے جو خدمت آپ کے سپرد کی تھی اس کا بھی کچھ خیال ہے یا آزادی ہند میں ہی حصہ لیتے رہیئے گا۔ فرمایا میں اس خدمت سے غافل نہیں ہوں۔ بلکہ سلہٹ رمضان المبارک کے مہینہ میں اسی غرض سے قیام کرتا ہوں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت جب بھی سلہٹ سے واپس تشریف لاتے تو دو چار خطوط سالکین کے مجھے دکھاتے اور فرماتے دیکھئے! ان حضرات کی کیسی حالت ہے؟ حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ اس کے بعد خطوط دکھانے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور مجھے ندامت ہوتی رہی۔ کہ میں نے بلا تحقیق کیوں چھیڑ دیا۔

سلوک کی تعلیمات اگرچہ زمانہ قدیم میں بہت مشکل تھیں لیکن آپ نے موجودہ زمانہ کے قویٰ کا لحاظ رکھتے ہوئے تعلیماتِ سلوک اور تصوف کو نہایت آسان کر دیا تھا۔

غالباً ۱۳۷۲ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی حضرت کے یہاں تشریف لائے اور عرض کیا حضور! اب آپ تو تصوف اور سلوک میں مشغول ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے اندر بڑھاپے کی وجہ سے اتنی جان نہیں کہ مجاہدات و ریاضات اور چلہ کشی کریں۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا۔ میں نے سلوک کو نہایت آسان کر دیا ہے اور وہ تعلیم مقرر کر دی ہے۔ کہ ضعیف سے ضعیف اور کمزور سے کمزور بھی اس پر عمل کر کے منزلِ مقصود پر پہونچ سکتا۔

آخری وقت یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد آپ کی طرف رجوع عام ہونے لگا تھا اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کے حلقہ خدام میں داخل ہونے لگے تھے اور جس سال آپ کا وصال ہوا ہے اس سال تو یہ عالم تھا کہ نہ کبھی دیکھا اور نہ کسی نے سُنا۔ چنانچہ آسام سے واپسی پر ہزاروں اشخاص بیعت ہوئے اور ۲ر شوال ۱۳۷۶ھ کو عاصم گنج (آسام) میں یک وقت ۷/۸ ہزار آدمی بیعت بذریعہ مکبر الصوت لی گئی۔ (الجمعیۃ سنڈے اڈیشن ۲۷ر مئی ۱۹۵۷ء) اس سفر میں کم از کم ۲۰/۳۰ ہزار اشخاص کو آپ نے بیعت کیا۔

آخری حج یوں تو آپ نے متعدد حج کئے تھے لیکن آخری حج ۱۳۷۶ھ آپ نے بحکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا اور آپ بلائے ہوئے تشریف لے گئے۔ اسی حج سے اصحابِ باطن نے آپ کے وصال کی طرف اشارے بھی کئے تھے۔ بہرحال آپ گھر کے تمام افراد بجز بڑی صاحبزادی عزیزہ ریحانہ سلمہا کے، ساتھ تشریف لے گئے۔ حج کے لئے تشریف لے جاتے وقت اول

تشریف لاتے وقت ہر اسٹیشن پر آدمیوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ مزار مقدس کی حاضری کے وقت آپ کا عجیب و غریب حال ہوتا اور باوجود ضعف پیری کے آپ گھنٹوں ستون کی طرح کھڑے رہ کر درود و صلوٰۃ پڑھتے، قیام مدینہ میں علماء مدینہ منورہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے علمی شبہات حل کرتے۔ مدینہ منورہ میں بھی بکثرت اہل مدینہ اور اہل حجاز و شام آپ سے بیعت ہوئے۔

آسام کا سفر اور وصال

۱۹۴۷ء کے بعد آپ تین مرتبہ آسام تشریف لے گئے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۳۷۴ھ میں لیکن یہ دورہ رمضان شریف کے بعد ہوا۔ اگلے سال اہل آسام نے قیام رمضان المبارک کے لئے دعوت دی۔ اور آپ نے اس دعوت کو قبول فرمالیا۔ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ میں بانس کنڈی (آسام) میں آپ نے رمضان المبارک گذارا۔ اس قیام میں آپ اور میاں اسعد صاحب سلمہٗ اور حضرت مولانا محمد جلیل صاحب اور دیگر خدام بھی ساتھ تھے۔ بندہ راقم الحروف بھی اس قیام میں حاضر تھا۔ دوسرا قیام آپ نے ۱۳۷۶ھ میں فرمایا۔ اس مرتبہ مع اہل و عیال کے تشریف لے گئے تھے۔ اس قیام میں عزیزم حافظ ارشد سلمہٗ نے قرآن شریف سنایا تھا۔ اس سفر کی واپسی پر آپ کو بنارس اور مئو وغیرہ کے سفر میں لو لگ گئی۔ اور اسی حالت میں آپ ٹانڈہ تشریف لائے۔

دراصل یہ لو کا حملہ مقدمۂ مرض الوفات تھا جس کی وجہ سے آپ نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ قلب بھی اس حملہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ابھی آپ پوری طرح صحتیاب نہ ہوئے تھے۔ کہ مدراس کا دورہ کرنا پڑا۔ اس سفر میں آپ کو ضیق النفس کے دورے پڑے جس کی وجہ سے آپ کو سفر ملتوی کر کے دیوبند تشریف لانا پڑا۔ علاج شروع ہوا۔ یونانی اور انگریزی ہر قسم کا علاج ہوا لیکن درمیان میں سوائے

سنبھالے کے مستقل آرام نہ ہوا۔ اسی حالت کے درمیان آپ سبق بھی پڑھاتے رہے نماز بھی جماعت سے ادا فرماتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اہل خانہ نے صبح کی نماز کے وقت آپ کے حجرے کی آگے سے زنجیر لگا دی تاکہ آپ باہر جماعت کے لئے تشریف نہ لے جائیں لیکن جب ناشتہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ کے جلال اور غصہ کا کچھ عالم نہ پوچھئے۔ بالآخر اس شرط پر کھانا تناول فرمایا کہ آئندہ جماعت کے لئے مجھے روک ٹوک نہ کی جائے۔

الحاصل علاج اور تیمارداری میں بہت زیادہ کوشش کی گئی لیکن سود مند ثابت نہ ہوئی۔ سحر وغیرہ کا بھی علاج کیا گیا مگر کوئی فرق نہ ہوا کیونکہ یہ امر ثابت ہو چکا تھا کہ مخالفین نے آپ پر سحر بھی کرایا ہے۔ بالآخر مشائخ اور اکابرین دیوبند کی اس نشانی نے ۱۳ رجمادی الاول ۱۲۹۷ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ بھی کیا عجیب وغریب اتفاق ہے کہ اسی تاریخ، اسی وقت، اسی دن دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا انتقال ہوا تھا۔

بے مثال اسوۂ حسنہ

مجاہدانہ سرگرمیوں کے علاوہ آپ میں اخلاق انبیاء کا جوہر بھی موجود تھا۔ یہی وہ نور ہے۔ کہ جس نے آپ کو آفتاب و مہتاب بنا دیا تھا۔ بے پناہ عزم وہمت اور ناقابل تسخیر قوت عمل آپ کا خصوصی جوہر تھا۔ اور اسی چیز سے انسان مراتب کمال کو عبور کر لیتا ہے اور دشمنوں کو شکست دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اگر اخلاق نبوی بھی حاصل ہو جائیں تو کیا کہنا۔

حضرتؒ کے اخلاقیات اور روحانیات کا مفصل ذکر تو میں اپنی کتاب۔ "انفاس قدسیہ" میں کر چکا ہوں۔ یہاں بعض ان واقعات کا ذکر ایک خاص مقصد

سے کررہا ہوں کاش کہ کچھ غور کیا جائے۔

۱- ملک عرفان احمد چاندپوری بیان فرماتے ہیں، الیکشن کا زمانہ تھا میں نے ایک جلسہ میں حضرت تھانویؒ کے ایک مرید سے یہ کہدیا - بھائی! تمہارا ہمارا کیا مقابلہ۔ تمہارا پیر گوشہ نشین اور میرا پیر (حضرت مدنی) مجاہد۔ بظاہر یہ الفاظ تنقیص کے نہ تھے۔ لیکن ان میں جذبۂ تنقیص کا کارفرما تھا۔ بہرحال اس عمل کو کارنامہ تصور کرتے ہوئے حضرتؒ سے بھی نقل کر دیا گیا۔ حضرت اس وقت مرادآباد تھے۔ حضرت یہ سنکر اس قدر ناراض ہوئے۔ کہ مجلس سے اٹھادیا۔ اور فرمایا جب تک تم حضرت تھانویؒ سے معافی نہ مانگوگے میرے پاس نہ آنا۔ بہرحال یہ اسی وقت عازم تھانہ بھون ہوئے اور حضرت تھانویؒ کی مجلس میں باریابی پائی۔ اور تمام واقعہ اور وہ الفاظ نقل کئے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا۔ بھائی! تم نے سچ کہا ہے۔ کوئی بری بات نہیں کہی۔ بہرحال میں معاف کرتا ہوں اور ایک معافی نامہ حوالہ کیا۔ انھوں نے واپس آکر یہ معافی نامہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ تب کہیں امان ملی۔ آج اس کی مثال کے لئے ہماری آنکھیں ترستی ہیں۔ یوں مشائخ و مجازین تو بہت ہیں مگر اسوۂ شیخ پیش کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

۲- حضرتؒ نینی جیل سے چھوٹ کر دیوبند پہونچے۔ اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ حضرت عثمانیؒ موجود ہیں۔ فرمایا ہمارا سامان لے جاؤ۔ پہلے ان سے ملاقات کرلیں اس کے بعد گھر پہونچیں گے۔ حاشیہ نشینوں نے بہت سمجھایا کہ حضرت! اس وقت ملنا سیاسی مصالح کے خلاف ہے۔ فرمایا۔ ہونے دو۔ میں سیاسی مصالح کی بنا پر اپنے مذہبی تعلق کو ختم نہیں کرسکتا۔

۳۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ ارشاد فرماتے ہیں:۔
حضرت مدنیؒ کی ہمیشہ عادت رہی ہے کہ کسی بھی وقت میرے یہاں آگئے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی کون؟ فرمایا حسین احمد! میں اگر درس دیتا ہوا تو فوراً حاضر ہوگیا۔ ورنہ گھر والوں سے کھانا منگایا اور کھانا شروع کردیا۔ ایک دفعہ میں درسگاہ میں تھا کہ معلوم ہوا کہ حضرت آگئے ہیں۔ ان دنوں میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی بھی آئے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے سوچا اگر آج دونوں ایک جگہ جمع ہوگئے تو جھگڑا ہو جائے گا۔ میں نے حضرت مولانا تھانویؒ کو دار جدید میں روکا۔ کہ وہ تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے تب آپ کو بلالوں گا۔ مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ اور فرمایا ہمارا اختلاف تو پلیٹ فارم کی حد تک ہے۔ اس کے بعد میں نے حضرت مدنیؒ سے آکر عرض کیا۔ تو حضرت نے فرمایا۔ میں ان سے ضرور ملاقات کروں گا۔ چنانچہ دونوں حضرات نہایت فرحت اور انبساط کے ساتھ ملے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں نظریاتی اختلاف بھی نہیں ہے۔
یہ تین واقعات وہ ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ ان کے علاوہ حضرت والا کے روحانی اور اخلاقی کمالات سے انفاس قدسیہ اور شیخ الاسلام نمبر بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ بلاشک وشبہ ایسا شیخ دیکھنے میں نہیں آیا۔ کاش کہ ان کے مجازین ان کی راہ کو اختیار کریں۔ اور اپنے شیخ کا نام روشن کریں۔ وہی تو آج زمین پر حضرتؒ کی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنے والے ہیں۔ کاش وہ اپنے انتساب کا خیال کریں۔

مولانا مدنیؒ اور مولانا عثمانیؒ

حضرت مدنیؒ کے اسوۂ حسنہ کی ایک جھلک اس عنوان کے تحت

اسی وجہ سے ظاہر کر رہا ہوں کہ گروپ بندی نے ایک دوسرے کو عناد کے چشمہ سے دیکھا ہے۔ اور ہر دو حضرات کے آپس کے تعلقات کو بھلا دیا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے ۱۲ رجب ۱۳۵۳ھ کو اپنے ایک مکتوب میں مولانا شبیر احمد صاحب کو تحریر فرمایا ہے۔

اور چونکہ خواجۂ تاشی کی نعمت بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے۔ اس لئے ہمارا آپس کا جنگ و جدال اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول نہ ہونا چاہیئے۔ ایک وقت میں لڑیں گے اور دوسرے وقت میں ملیں گے عداوت قائمہ اور عداوت قلبیہ نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سینکڑوں کمالات ایسے عطا فرمائے ہیں جن کے سرادقات تک بھی ہم نالائقوں کی رسائی نہیں جبکہ ممبران شوریٰ نے زیادہ کنج کاؤ کیا تو اس کا تذکرہ ضرور آیا۔ مگر کوئی ایسی چیز جو آپ کے اخلاق کریمانہ یا آپ کی شرافت شخصی میں اثر رساں ہو تذکرہ نہیں کی گئی۔

اپنے جوابی مکتوب میں حضرت عثمانی نے تحریر فرمایا۔

اس وقت اپنے عقیدے میں دیوبند کی صدارت تدریس کے لئے آپ کو احق ترین سمجھتا ہوں پھر آپ سے کینہ کپٹ کیسے رکھ سکتا ہوں ؎

کفراست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

جو الفاظ آپ کی شان گرامی کے خلاف لکھے گئے ہوں ان سے کریمانہ مسامحت فرمائیں۔ ؎

بھلا دو میرے منہ سے بات گر کوئی بُری نکلی
یہ بے دردی ہے کہنا آہ بسمل بے سری نکلی

اور میرٹھ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں حضرت عثمانی رح نے تحریر فرمایا ہے۔

بعض مقامات پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح کے ساتھ کیا گیا ہے تو میں اس پر اظہار بیزاری کئے بدون نہیں رہ سکتا۔ مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط ہو ان کا علم و فضل بہرحال مسلّم ہے۔ اور اپنے نصب العین کے لئے ان کی عزیمت اور ہمت اور انتھک جدوجہد ہم جیسے کاہلوں کے لئے قابل عبرت ہے۔ اگر مولانا کو اب مسلم لیگ کی تائید کی بنا پر میرے ایمان میں خلل بھی نظر آئے یا میرے اسلام میں شبہ ہو تو مجھے ان کے ایمان اور ان کی بزرگی میں کوئی شبہ نہیں۔ کیا کروں علما نے لکھا ہے۔ مومن اپنے ایمان میں تردد تو نہیں کرسکتا۔ ہاں اپنی سیہ کاریوں کے پیش نظر اپنے کو مومن کہتے ہوئے ذرا شرم سی آتی ہے۔ البتہ ڈرتے ڈرتے اتنا عرض کرنے کی مزید جسارت کروں گا۔ ؎

گو دعویٰ تقویٰ تو نہیں درگاہِ خدا میں
بُت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

(تجلیات عثمانی ص۶۷۰)

اختلاف نظریات اور اپنے اپنے نظریہ کی حمایت اور دوسرے نظریہ کی تردید ایک انسانی حق ہے۔ اس کو عداوت پر محمول نہ کرنا چاہیئے یہ نہایت ہی نیچے درجہ کی اخلاقی کمزوری ہے جو اختلاف نظریات کو عناد اور عداوت کا لباس پہنا دیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد کر بیٹھتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ حضرت مدنی رح کے بعد ....

اعتدال کی راہ ترک کردی اور گروہی تعصب میں وہ سب کچھ کیا جو ایک عامی آدمی بھی نہیں کرسکتا۔ اجلاس میرٹھ ۱۹۶۳ء کے بعد کے حالات جہاں

مسلمانانِ ہند کے لئے باعث عار ہیں وہاں ملّت اسلامیہ کے لئے ایک سانحہ بھی ہیں ان حالات کے بگاڑنے میں اسلامی اسپرٹ اور جذبہ ایثار سے کام نہیں لیا گیا۔ افسوس کہ گروہی تعصب میں اچھے اچھے مبتلا ہو گئے۔ اور قطعاً کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ انتشار ملّت سب سے بڑا جرم ہے جس کی تلافی بڑی سے بڑی خیر سے نہیں ہو سکتی۔

اس انتشار اور ہڑبونگ میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز ختم کر دیا گیا تھا۔ گروہی تعصب میں مبتلا ہو کر مریدان باصفا نے وہ مظالم ڈھائے ہیں جن سے انسانیت شرمندہ ہے۔ یہ رنگ محفل دیکھ کر ہندوستان کے باوقار اہل علم نے اپنے آپ کو گوشہ گیر کر لیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک شر کا مقابلہ شر سے نہیں ہو سکتا تھا اور نہ وہ مقابلہ کی نیچی سطح پر آ سکتے تھے۔

....

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ۔ کل قیامت میں نام نہاد مریدین شرفا ہوں گے اور حضرت مدنیؒ بھی ہوں گے۔ اور مظلومین کے استغاثے بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی دنیا و آخرت میں مظلومین کی حمایت فرمائے گا۔ اور نام نہاد شرفا مریدین کے مقدر میں اگر توبہ و ہدایت نہیں ہے تو تباہی و بربادی ضرور ہے۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ

از ۱۳۰۴ھ تا ۱۳۸۳ھ

ابتدائی تعلیم

یہ ۸۲ برس پہلے کی بات ہے۔ رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا۔ دن جمعہ ہی کا تھا۔ ۱۳۰۴ھ تھا کہ ضلع گوجرانوالا کے گکھڑ ریلوے سٹیشن سے چار میل دور قصبہ جلال میں انوارِ الٰہی کی بارش شروع ہوئی۔ ایک نومسلم کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ جب یہ نومولود چار پانچ سال کا ہوا تو اس کی والدہ نے اسے قرآن مجید پڑھایا۔ پھر قریب کے ایک قصبہ تلونڈی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ پانچویں جماعت تک اسی اسکول سے امتحان پاس کیا۔ ازاں بعد گوجرانوالہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا عبدالحق سے فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ اسی اثنا میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ تشریف لے آئے۔ جو اس ہونہار طالب علم کے والد سے قرابتداری رکھتے تھے۔ ان کے والد نے اپنا بچہ آپ کے (حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ) کے سپرد کر دیا۔ اس وقت اس لڑکے کی عمر صرف نو سال تھی۔

بچپن سے جوانی تک

حضرت سندھیؒ اسے اپنے ساتھ سندھ لے آئے پھر آپ امروٹ شریف آئے۔ جہاں قطب الاقطاب حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹیؒ نے اس ہونہار بچے کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد حضرت سندھیؒ اس بچے کو اللہ کے ایک انتہائی برگزیدہ شخص حضرت غلام محمد دین پوریؒ کے پاس لے آئے۔ آپ نے اس بچہ کو دیکھا تو از خود اسے بیعت کر لیا۔ اس طرح یہ بچہ حضرت مولانا عبیداللہ

سندھیؒ کی زیر نگرانی دو اولیاء (حضرت دین پوریؒ اور حضرت امروٹیؒ) کی زیر سرپرستی پروان چڑھنے لگا۔ اتنے میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ حضرت دین پوریؒ نے آپ کی والدہ کا نکاح حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سے پڑھا دیا۔ اس طرح حضرت سندھیؒ اب نہ صرف آپ کے سرپرست بلکہ آپ کے سوتیلے باپ بھی تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس دوسری شادی میں آپ کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وقت گزرتا گیا یہ بچہ انتہائی مشقت سے کام کرتا رہا۔ مولانا سندھیؒ سخت طبیعت تھے۔ وہ اس لڑکے سے بہت مشقت لیتے تھے۔ حتیٰ کہ جوانی آئی۔ اور جب جوانی آئی تو حضرت سندھیؒ نے اپنی پہلی بیوی (جس کے انتقال کے بعد حضرت دین پوریؒ کے حکم پر آپ نے دوسری شادی کی تھی) کی صاحبزادی سے اس نوجوان کی شادی کر دی۔ اس سے ایک لڑکا بھی تولد ہوا لیکن ساتویں روز انتقال کر گیا۔ اور دو روز بعد بیوی بھی اپنے بیٹے کی تلاش میں ان دیکھی دنیا میں چلی گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسی نوجوان کی دوسری شادی دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں ایک نیک نفس انسان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ نکاح حضرت شیخ الہند محمود الحسنؒ نے پڑھایا یہ دوسری شادی کامیاب رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کا گھر پوری طرح آباد کیا۔ یہ نوجوان جو بیس بائیس سال سے گردش روزگار کی چکی میں پستا رہا احمد علی ہی تھا۔ جسے دنیا حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ع " نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا "

ریشمی خطوط کی تحریک

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ اہل اسلام فرنگیوں کے مظالم سے عاجز آ چکے تھے۔ اور وہ بہر قیمت ان سے گلو خلاصی کرانا چاہتے تھے۔ یہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۱۲ء میں انگریزوں نے

بلقان کے عیسائیوں کو شہ دے کر حکومت ترکی کے خلاف ظلم و ستم کا نیا باب کھولا تو برصغیر کے مسلمانوں کا اضطراب بڑھ گیا۔ جب انگریزوں نے ان بے قابو جذبات کو دیکھا تو کانپور میں مسجد شہید کرادی۔ تاکہ مسلمانوں کی توجہ ترکی سے ہٹ کر ہندوستان ہی کی سیاست میں الجھی رہے۔ مسلمانوں نے اس مسجد کے لئے اپنے خون سے سڑکوں کو رنگین کر دیا۔ اور ساتھ ساتھ حکومت ترکی کی مدد کے لئے بھی تحریک جاری رکھی۔ دراصل مسلم علماء کرام شاطر انگریزوں کی چالوں سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے پہلے ہی دیوبند میں جمعیۃ الانصار اور دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کر رکھی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نگران تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی دہلی میں تحریک کے قائد تھے۔ جب جنگ بلقان شروع ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت سندھیؒ کو کابل بھجوا دیا۔ جب آپ کابل جانے لگے تو آپ نے نظارۃ المعارف کی کمان اپنے داماد حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے سپرد کر دی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مساعی سے غازی انور پاشا اور حجاز کے گورنر غالب پاشا کی حمایت حاصل ہوگئی ان اکابر نے افغانستان اور آزاد قبائل سے انگریزوں کے استبداد کے خلاف جہاد کی اپیلیں جاری کیں۔ پیغامات کی ترسیل ریشمی رومالوں کے ذریعہ ہوئی ایک تحریر اگست ۱۹۱۶ء میں پکڑی گئی جس پر برطانیہ نے اسے ریشمی خطوط کی سازش قرار دیا۔ اس تحریک کے بے نقاب ہوتے ہی حکومت برطانیہ نے برصغیر کی ان تمام ممتاز شخصیتوں کو گرفتار کر لیا جو اس تحریک سے وابستہ تھیں ان میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے علاوہ ان کے دونوں مرشد حضرت دین پوریؒ اور حضرت امروٹیؒ بھی تھے۔ مولانا احمد علی صاحبؒ کو ڈپٹی کمشنر جالندھر کے روبرو پیش کیا گیا۔ اس نے آپ کو راہوں میں نظر بند کر دیا بعد ازاں آپ کو لاہور منتقل کر دیا گیا۔ پھر ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا گیا لیکن حکم یہ دیا گیا۔

کہ آپ حضرت لاہور میں ہی اقامت رکھیں گے۔ یہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے۔ آپ کو مجبوراً لاہور ہی میں اقامت اختیار کرنی پڑی۔ یہ مجبوری بھی رنگ لائی۔ اور حضرت مجدد الف ثانی رح نے لاہور کو مرکز اشاعت دین اسلام بننے کی جو نوید سنائی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ آپ نے قرآن حکیم کا درس دینا شروع کیا۔ آپ کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے عجیب تاثیر دی تھی۔ ہر روز آپ کے عقیدت مند بڑھتے جاتے تھے۔

ہندوستان سے ہجرت

حضرت مولانا احمد علی رح کے پاؤں ابھی لاہور میں پوری طرح جمنے بھی نہ پائے تھے کہ کابل کے امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کرکے افغانستان آنے کی دعوت دی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی حضرت مولانا شیخ الہند رح کے حکم کی تعمیل میں پہلے ہی کابل میں مقیم تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا احمد علی رح بھی ہجرت کرکے افغانستان چلے گئے۔ تقریباً بیس ہزار مسلمانوں نے ہجرت کی۔ صوبہ سرحد کے لوگوں نے ان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی دل کھول کر مدد کی جب یہ مہاجرین افغانستان پہنچے تو وہاں کی حکومت نے بھی خوب پذیرائی کی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جذبات سرد پڑ گئے۔ مہاجرین میں بددلی پھیلنا شروع ہوئی۔ اکثر مہاجرین مالی طور پر کھوکھلے ہو چکے تھے۔ حالات نامساعد ہوتے گئے حتیٰ کہ مہاجرین بھوکوں مرنا شروع ہو گئے۔ امیر امان اللہ نے ہجرت کا معاملہ غالباً اس لئے شروع کیا تھا کہ انگریز جھک جائیں گے۔ چنانچہ انگریز جھک گئے۔ اور امیر امان اللہ خاں سے "صلح" کرلی۔ لیکن شرط یہ عائد کی کہ وہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ چنانچہ امیر امان اللہ نے مہاجرین کو اپنے گھر واپس لوٹ جانے کے لئے کہا جس سے علماء کرام نے بھی فتویٰ دیا۔ کہ اب جب کہ افغانستان ایسا اسلامی ملک بھی غیر اسلامی حکومت برطانیہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اس لئے

افغانستان اور ہندوستان میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اس طرح مہاجرین کی واپسی شروع ہوگئی لیکن اس وقت تک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بھوک اور افلاس کے ہاتھوں دم چھوڑ چکی تھی۔ کچھ مہاجرین راستے ہی میں انتقال کرگئے۔ بہت کم تعداد میں مہاجرین واپس ہندوستان پہونچ سکے۔ یہاں انگریزوں نے دوسری چال چلی۔ کہاں مہاجرین کی پشاور ہی میں خوب خاطر تواضع کی۔ پھر انہیں ان کے گھروں تک بھی سرکاری خرچ پر پہنچادیا۔ اس سے مسلمان امیرامان اللہ خاں کی حکومت سے اور بھی بدظن ہوگئے۔ بہر حال ہجرت کی تحریک ختم ہوگئی۔

تدریس قرآن حضرت مولانا احمد علی کابل سے واپس لاہور تشریف لے آئے یہاں آتے ہی آپ نے کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۲ء میں انجمن خدام الدین کی داغ بیل ڈالی۔ جب معاملہ کچھ اور آگے بڑھا تو ۱۹۲۴ء میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کردیا۔ فرصت کے وقت تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ جو تاحین حیات جاری رہا۔

۱۹۵۳ء میں جب پاکستان میں تحریک "تحفظ ختم نبوت" شروع ہوئی تو حضرت مولانا احمد علیؒ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور دوسرے علماء کے ساتھ آپ کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ اور دوسرے علماء کے ساتھ آپ کو ملتان جیل میں رکھا گیا۔ مگر جب ملک فیروز خاں نون برسراقتدار آیا۔ تو آپکو لاہور جیل میں منتقل کردیا گیا۔ اٹھارہ ماہ بعد آپ کو رہا کردیا گیا۔ رہائی کے بعد آپ نے پھر درس قرآن کا سلسلہ شروع کردیا۔

قرآن مجید سے حضرت جیؒ کو عشق تھا۔ آپ قرآن مجید کا درس بلاناغہ دیتے۔ ایک دن صبح جب آپ درس دے رہے تھے تو آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا حبیب اللہ نے آپ کے کان میں کچھ کہا اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آکر

پھر کچھ کہا۔ اور چلے گئے تیسری مرتبہ پھر ایسا ہی کیا۔ حضرت جیؒ نے درس جاری رکھا اور حسبِ معمول کے مطابق درس دے چکے تو پھر نمازیوں کو پتہ چلا کہ آپ کے صاحبزادے نے آکر یہ بتایا کہ آپ کی بچی بیمار ہے۔ دوسری مرتبہ یہ بتایا کہ بچی کی حالت نازک ہے۔ اور تیسری مرتبہ یہ بتایا کہ بچی کا انتقال ہوگیا ہے۔ مگر آپ قرآن مجید کا درس دیتے رہے۔

یہ ہے قرآن مجید سے عشق یہ تو خیر اس وقت واقعہ ہوا۔ جب آپ درس دے رہے تھے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ حسبِ معمول قرآن کا درس دینے کے لئے تشریف لائے۔ پورے اطمینان کے ساتھ قرآن کا درس دیا۔ اور جب درس ہو چکا تو پھر پتہ چلا کہ آپ کی بیٹی مر چکی ہے۔ اس کی میت گھر پڑی ہے اور آپ اس میت کو چھوڑ کر قرآن مجید کا درس دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔

قرآن مجید کے اسی عشق کا نتیجہ ہے کہ آپ نے قرآن مجید کی اُردو زبان میں جو تفسیر "قرآن عزیز" کے نام سے لکھی ہے۔ وہ مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوئی ہے آپ نے اہم دینی امور پر بھی ۴۳ پمفلٹ تحریر کئے۔ ان کے علاوہ آپ ہر جمعہ کو جو خطبہ دیتے اور ہر جمعرات کو مجلس ذکر میں جو وعظ فرماتے انھیں آٹھ آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔

صدقاتِ جاریہ

حضرت مولانا احمد علیؒ نے اپنی زندگی میں مسجدیں بھی بنوائیں، جو مسجد فیض باغ میں بنوائی۔ اس کا متولی اپنے چھوٹے بیٹے حافظ حمید اللہ کو بنادیا۔ سب سے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مدینہ منورہ چلے گئے۔ جہاں وہ گذشتہ ۱۷۔۱۸ سالوں سے قرآن وحدیث پڑھاتے ہیں۔ منجھلے بیٹے حضرت مولانا عبید اللہ انور پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہے۔ ان کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور اپنی چھوٹی بیٹی

عائشہ کی اپنے بیٹوں کی طرح اپنی حیات ہی میں شادی کر دی۔ یہ اولاد صالحہ بھی حضرت کے صدقات جاریہ میں سے ہے۔

خالقِ حقیقی سے وِصال

درسِ قرآن کے ذریعہ ۴۴ برس تک یہ عظیم انسان اللہ کا کلام لوگوں تک پہنچاتا رہا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب انسانی زندگی کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ موت برحق ہے۔ چنانچہ ۲۳ رفروری ۱۹۶۲ء کو رات کے ۹½ بجے آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ زمانے پر رات نے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ علم و عرفان کی دنیا میں تاریکی پھیل گئی۔ ہر شخص ہکا بکا رہ گیا۔ یہ اچانک وفات ایک ایسی خبر تھی جس پر کوئی یقین نہ کر رہا تھا۔ دراصل ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ کاش یہ خبر غلط ہی ہو۔ مگر ہونے والی بات ہو چکی تھی۔ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

آج اس حادثہ کو چار سال ہو گئے ہیں۔ لیکن آج بھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ماتم اس بات کا نہیں کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ انتقال کر گئے۔ ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن جانا ہے ملال ہے تو اس بات کا کہ حضرت لاہوریؒ ہی کا انتقال نہیں ہوا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بہت سی حسنات و برکات بھی منتقل ہو گئی ہیں۔ تاریکی بڑھتی ہی جا رہی ہے جس سمت نظر اٹھاؤ باستثنائے چند دینی روح سے ناآشنا جسموں کے خالی ڈھانچے نظر آتے ہیں۔ اب ہم ایسے لوگ کہاں سے ڈھونڈیں۔ جن کے جسم خدا کے خوف کے سوا کسی دوسرے خوف سے شناسا ہی نہ ہوں۔ جن کے وجود دینی غیرت کا مجسمہ، جن کی ذات اسلامی عزم و استقامت کی کھلی نشانی ہو اور جن کا نام راستی اور سچائی کا مظہر ہو۔ اس ایک شخص (حضرت لاہوریؒ) میں بیک وقت یہ سب

خوبیاں جمع تھیں۔

سلوک وتصوّف

حضرت لاہوریؒ کے مختصر حالاتِ زندگی پیش کرنے کے بعد اب ہم ان کے سلوک وتصوف اور اخلاق وعادات وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت لاہوریؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

میری عمر تقریباً نو سال کی تھی کہ جب میں نے حضرت دین پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ میری بیعت کے بعد چالیس سال تک زندہ رہے اور ۱۱۰ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ حضرت امروٹیؒ بھی میری تربیت فرماتے رہے۔ دونوں نے مجھے اللہ کا نام بتلایا اور دوسروں کو اللہ کا نام بتلانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مگر جب تک یہ حضرات زندہ رہے جو شخص میرے پاس بیعت کیلئے آتا اگر اس میں استطاعت ہوتی تو میں اس کو ان کے پاس بھیجدیتا۔

۱۹۳۶ء میں حضرت لاہوری کو حضرت امروٹیؒ نے اجازتِ بیعت ان الفاظ میں عطا فرمائی:۔

"احمد علی بیٹا تم خلقِ خدا کو بیعت کے لئے دور دراز کا سفر کرنے کی تکلیف نہ دیا کرو۔ آئندہ لاہور ہی میں بیعت کر لیا کرو۔"

بیعت کرنا دراصل ایک ذمہ داری ہے جو اہل حضرات ہی کو سنبھالنا چاہئیے نہ کہ ذریعہ رزق اور پیشہ۔ اہل حضرات کی موجودگی میں نا اہل اور وہ بھی اصاغر۔ ان کو توکسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ مسندِ رشد و ہدایت پر مسلط ہوں۔ اور جائز ناجائز کا لحاظ ہی نہ کریں۔ یہ احساس ذمہ داری اور مخلوقِ خدا کی اصلاح و تربیت کا جذبہ حضرت لاہوری کے الفاظ بیعت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کے

[1] حضرت دین پوریؒ اور حضرت امروٹیؒ کے تفصیلی حالات ہم نے تذکرۂ شیخ الہندؒ میں تحریر کئے ہیں وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

بیعت لینے کے الفاظ یہ ہیں۔

توبہ کی میں نے شرک سے کفر سے تیری نافرمانی سے۔ اے اللہ میں تیرے دروازے پر آیا ہوں تو مجھے اپنا شوق نصیب فرما اپنا نام لینا نصیب فرما۔ مجھ سے وہ کام کرا جس سے تو راضی ہو۔ میں آپ سے بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم آپ بتلائیں گے اس پر صدق دل سے عمل کروں گا۔ اور اس بات پر میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتا ہوں۔ (مرد مومن ص۲۷)

بیعت لینے کے بعد اگر کسی کو شوق سلوک ہوتا تو اس کو تعلیم سلسلہ قادریہ میں دیتے جس کی ترتیب یہ ہے۔ ذکر قلبی۔ ذکر روحی۔ ذکر سری۔ ذکر نفسی۔ ذکر خفی۔ ذکر اخفیٰ۔ پاس انفاس۔ ذکر ارّہ۔ ذکر سبع صفات۔ سلطان الاذکار، نفی و اثبات مراقبہ صفات سبع۔ مراقبہ اسم ذات اورانی۔ ان اذکار کی تکمیل کے بعد کشف قبور کشف قلوب اور اسی قسم کی دوسری چیزیں سکھلاتے۔ ابتدائی زمانہ میں تحریری اقرار نامہ بھی لیا کرتے تھے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

منکہ .... ولد .... پیشہ .... محلہ ....

کا ہوں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے جس غرض کے لئے حضرت مولانا احمد علی صاحب مدظلہ العالی کے دست حق پرست پر بیعت کی ہے اس کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں جس شعبۂ حیات میں معاش کے لئے تگ و دو کرتا ہوں وہاں اپنے قول و فعل اور معاملات سے ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ میری زندگی کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اور دوسروں کے لئے نمونہ بن سکوں۔ خطا و نسیان سے بچنے کے لئے میں اس اقرار نامہ کو ہر وقت اپنے سامنے رکھوں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔ دستخط یا نشان انگوٹھا...

تعلیم و تربیت آپ نے سلوک کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا خاکہ اس طرح ترتیب دیا تھا۔

(۱) روزانہ کم از کم ایک ہزار اسم ذات۔
(۲) نماز پنجگانہ کی پابندی۔
(۳) کسی کو دکھ نہ دینا۔

ہر سہ اصول کی تشریح کافی طول طلب ہے اس لئے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ مریدوں کو حکم تھا۔ کہ وہ ہر ہفتہ اپنی تحریری رپورٹ پیش کیا کریں، ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کو ایک صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

سب نمازیں باجماعت ادا ہوئیں۔ ماشاء اللہ آپ کی صحبت کی برکت سے۔ جب تک نماز باجماعت ادا نہ کروں لطف نہیں آتا۔ اگر بعض اوقات اس مسجد میں جس میں ہم نماز پڑھتے ہیں جماعت ہو جاتی ہے تو دوسری مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ گھر میں جہاں تک ہو سکتا ہے خورد و کلاں کو نماز کی تاکید کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بالغ بچہ نماز نہ ادا کرے تو اُسے سزا تک دینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ ویسے کوئی بچہ ایسا نہیں جو نماز نہ پڑھتا ہو۔ اہلیہ نے بھی سب نمازیں ادا کی ہیں۔ وظیفہ بھی کیا جاتا ہے۔

اس ہفتہ واری رپورٹ پر اپنی رائے دیتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے قاعدہ یہ ہے کہ جو نسخہ بیماروں کے لئے زیادہ موثر ہو اور اس سے شفا ہوتی نظر آئے اس کا التزام کیا جائے۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً خواہ کام کا کچھ حرج ہو میرے یہاں درس میں صبح و شام آئیں اور عشاء کے بعد ذکر الٰہی میں شامل ہوا کریں۔ اور جب تشریف لائیں تو میرے

ساتھ ذکر قلبی میں شامل ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہوگی۔

(مرد مومن ص۹۲)

اخلاق وعادات

حضرت لاہوریؒ کے بارے میں بعض چیزیں سطور بالا میں گذر چکی ہیں۔ اس جگہ بھی چند واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔

حضرت لاہوریؒ کی عادت تھی کہ جلسوں میں جب شرکت کرتے تو مدرسہ والوں سے کرایہ نہ لیتے تھے۔ اگر کرایہ پاس نہ ہوتا تو شرکت ہی نہ کرتے اور اگر کوئی زیادہ مجبور کرتا تو صرف بقدر کرایہ لیتے اور جو کچھ کرایہ سے بچتا وہ واپس کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایبٹ آباد کے جلسہ میں شریک ہوئے سب سے پہلے منتظمین جلسہ کو کرایہ میں سے بچی ہوئی رقم واپس کی اور فرمایا "میں یہاں اللہ کا نام سکھانے آیا ہوں"۔

ایک مرتبہ نواب محمد حیات قریشی نے آپ کو اپنے علاقہ میں تبلیغ کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا اس شرط پر منظور ہے کہ آپ طعام وقیام کا انتظام نہ کریں گے۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ قیام کے لئے تو ہمارے یہاں مسجد ہے۔ مگر گاؤں ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ فرمایا آپ اس کا فکر نہ کریں۔ بہر حال وہاں گئے اور ایک ہفتہ رہے اور اپنے ہمراہ جو کھانا لے گئے تھے وہ کھایا۔

حضرت کے ایک مخلص نے ایک مرتبہ ایک کار حضرت کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ موٹر کا ڈرائیور۔ مرمت۔ پٹرول کا صرفہ میں برداشت کرتا رہوں گا مگر حضرت نے انکار کر دیا اور کار واپس کر دی۔

حضرت لاہوریؒ کو بدعات سے سخت نفرت تھی۔ ایک مرتبہ ایک زمیندار مرید نے اپنے یہاں شادی میں مدعو کیا تو لکھ کر بھیجدیا۔

عزیزم! یہ تمہارا امتحان ہے اگر خلاف شرع رسومات کی گئیں تو پھر میرے

دردازہ پر کبھی نہ آنا اور اگر صحیح طریقہ پر بارات دولیمہ کرو گے توفلاح پاؤگے۔

۱۹۳۹ء میں حکومت وقت نے خاکسار تحریک کے بارے میں علماء سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا۔ اس کی تکمیل کے لئے حضرت لاہوری ؒ کو وزیر نے چائے پر مدعو کیا۔ اور وہ فتویٰ خدمت میں پیش کر دیا۔ کہ جس پر بہت سے علماء کے دستخط تھے۔ توحضرت لاہوری نے فرمایا۔ کیا تم چائے کی ایک پیالی پر احمد علی ؒ کا ایمان خریدنا چاہتے ہو۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوریؒ

از ۱۲۹۰ھ تا ۱۳۸۲ھ

وِلادت اور طفولیت آپ نسلاً پنجابی اور نومسلم خاندانی راجپوت تھے جٹ جیب آپ کی گوت تھی جو اس نواح میں معروف ہے۔ آپ کے دادا حافظ احمد صاحب، حافظ قرآن تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ جناب مولوی عبدالرحیم صاحب شاہانِ مغلیہ کے دور میں تھے ان کو ایک بزرگ نے بشارت دی تھی کہ تمہاری سات پشت تک علم رہے گا۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے تین فرزند ہوئے جو سب عالم تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے دادا جناب مولانا محمد اکرم صاحب بھی عالم دین تھے۔

آپ کا خاندان ابتداء میں کٹھوا محرم خاں تحصیل تلاگنگ ضلع کیمبل پور میں مقیم تھا۔ جناب حافظ احمد صاحب کی خالہ ڈھڈیاں رہتی تھیں۔ انھوں نے اپنے بھانجے کو اپنے پاس بلالیا۔ اس طرح آپ کا وطن موضع ڈھڈیاں ضلع لائل پور رہا۔ آپ کے سن ولادت کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ البتہ قیاس سے آپ کا سن ولادت دریافت کیا جاسکتا ہے آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

> میں بہت بچہ تھا کہ میں نے اپنے بڑوں کو کہتے سنا کہ اللہ خیر کرے کہ چودھویں صدی چڑھ رہی ہے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ صدی کے چڑھنے (شروع ہونے) کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ میں سمجھا کہ جس طرح سورج چڑھتا ہے اسی طرح کوئی چیز چڑھنے والی ہے۔[۱]

---

[۱] سوانح ص۴۴

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر شریف ۹۔۱۰ سال کی ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سن ولادت ۱۲۹۰ھ ہے۔ آپ کا نام والدین نے غلام جیلانی رکھا تھا۔ آپ کے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ نے آپ کا اسم گرامی عبدالقادر رکھ دیا۔ آخر آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔
بچپن میں رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس وجہ سے گھر کے لوگ کالو کہا کرتے تھے۔ والد محترم فرمایا کرتے تھے۔

"تم اس کالو کو کیا جانو جب اس کے ہنر کھلیں گے تب جانو گے"[1]

تعلیم وتربیت

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے چچا محمد حسین صاحب سے قرآن پاک مولانا کلیم اللہ صاحب سے حفظ کیا۔
اور جہاوریاں رہ کر جو ان دنوں تعلیمی مرکز تھا حضرت مولانا محمد خلیل صاحب سے تعلیم حاصل کی یہ بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اس کے بعد آپ نے گھر سے کچھ روپیہ لئے اور دہلی کے قرب وجوار کے مدارس کا سفر اختیار کیا۔
ان دنوں میں مدرسہ سہارنپور میں شرح جامی کا سبق بہت مشہور تھا۔ کابل و قندھار سے لوگ مولانا ثابت علی صاحب سے شرح جامی پڑھنے آیا کرتے تھے۔ غالباً ۱۳۱۲ھ میں آپ سہارنپور آئے اور پانی پت بھی پہونچے اور یہاں مولانا محمد یحییٰ صاحب سے شرح جامی پڑھی۔
معقولات پڑھنے کے لئے آپ رامپور بھی تشریف لائے۔ یہاں کا دستور تھا کہ طلبا مسجد میں رہتے تھے، محلہ والوں کے یہاں سے کھانا ملتا تھا۔ کچھ روٹیاں اور ایک پیسہ روز ملا کرتا تھا۔ یہاں کے قیام میں آپ کے والد بھی آئے تھے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ کسی لڑکے نے لکھ دیا تھا کہ غلام جیلانی کا انتقال ہوگیا ہے

---

[1] سوانح ص۲۷

حضرت شاہ صاحب کے والد نے وطن چلنے کو کہا تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا جب تک میں فارغ نہ ہو جاؤں گا اس وقت تک نہیں جاؤں گا۔ از راہ احتیاط مسجد کی روشنی میں نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ سڑک کی لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ کھانا نہ ہونے کی حالت میں مولی کے پتے اٹھا کر کھا لیا کرتے تھے۔ ۱۳۱۸ھ میں آپ دہلی بھی پڑھنے آئے۔ اس کے علاوہ بلند شہر اور بریلی بھی تشریف لے گئے۔ اور یہاں مدرسہ "مصباح التہذیب" میں تعلیم حاصل کی۔

ملازمت

عرصہ دراز تک مختلف مقامات پر گشت کرنے اور فراغت علم کے بعد آپ نے بریلی میں خدا یار خاں کے لڑکوں کو پڑھانے کی ملازمت کر لی۔ مولوی احمد رضا خاں کے لڑکوں کو بھی آپ نے پڑھایا ہے۔ آٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ والد صاحب کے انتقال کی خبر سنکر آپ وطن واپس آ گئے تھے۔ تجھ تک کسی ذریعہ سے یہ ملفوظ پہونچا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا جو میں بریلی سے چلا آیا اور اپنے اکابر کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ ورنہ ان حضرات کی باتیں سنکر تو بڑا اکھڑ ہوتا تھا

سلوک اور تصوّف

کچھ عرصہ آپ نے مطب کے سلسلہ میں افضلگڑھ (ضلع بجنور) میں بھی قیام فرمایا ہے۔ یہاں کے قیام میں امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "المنقذ من الضلال" مطالعہ فرمائی۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہونے لگی۔ حضرت حاجی صاحب کی مثنوی "تحفۃ العشاق" نے تو آگ پر تیل چھڑک دیا۔ جب اضطراب و بے چینی زیادہ بڑھتی تو قبرستان چلے جاتے، وہاں گھنٹوں پڑے رہتے۔

عرصہ دراز تک مرشد کامل کی تلاش رہی۔ مختلف حضرات پر نظریں

جاتی تھیں۔ بالآخر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ خلیفہ حضرت گنگوہیؒ کو عریضہ لکھ دیا۔ وہاں سے حضرت گنگوہیؒ کی طرف رجوع کرنے کو حکم ہوا۔ تو آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔ کہ رجحان طبع تو آپ ہی کی طرف ہے۔ بہرحال ۱۳۲۲ھ یا ۱۳۲۳ھ میں پہلی بار رائے پور حاضر ہوئے اور حضرت رائپوری کے دست حق پرست پر بیعت ہوگئے۔ اور ابتدائی اذکار سیکھ کر وطن واپس چلے گئے۔

کچھ عرصہ تک اپنے وطن ڈھڈیال میں ذکر کرتے رہے۔ جب محبت شیخ نے جوش مارا تو رائے پور کا عزم کیا پیسے موجود نہیں تھے۔ بھائی نے اپنی بکری بیچ کر کرایہ کا انتظام کر دیا۔ بہرحال بدقت و دشواری کی دقت کے فاقہ سے رائے پور اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک دن حضرت رائے پوری نے دریافت کیا۔ مولوی صاحب تمہارے پیچھے کتنے لوگ ہیں۔ عرض کیا۔

"والدہ۔ بیوی۔ دو بھائی"

یہ سنکر ارشاد فرمایا یہ تو بڑا کنبہ ہے ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ ہم اور آپ اکھٹے رہتے۔ عرض کیا حضرت سب کچھ ہونے کے باوجود میرا کوئی نہیں، میں تو یہ نیت لے کر آیا ہوں کہ ہمیشہ ساتھ ہی رہونگا۔ کچھ عرصہ کے بعد اہلیہ کے انتقال کی خبر ملی لیکن شیخ کی صحبت نے اس حزن و ملال کو بھلا دیا تھا۔

رائے پور کے قیام میں بڑی مشقتیں برداشت کیں۔ لنگر خانے سے جو کچھ موٹا جھوٹا کھانے کو مل جاتا کھا لیتے اور شکر خداوندی بجا لاتے تھے۔ زمین پر کمبل بچھا کر لیٹ جاتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔

مسلسل دس سال ایسے گذرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے۔ ایک دن میں صرف ایک روٹی مکئی کی ملتی تھی اور وہ بھی درمیان سے بالکل کچی ہوتی جو صاحب پکانے والے تھے انھیں اس

دنذکر

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سِکی ہے یا نہیں، سالن یا دال ترکاری
کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے
پینے کے اعتبار سے ہم لوگوں کے لئے وہ عید کا دن ہوتا تھا۔ اِس علاقہ
(یو۔ پی) کے ہمارے ساتھی تو وہی ایک روٹی آدھی آدھی کرکے دونوں
وقت کھالیتے تھے لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا ایک ہی وقت میں
کھالیتا تھا۔ دوسرے وقت میں بس اللہ کا نام۔

اجازت وخلافت

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ نے ۱۳۲۵ھ میں حج کا ارادہ کیا آپ بھی ساتھ رہے
اور اپنے شیخ کے صاحبزادہ کی وہ خدمت انجام دی کہ باید وشاید، ایک دن حضرت
شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ نے فرمایا۔

مولانا میری خدمت کی وجہ سے تمہارا بڑا حرج ہوا اگر میرے بعد یکسو
ہوکر اپنے کام میں لگ جاؤ گے تو نقد ذالقہ چکھوگے۔

حضرت شیخؒ کے صاحبزادہ کو راستہ میں اسہال کا مرض شروع ہوگیا تھا۔ یہ مرض
جان لیوا ثابت ہوا ایسے مرض میں ہر وقت طہارت اور نماز کا اہتمام کرنا بڑے
جی گردے کا کام ہے یہ سب کچھ آپ اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔

حضرت شیخ کے صاحبزادے کی بھی آخری عمر ہوچکی تھی۔ اکثر مریض رہتے تھے
آخری رمضان المبارک میں مرض نے شدت اختیار کی۔ اور مرض بڑھتا ہی رہا۔
ایک دن حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کی موجودگی میں ان حضرات
کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔

(۱) مولانا اللہ بخش صاحب (۲) منشی رحمت علی صاحب جالندھری (۳)
مولانا عبدالقادر صاحب اور چودھری محمد صدیق صاحب رائے پوری کو وصیت کی۔

"میرے بعد مولوی صاحب کا خیال رکھنا"

اور اپنے پہننے کا کرتا بھی عنایت فرمایا۔ وصال کے بعد حضرت شاہ صاحب نے پیر و مرشد کے اس ارشاد کی بنا پر حضرت سہارنپوری کی طرف رجوع کیا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نے کسی موقعہ پر فرمایا تھا کہ سیاسیات میں جو کچھ مراجعت کرنی ہو تو حضرت شیخ الہند کی طرف کی جائے مگر سلوک میں حضرت سہارنپوری کی طرف۔ میں نے حضرت کو اس لائن میں بہت اونچا پایا ہے۔

آپ نے حضرت سہارنپوری سے عرض کیا۔ کہ حضرت کا تو وصال ہو گیا۔ اب میں حضرت سے تجدید بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے اول حالات دریافت فرمائے۔ اور پھر ارشاد فرمایا۔ اللہ کا شکر ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی بات پوچھنی ہو تو میں حاضر ہوں [۱]

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کے وصال کے بعد آپ نے رائپور میں قیام فرمایا اور اپنے شیخ کی خانقاہ کو آباد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قبولیت سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ کے بندے جوق در جوق آتے تھے۔ اور حلقہ ارادت میں داخل ہوتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز دور میں بھی آپ نے اس خانقاہ کو نہ چھوڑا۔ یہ آپ ہی کی برکت تھی کہ اس زمانہ میں ضلع سہارنپور اپنی جگہ قائم رہا۔ اگر اس وقت آپ بھی تبدیل وطن کا ارادہ کر لیتے تو نتیجہ صاف تھا۔ تمام مغربی اضلاع کے قدم اکھڑ جاتے۔

سالکین کی تربیت آپ بیعت لیتے وقت یہ الفاظ کہلاتے تھے۔

کہو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ہم توبہ کرتے ہیں۔ کفر سے، شرک سے، بدعت سے، زنا سے، چوری سے، غیبت سے، جھوٹ بولنے سے، نماز چھوڑنے سے اور سب

---

[۱] سوانح ص۶۶

گناہوں سے جو ہم نے اپنی ساری عمر میں کئے ہیں ،چھوٹے ہوں یا بڑے ،اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سارے حکم مانیں گے ، تیرے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تابعداری کریں گے ۔ یا اللہ تو ہماری توبہ قبول کرلے ۔ ہمارے گناہوں کو بخشدے ہمیں توفیق دے اپنی رضامندی کی اپنے رسول پاک کی تابعداری کی۔[1]

مرید ہونے کے بعد قلب کی حالت بدلنی شروع ہوجاتی تھی ۔ اس کے علاوہ آپ نماز با جماعت کی پابندی کا حکم فرماتے ۔ خلاف شریعت کاموں سے بچنے ۔ موت کو یاد رکھنے ۔ تیسرے کلمہ ، استغفار ۔ درود شریف کے پڑھنے کا حکم فرماتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی مجلس میں بڑی نورانیت اور خیر و برکت رکھی تھی ۔ عصر کی نماز کے بعد کتاب پڑھے جانے کا معمول تھا ۔ خاص طور سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کے مواعظ حسنہ ، اور حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کے تبلیغی رسالے پڑھے جایا کرتے تھے ۔ ان مجالس میں مختلف اوقات میں جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے ان سے قلب کو فرحت اور روح کو قوت حاصل ہوتی ہے ۔

(۱) پوچھا گیا ذکر کی کوئی انتہا بھی ہے ؟ فرمایا یہاں تک ذکر کرے کہ روح ذاکر ہو جائے ۔ پوچھا گیا روح ذاکر ہونے کے کیا معنی ہیں ؟ فرمایا دھیان ہر وقت اسی کی طرف لگا رہے خواہ دنیا کے کام کر رہا ہو ۔ تجارت کرتا ہو کھیتی کرتا ہو ، مگر خیال ہر وقت اسی طرف رہے ۔ جیسا کہ کسی کو سر کا درد یا پیٹ کا درد ہو تو اگرچہ باتیں بھی کرتا رہتا ہے ۔ کام بھی کرتا رہتا ہے لیکن خیال درد کی طرف رہتا ہے ۔

(۲) پوچھا گیا استقامت کے کیا معنی ہیں ؟ فرمایا اس قدر پختگی حاصل ہوجائے کہ جب تک ذکر پورا نہ کرے سکون نہ ہو بے چینی ، بیقراری رہے ۔ اور

[1] ایضاً ص۵۵

جب ذکر پورا کرے تو سکون واطمینان حاصل ہو جائے۔ طبیعت میں فرحت اور سرور محسوس ہو۔ فرمایا جب اس درجہ میں پہونچ جائے تو اس کا تمام وجود ہی تبلیغ بن جاتا ہے۔ اور اس سے پہلے مجاہدہ ہوتا ہے۔ فرمایا یہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا ہوتا ہے اس کی طرف اس کو متوجہ کر دیتے ہیں۔ تبلیغ یا تدریس یا تصنیف، جس کام کی طرف اس کا رجحان ہوتا ہے وہی خدمت اس سے لیتے ہیں۔ بعض اوقات الہام کے ذریعہ سے حکم دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ شیخ حکم دیتا ہے۔ اور کبھی خود بخود طبیعت متوجہ ہو جاتی ہے۔

اسی قسم کے اَن گنت ارشادات ہیں جو آپ نے کبھی تو سوال کے جواب میں کبھی از خود اور کبھی روکنے ٹوکنے کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں۔ ان سے سالکین کی بہت زیادہ اصلاح ہوئی ہے۔ یہ اس عاجز کا ذاتی تجربہ ہے وہ یہ کہ مشائخ کی خصوصیات ان کے مریدین میں خاص طور سے جھلکتی ہیں۔ شیخ کی زندگی کے اثرات نمایاں طور پر مریدین پر پڑتے ہیں۔ آج ہندوستان میں ہزاروں مشائخ موجود ہیں۔ ان کے مریدین کو دیکھ کر ان کی رفعت کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ حلقہ دیوبند کے اکابر میں سے حضرت مدنیؒ۔ حضرت تھانویؒ۔ حضرت شیخ الحدیثؒ مولانا محمد زکریا صاحب زید مجدہم۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ۔ حضرت شاہ محمد لیسین صاحب نگینویؒ۔ حضرت قاضی صاحب منگلوریؒ کے مریدین ہندوستان بھر میں موجود ہیں۔ ان کے مریدین کو دیکھ کر ان کے شیوخ کے بارے میں بہت آسانی سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کون صاحب کس مقام کے تھے۔

وفات اور عادات

آپ کو فشار الدم کی شکایت ۱۳۷۷ھ سے شروع ہوگئی تھی۔ اور یہ علالت بڑھتی رہی۔ اسی حالت میں پاکستان کا دورہ فرمایا۔ بالآخر ۹ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو لاہور میں وفات

پائی۔ وہاں سے جنازہ ڈھڈیال لایا گیا۔ اور

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جناب کی نعش مبارک ڈھڈیال تابوت میں لائی گئی تھی۔ انتقال کے بعد نعش مبارک کو مرقد سے نکال کرائے پور لانے کے مسئلہ نے اخبارات میں ہندو پاکستان گیر بحث چھیڑ دی تھی۔ پس ماندگان میں کوئی اولاد نہیں۔ البتہ دیگر عزیز و اقارب ہیں۔ صحیح نشانیوں میں آپ کے خلفاء ہیں۔ جن میں سے قابل ذکر مولانا محمد منظور نعمانی۔ مولانا علی میاں صاحب۔ مولانا عبدالعزیز صاحب گم تھلوی ہیں۔

عادات اور اخلاقیات کے بارے میں اس سے زیادہ کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے اہل اللہ میں سے ہیں اور گنگوہی خانوادہ کے اعلیٰ ترین بزرگوں میں سے ہیں۔ جذب و شوق اور محبت میں اپنی مثال آپ تھے۔ آخر زمانہ میں گریہ اور استغراق بہت زیادہ طاری رہتا تھا۔ اتباع سنت کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ کچھ دور چلنے کے بعد واپس ہوئے اور پھر دوبارہ چلنا شروع کیا۔ دریافت کرنے پر فرمایا۔ کہ پہلی مرتبہ چلنے میں ابتدا بائیں قدم سے ہوگئی تھی جس کی تلافی کے لئے واپس ہوئے اور پھر چلنا شروع کیا۔

مرض وفات میں مدینہ منورہ کا ذکر سن کر بے اختیار رو دیا کرتے تھے۔ جب مولانا محمد انوری صاحب عمرہ کے لئے رخصت ہوئے تو دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ حضرات صحابہؓ سے بھی بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

او دیوانے محمدؐ دے میں دیوانہ صحابہؓ دا
او پروانے محمدؐ دے میں پروانہ صحابہؓ دا

اپنے پیر و مرشد سے بھی بے انتہا تعلق تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔

، میں اپنے حضرت کی تعریف اس لئے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے۔ ورنہ ہمارے حضرت تصوف کے امام تھے۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ برس حضرت کی خدمت میں رہا۔ اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے اپنی تعریف کا نہیں سنا۔

حضرت پیر و مرشد کے فرزند ارجمند کی مرض وفات میں شاندار خدمات محبت شیخ ہی کی وجہ سے تھیں۔ بہرحال ان کے کمالات اور خصوصیات کہاں تک شمار کرائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب

از ۱۳۳۵ھ تا ۱۳۸۴ھ

آسمان رشد و حکمت کا درخشاں آفتاب

دور حاضر کا وہ یوسف بے مثال ولاجواب

ابتدائی حالات وطن عزیز کاندھلہ ہے۔ ۱۳۳۵ھ سن ولادت ہے۔ والد محترم کا اسم گرامی شاہ محمد الیاس صاحبؒ ہے۔ کاندھلہ کے مشہور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس گھرانے کو ہندوستان میں آج وہی شرف حاصل ہے جو گزشتہ زمانے میں ولّٰہی خاندان کو حاصل تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

میری والدہ جب میں بہت چھوٹا تھا مجھے صبح کی نماز کے لئے اٹھایا کرتی تھیں اور میں اٹھ کر پھر سوجایا کرتا تھا۔ میری والدہ نے حضرت جی (والد صاحب) سے کہا کہ میں یوسف کو روزانہ اٹھاتی ہوں۔ مگر یہ پھر سوجاتا ہے۔ فرمایا یوسف لوگوں کو نماز کے لئے اس قدر اٹھائے گا کہ تھکے گا نہیں

سہارنپور میں ۱۹۶۳ء میں ایک اجتماع ہوا تھا۔ اس موقعہ پر اس عاجز سے ارشاد فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ میں سہارنپور تھا۔ میرے اوپر کھانا ضد سوار ہوئی کہ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ مجھے اپنے ساتھ کھلایا کرتے تھے۔ مجھے بہت سمجھایا بہلایا مگر میں یہی کہے گیا۔ کہ میں تو آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤں گا۔ گھر کی عورتوں نے سمجھایا بھی اور ڈرایا بھی

مگر میں اپنی بات پر قائم رہا۔ بالآخر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اُٹھے اور
اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے آٹا گوندھا۔ روٹی پکائی اور مجھے اپنے ہاتھ سے
کھلائی تب جاکر میں سویا ؎۱

تعلیم وتربیت جب آپ کی عمر سات سال کی ہوئی تو والد صاحب کے پاس نظام الدین تشریف لے آئے اور قرآن پاک حفظ کرنا شروع کردیا۔ چار سال میں یعنی گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن پاک سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے عربی پڑھنا شروع کیا۔ اور مشکوٰۃ شریف تک والد محترم سے پڑھا۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ) نے جب ہمیں مشکوٰۃ شریف
شروع کرائی تو میرے ذمہ سبق کی تیاری میں حضرات صحابہؓ کے حالات
کی تتبع تھی ؎۲

غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ کی زندگی پر حضرات صحابہؓ کی گہری چھاپ تھی۔ اس ابتدائی مناسبت کی وجہ سے آپ نے تین ضخیم جلدوں میں حیاۃ الصحابہؓ ترتیب دی تھی۔

شوال ۱۳۵۱ھ میں آپ سہارنپور تشریف لائے اور حضرت شیخ الحدیث زید مجدہم سے ابوداؤد شریف پڑھی۔ یہیں کے قیام میں حضرت شیخ الحدیث صاحب زید مجدہم کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ نکاح حضرت مولانا مدنیؒ نے پڑھایا تھا۔ شوال ۱۳۶۷ھ میں ان اہلیہ محترمہ کا انتقال حالت سجدہ میں ہوگیا۔ دوسرا نکاح حضرت شیخ دامت برکاتہم کی دوسری صاحبزادی سے ۱۳۶۹ھ میں ہوا۔ ان سے ایک فرزند ارجمند صاحبزادہ محمد ہارون صاحب تولد ہوئے۔

؎۱ سوانح حضرت جی ص۴۵ ؎۲ سوانح حضرت جی ص۴۷

خلافت اور تبلیغ

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا وصال ۱۹۴۴ء میں ہوا، اس وقت تک حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو تبلیغی کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ اپنے کو علمی مشاغل میں مشغول رکھنے کو زیادہ پسند کرتے تھے خود ارشاد فرماتے ہیں ۔

ـ ابتداء میں مجھے تبلیغی کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ ذہنی طور پر اس نقل و حرکت کے لئے مجھے شرح صدر نہیں ہوا تھا تبلیغی کام میں جس قدر حصہ لیتا تھا وہ بڑے حضرت جیؒ کی وجہ سے تھا [1]

غالباً اسی وجہ سے تبلیغ سے متعلق حضرات اور دیگر اکابر کو یہ فکر تھا کہ یہ کام کس کے سپرد کیا جائے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے بھی ہندوستان کے سبھی اکابر سے مشورہ کیا، حضرت مدنیؒ اس وقت جیل میں تھے۔ ان سے بذریعہ خط مشورہ کیا گیا حضرت شیخ الحدیث صاحب زید مجدہم نے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سے ان کے استفسار پر فرمایا۔

مولوی صاحب حضرت چچا جان کی حالت دیکھ کر جو فکر آپ کو ہو رہی ہے میرا خیال ہے وہ یہاں سب کو ہو رہی ہے۔ اور سب اسی سوچ میں ہیں لیکن یہ بات ایسی نہیں ہے کہ ہم اور آپ اس کا کوئی انتظام کرلیں اور وہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خاص بندوں کے ساتھ جو اس کے لئے مرمٹتے ہیں یہ ہے کہ وہ ان کی چیز کو ضائع نہیں فرماتا اور ان کے بعد بھی ان کے کام اور ان کے فیض کا سلسلہ جاری رہتا ہے اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں کچھ لوگ ان کی محنت اور تربیت سے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی آنکھوں کے

---

[1] سوانح ص ۹۱

سامنے ہوتے ہیں۔ اور ان سے اُمید ہوتی ہے۔ کہ اس بندے کے بعد اس کا سلسلہ انشاءاللہ ان کے ذریعہ جاری ہوگا۔ مشائخ کے یہاں اجازت اور خلافت کا سلسلہ دراصل اسی کی ایک عملی اور انتظامی شکل ہے۔ خلافت اور اجازت کا مطلب بھی دراصل یہی ہوتا ہے کہ ان کو شیخ کی نسبت کچھ حاصل ہوگئی ہے[۹]۔ اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کا جو کام شیخ سے لیا جارہا ہے وہ انشاءاللہ ان سے بھی لیا جائے گا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک بندہ کی عمر بھر کی محنت اور تربیت سے ایک آدمی بھی ایسا بنتا ہوا نظر نہیں آتا۔ کہ جس سے توقع کی جاسکے کہ اس کے ذریعہ اس بندہ کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے گا۔ لیکن اس بندہ کا وصال ہوتے ہی اچانک اس کے لوگوں میں سے کسی ایک میں غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جانے والے کی نسبت دفعتہً اس کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ اور ایسا بہت کم شاذونادر ہی ہوتا ہے اور جب یہ ہوتا ہے تو نسبت کا انتقال

---

[۹] نسبت قلب میں ایک خاص قسم کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ نسبت معصیت سے زائل ہوجاتی ہے۔ حصول نسبت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کسی کا مرید ہوا جائے بلکہ کثرت ذکر سے اور بعض دفعہ دوسرے ذرائع سے محسوس کیفیت قلب میں پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سلوک کے مروجہ اذکار کا نصاب پورا کرنے کے بعد یہ نسبت پیدا ہوجائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک دفعہ یہ نسبت حاصل ہونے کے بعد باقی ہی رہے۔ جب بھی اذکار پر مداومت کم اور سیاست وغیرہ امور دنیوی میں مشغولیت زیادہ بڑھ جائے گی تو یہ شے لطیف ختم ہوجائے گی۔ ایسے حضرات کی زندگیوں سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا امتیاز ختم ہوجاتا ہے۔

بہت غیر معمولی خارق عادات قسم کا ہوتا ہے ۔
حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے ۔ آخری رمضان المبارک میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے جو اعتکاف کیا اس میں تاکید کے ساتھ ان کو اپنے پاس رکھا ۔ اسی رمضان میں انھوں نے والد محترمؒ کی قابل فخر خدمات انجام دیں جس وقت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا وصال ہو رہا تھا تو یہ پاس تھے ۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اس طرح وفات پائی کہ الیاسؒ کی آنکھیں یوسفؒ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں ۔ چنانچہ بعد وفات اکابر کی موجودگی میں ان کی جانشینی عمل میں آئی ۔ اب یوسف، یوسف ثانی بن چکا تھا ۔
حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تحریر فرماتے ہیں ۔

> اگلے دن صبح کو جب حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد حضرت کے معمول کے مطابق تقریر شروع فرمائی ۔ تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ تو مولانا محمد یوسف صاحب کی زبان سے حضرت بول رہے ہیں ۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب زید مجدہم نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے

> چچا جان کے وصال کے بعد اس نے ایک پر والا کی جس کے متعلق اس ناکارہ اور حضرت اقدس رائے پوری کا یہ خیال ہے کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی نسبت خاصہ منتقل ہوئی ہے اور ہر ہر بات میں اس کا مشاہدہ خوب ہوتا تھا ۔

اس کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے تبلیغ کا کام شروع کیا ۔ اور اور اس انہماک کے ساتھ کیا کہ یہ کام ترقی کرتا کرتا دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ گیا ۔ آج دنیا کے چپہ چپہ پہ تبلیغی جماعتیں گشت کرتی مل جائیں گی ۔ دنیا کے

ان مقامات پرجہاں ...... اللہ کا نام بلند ہونے کے بظاہر امکانات نہیں تھے وہاں حضرت جیؒ نے اذانیں پڑھوادیں۔ بلاشک وشبہ مشائخ ہند میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ اگرچہ زمانے کے اعتبار سے متاخر اور عمر کے اعتبار سے کم تھے۔ مگر کمالات اور بزرگی کے اعتبار سے نہایت بلند تھے حضرت شیخ الحدیث صاحب زید مجدہم جیسے عظیم المرتبت شیخ۔ ان کے مرتبہ پر انگشت بدنداں ہیں۔

تبلیغی اسفار اور وفات | حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے تبلیغی اسفار بڑے حضرت جیؒ کے انتقال کے بعد شروع ہو گئے تھے۔ ادھر جنازہ رکھا ہوا تھا۔ ادھر دعوت دی جارہی تھی اور چلّے مانگے جارہے تھے۔ دفن کے بعد اسی معمول کے مطابق تمام امور جاری تھے۔ تبلیغی اسفار کی تعداد معلوم ہونا تو ناممکن ہے۔ البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلا اجتماع مرادآباد یا میوات کے کسی مقام پر ہوا تھا وہاں سے یہ کام پھر بڑھنا شروع ہوا۔ اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گیا۔

تبلیغی سفر ہی میں حضرت جیؒ کا وصال ہوا۔ آخری رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ میں آپ نے مشرقی اور مغربی دونوں پاکستان کا دورہ فرمایا۔ جب واپسی کے دن قریب ہوئے تو لاہور میں انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ لاہور سے دہلی بستی نظام الدین لایا گیا۔ اور وہیں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اپنے پیچھے ایک صاحبزادہ عزیزم محمد ہارون سلمہ کو اپنی نشانی کے طور پر چھوڑا اور متعدد کتابیں اپنی تالیفات میں چھوڑیں جو انشاءاللہ رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔ اور ان کا فائدہ جاری رہے گا۔

تالیفات | تالیفات کا ذوق حضرتؒ کو ابتدا ہی سے تھا۔ اپنی درسی

کتابوں پر حاشیہ لکھا کرتے تھے۔ تبلیغی اسفار میں بھی کتب بینی اور تحریر کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا چنانچہ طحاوی شریف کی ایک بہت بڑی شرح امانی الاحبار کے نام سے آپ نے تحریر فرمائی جو دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے تین ضخیم جلدوں میں " حیاۃ الصحابہؓ " تحریر فرمائی جو شائع ہو چکی ہے۔

اخلاق اور عادات

حضرت جیؒ کے اخلاق اور عادات کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے لیکن بطور نمونہ کے کچھ ضرور تحریر کرنا ہے۔

اتباعِ سنت سے بے انتہا رغبت تھی۔ میں متعدد بار خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا ساتھ بھی رہا۔ بہت سے اجتماعات میں بھی شرکت کی۔ لیکن حضرتؒ کی ایک حرکت بھی سنت کے خلاف نہیں دیکھی۔ بہت سی ایسی سنتیں جو عام طور پر اذہان میں بھی نہیں ہوتیں۔ حضرت جیؒ کو ان کا پابند پایا۔ اور بہت سی سنتوں کا علم محض آپ کی صحبت میں رہنے سے ہوا۔

ایک مصروف اور مشغول آدمی کے لئے یہ نہایت ہی دشوار گذار معاملہ ہوتا ہے کہ اس کی مجلس کے ہر آدمی کو یہی احساس ہو کہ صاحب مجلس اسی سے مخاطب ہیں۔ اور اسی کی طرف متوجہ ہیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کمال عنایت فرمایا تھا۔ کہ ان کی مجلس سے ایک شخص بھی کبیدہ خاطر نہیں اٹھتا تھا۔ اور یہ بڑے کمال اور بڑی روحانیت کی بات ہے۔

حضرت جیؒ نے متعدد حج کئے (جن کی تفصیل ہم اپنی کتاب " سوانح حضرت جی " میں تحریر کر چکے ہیں) ایک مرتبہ بذریعہ ہوائی جہاز عمرہ کے لئے گئے۔ جب واپس آئے تو میں نے حضرت جیؒ سے دریافت کیا کہ آپ کے اس عمل پر لوگوں کو اعتراض ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ عمرہ کے لئے اتنا روپیہ خرچ کرنا کہاں درست ہے؟ فرمایا مفتی صاحب! ہندوستان کے لوگوں نے اس سنت کو مردہ کر دیا۔ اگر میرا سب کچھ قربان ہونے کے بعد بھی یہ سنت زندہ ہو جائے تو میرے لئے یہ سستا سودا ہے۔

حضرت جیؒ کے یہاں مہمانوں کی بہت زیادہ آمد و رفت رہتی تھی۔ سینکڑوں ہزاروں آتے تھے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔ مہمانوں کے ساتھ ایسا پاکیزہ برتاؤ حضرت مدنیؒ اور شیخ الحدیث زید مجدہم حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ ہی کے یہاں میں نے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ میں حاضر ہوا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کو میری چارپائی اوپر بچھوا دی گئی۔ جب سونے کا وقت قریب ہوا تو ایک آدمی آیا۔ اور اس نے کہا۔ مجھے حضرت جی نے بھیجا ہے کہ میں رات کی ضروریات کی چیزیں آپ کو دکھلا دوں۔ صبح کو جب رخصت ہوا تو دور تک پہونچانے آئے۔ میں نے منع بھی کیا تو فرمایا۔ آپ کا کیا حرج ہے؟ میں تو اتباع سنت کی نیت سے آیا ہوں۔

[illegible]

[illegible]

معذرت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ ۔ "تذکرہ مشائخ دیوبند" اپنی جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ اپنے قدردانوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ اس مرتبہ بھی بعض حضرات کے تذکرے نہ آسکے ۔ مثلاً مولانا بدرعالم میرٹھیؒ ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ ۔ اِن دونوں حضرات کا وصال ماضی۔ قریب میں ہوا ہے ۔ ان حضرات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا سلسلہ جاری ہے ۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تذکرہ مشائخ دیوبند حصہ دوم کے شروع میں ان دونوں حضرات کے حالات آجائیں گے۔

اِس مرتبہ چند بقید حیات حضرات کے حالات اس اڈیشن میں شامل نہ ہوسکے۔ مثلاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب زید مجدہم ۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب ۔ مولانا انعام الحسن صاحب موجودہ امیر تبلیغ ۔ .... مولانا وصی اللہ صاحب الہ آبادی اور دوسرے حضرات' وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً توجی نے گوارہ نہ کیا کہ یادرفتگاں کے ساتھ ان حضرات کو شامل کیا جائے ۔

"یہ سلامت رہیں ہزار برس

دوم یہ کہ جس وقت کتابت کا کام شروع ہوا تو یہ اندازہ تھا کہ کتاب چار سو (۴۰۰) صفحات سے زائد نہ ہوگی ۔ اسی اعتبار سے کاغذ اور پلیٹوں کا انتظام کیا گیا۔ لیکن جب کتابت آخری منزل پر پہونچی تو معلوم ہوا کہ اندازہ غلط تھا۔ ایک جدید ادارہ ..... (مدنی دارالتالیف) جس کے پاس سرمایہ کے بجائے

توکل ہے۔ تھوڑا سا بوجھ بھی بار خاطر تھا اس کے باوجود جوں توں کر کے ۴۸ صفحات کا اضافہ برداشت کیا کیونکہ آخری ۴۸ صفحات کو اشاعت سے علیحدہ کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ اور دوسرے تذکروں کے لئے حصہ دوم ہی زیادہ موزوں تھا۔ چنانچہ اس حصہ میں مذکورہ بالا حضرات کے تذکروں کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں (جو بقید حیات ہیں) کے حالات ہوں گے۔

علاوہ ازیں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کے حالات کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی۔ سو الحمد للہ یہ کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ بلکہ حضرت دامت برکاتہم کے حالات پر مشتمل ایک ضخیم مسودہ مرتب ہو چکا ہے۔ جو تذکرہ مشائخ دیوبند حصہ دوم سے قبل ہی شائع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ آمین

عزیز الرحمٰن غفرلہٗ
یکم ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ

(کتبہ محمد اظہر الحق کاتب بجنوری ۱۹۶۷ء)

فہرست تذکرہ مشائخ دیوبند

تالیفات

از مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ

۱۔ حیاتِ امام اعظم ابوحنیفہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی جدید ترتیب پر بہترین سوانح حیات علماء ہند کی رائے ہے کہ یہ کتاب شبلی نعمانی اور ابوزہرہ مصری کی کتاب سے زیادہ بہتر ہے۔ قیمت مجلد ۵/۵۰

۲۔ تذکرہ شیخ الہندؒ۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مکمل سوانح حیات جو قدیم اخبارات رسائل اور مکاتیب سے مرتب ہوئی ہے سیاست ہند پر بے لاگ تبصرہ۔ قیمت ۴/۵۰

۳۔ تذکرہ مشائخ دیوبند۔ اکابر مشائخ حلقۂ دیوبند کے مفصل حالات۔ اس کتاب میں میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ سے لیکر حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ تک تیس سے زائد مشائخ طریقت کے حالات ہیں۔

۴۔ سیرتِ خیر العباد۔ دو صد سالہ تاریخ پر بہترین کتاب ہے۔ زاد المعاد از ابن قیم کا ترجمہ اور اختلافی مسائل پر مفصل بحث نے کتاب کو حنفی مسلک میں ڈھال دیا ہے قسط وار شائع ہو رہی ہے قیمت ہر ایک ساڑھے تین روپیہ

۵۔ انفاس قدسیہ۔ حضرت مدنیؒ کی مشہور زمانہ سیرت جس کے کئی اڈیشن طبع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ قیمت تین روپیہ

۶۔ تعلیم الانبیاء المعروف بہ وصایا قیمت ۲/۲۵۔ محبت والے قیمت ۱/۷۵

۸۔ سوانح حضرت جی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مکمل اور مفصل سوانح حیات بیرونی ممالک کے اجتماعات کے تفصیلی حالات ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے والی مقبول عام کتاب ہے۔ قیمت تین روپیہ